لوائے ما پنہ ہر سعید خواہد بود

ندائے فتح نمایاں بنام ما باشد

ملفوظاتِ احمدیہ

حصّہ سوم

جس میں

سیّدنا و مرشدنا حضرت مرزا غلام احمدؑ صاحب قادیانی مسیح موعود

مہدی معہودؑ علیہ السّلام، مجدّد صدی چہاردھم کے مبارک ملفوظات

نومبر ۱۹۰۱ء سے اپریل ۱۹۰۲ء تک

مرتبہ

خاکسار محمد منظور الٰہی ممبر احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور

مطبوعہ مسلم پرنٹنگ پریس۔ لاہور

دو جلد پانصد | ۱۳۵۱ ہجری | قیمت فی جلد عہ

www.aaiil.org

لوائے ما پنہ ہر سعید خواہد بود
ندائے فتح نمایاں بنام ما باشد

المہدی

یعنے

ملفوظات حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی
مسیح موعود مہدی معہود مجدد صدی چہاردہم کا

سہ ماہی رسالہ

مرتبہ

خاکسار۔ محمد منظور الٰہی ممبر احمدیہ انجمن اشاعت اسلام۔ لاہور

احمدیہ بلڈنگس لاہور

مطبوعہ مسلم پرنٹنگ پریس لاہور

www.aaiil.org

ضروری گذارش

اس سے پہلے میں نے حضرت مسیح موعود کے ملفوظات مبارکہ کا ایک حصہ قریب تین ہزار صفحہ جات کا شائع کیا تھا جو بشکل ۱۹۰۱ء کے وسط تک پہنچا تھا۔ ۱۹۰۸ء میں حضرت اقدس رح نے وفات پائی۔ اس حساب سے ابھی سات سال کے ملفوظات قابل طبع ہیں۔ اگر کتابی صورت میں ان کو شائع کیا جائے تو کئی سال لگ جائیں گے۔ انسانی عمر کا ایک لمحہ اعتبار نہیں میری دلی خواہش ہے کہ یہ ملفوظات جو مردہ دلوں میں روح زندگی پیدا کرتے ہیں۔ کتابی صورت میں عوام کے سامنے آجائیں۔ تاکہ مسلمان قوم میں کچھ حرکت پیدا ہو۔ اس لئے ارادہ ہے کہ سہ ماہی رسالہ کی صورت میں سو صفحہ جات کے قریب ملفوظات اور آٹھ صفحہ جات حضرت اقدس رح کی تالیفات سے چیدہ چیدہ مضامین جن کا نمونہ اس نمبر میں پایا جائیگا شائع کئے جائیں گے۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ مسلمانوں میں کبھی حرکت اور زندگی کی روح پیدا نہیں ہو سکتی۔ جب تک وہ حضرت مسیح موعود کے پاک ملفوظات کو جن میں قرآن و حدیث کے معارف زمانہ حال کے حالات کے مطابق بیان کئے گئے ہیں زیر مطالعہ نہ رکھیں گے یہی خطاب میرا احمدیوں سے ہے۔ حضرت اقدس کے مریدان باخلاص کی تحریریں اپنی جگہ ہیں۔ لیکن مامور من اللہ کی تحریروں اور تقریروں میں جو برکت اور زندگی ہے وہ کسی اور جگہ نہیں پائی جا سکتی۔ جو دوست اس سلسلہ کو باقاعدہ خریدنا پسند کریں وہ بکڈپو میں نام رجسٹر کرادیں۔

خاکسار۔ محمد منظور الٰہی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

المہدی

ان اوراق کے ذریعہ سے حضرت مجدد اعظم صدی چہاردہم کی مختلف تالیفات سے معارف تعلیم اسلام درج کئے جایا کرینگے۔ تاکہ مسلمان آپ کے اصل منشاء مقصد کو سمجھکر اس نیک کام کی طرف متوجہ ہوں۔ جو آپ کی بعثت کا اصل مقصد تھا۔ یعنی اتحاد و ترقی اسلام۔ آئندہ نمبروں میں بلا کسی تمہید کے مختلف عنوانوں کے ماتحت آپ کے ملفوظات شائع ہوتے رہینگے۔

اصلاحِ نفس

میں نصیحت کرتا ہوں کہ شر سے پرہیز کرو۔ اور انسان کے ساتھ حق ہمدردی بجالاؤ۔ اپنے دلوں کو بغضوں اور کینوں سے پاک کرو۔ کہ اس عادت سے تم فرشتوں کی طرح ہو جاؤ گے۔ کیا ہی گندہ اور ناپاک وہ مذہب ہے۔ جس میں انسان کی ہمدردی نہیں۔ اور کیا ہی ناپاک وہ راہ ہے۔ جو نفسانی بغض کے کانٹوں سے بھرا ہے۔ سو تم جو میرے ساتھ ہو ایسے مت ہو۔ تم سوچو کہ مذہب سے حاصل کیا ہے۔ کیا یہی کہ ہر وقت مردم آزاری تمہارا شیوہ ہو؟ نہیں بلکہ مذہب اس زندگی کے حاصل کرنے کے لئے ہے۔ جو خدا میں ہے۔ اور وہ زندگی نہ کسی کو حاصل ہوئی اور نہ آئندہ ہوگی بجز اس کے کہ خدائی صفات انسان کے اندر داخل ہو جائیں۔ خدا کیلئے سب پر رحم کرو۔ تا آسمان سے تم پر رحم ہو۔ آؤ میں تمہیں ایک ایسی راہ سکھاتا ہوں۔ جس سے تمہارا نور تمام نوروں پر غالب رہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ تم تمام سفلی کینوں اور حسدوں کو چھوڑ دو۔ اور ہمدرد نوع انسان ہو جاؤ۔ اور خدا میں کھوئے جاؤ۔ اور اس کے ساتھ اعلیٰ درجہ کی صفائی حاصل کرو۔ کہ یہی وہ طریق ہے۔ جس سے کرامتیں صادر ہوتی ہیں۔ اور دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ اور فرشتے مدد کیلئے اُترتے ہیں۔ مگر یہ ایک دن کا کام نہیں۔ ترقی کرو۔ ترقی کرو۔ اس معصوم سے سبق سیکھو۔ جو کپڑوں کو آگ بھبھکتی میں جوش دیتا ہے۔ اور دیئے جاتا ہے۔ یہاں تک کہ آخر آگ کی

تاثیریں تمام نیل اور چرک کو کپڑوں سے علیحدہ کر دیتی ہیں۔ تب صبح اُٹھتا ہے۔ اور پانی پر پہنچتا ہے اور پانی میں کپڑوں کو تر کرتا ہے۔ اور بار بار پتھروں پر مارتا ہے۔ تب وہ میل جو کپڑوں کے اندر تھی اور اُن کا جزو بن گئی تھی۔ کچھ آگ سے صدمات اُٹھا کر اور کچھ پانی میں دھوبی کے بازو سے مار کھا کر یکدفعہ جدا ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ کپڑے ایسے سفید ہو جاتے ہیں جیسے ابتدا میں تھے۔ یہی انسانی نفس کے سفید ہونے کی تدبیر ہے۔ اور تمہاری ساری نجات اسی سفیدی پر موقوف ہے۔ یہی وہ بات ہے۔ جو قرآن شریف میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا یعنی وہ نفس نجات پا گیا جو طرح طرح کے میلوں اور چرکوں سے پاک کیا گیا۔ (مسیح موعودؑ)

اسلام کا غلبہ کیسے ہوگا؟

میں حکم دیتا ہوں کہ جو میری فوج میں داخل ہیں۔ وہ ان (مفسدانہ) خیالات کے مقام سے پیچھے ہٹ جائیں۔ دلوں کو پاک کریں۔ اور اپنے انسانی رحم کو ترقی دیں۔ اور دردمندوں کے ہمدرد بنیں زمین پر صلح پھیلا دیں۔ کہ اُس سے اُن کا دین پھیلے گا۔ اور اس سے تعجب مت کریں۔ کہ ایسا کیونکر ہوگا۔ کیونکہ جیسا کہ خدا نے بغیر توسط معمولی اسباب کے جسمانی ضرورتوں کیلئے حال کی نئی ایجادوں میں زمین کے عناصر اور زمین کی تمام چیزوں سے کام لیا ہے۔ اور ریل گاڑیوں کو گھوڑوں سے بھی بہت زیادہ دوڑا کر دکھلایا ہے۔ ایسا ہی اب وہ روحانی ضرورتوں کیلئے بغیر توسط انسانی ہاتھوں کے آسمان کے فرشتوں سے کام لیگا۔ ..... تم صبر سے دیکھتے رہو۔ کیونکہ خدا اپنی توحید کیلئے تم سے زیادہ غیرت مند ہے۔ اور دعا میں لگے رہو۔ ایسا نہ ہو کہ نافرمانوں میں لکھے جاؤ۔ (مسیح موعودؑ)

منارۃ المسیحؑ کی حقیقت کیا ہے؟

مسیح کا منارہ جس کا حدیثوں میں ذکر ہے۔ دراصل اسکی بھی یہی حقیقت ہے۔ کہ مسیحؑ کی ندا اور روشنی دنیا میں ایسی جلد پھیلیگی۔ جیسے اونچے منارہ پر سے آواز اور روشنی دور تک جاتی ہے اسلئے ریل اور تار اور اگن بوٹ اور ڈاک اور تمام اسباب سہولیت تبلیغ اور سہولت سفر مسیح کے زمانہ کی ایک خاص علامت ہے۔ (مسیح موعودؑ)

سلطنت افغانستان کیلئے مُلّاؤں کا خطرہ

یقیناً امیر صاحب (مراد امیر عبدالرحمان خان مرحوم سے ہے) کی رعایا کی بڑی بدقسمتی ہوگی

اگر اس ضروری اصلاح (یعنی فتویٰ تکفیر سے مولویوں کو روکنا) کی طرف امیر صاحب توجہ نہیں کرینگے اور آخری نتیجہ اس کا اس گورنمنٹ کیلئے خود زحمتیں ہیں۔ جو مُلّاؤں کے ایسے فتوے پر خاموش بیٹھی رہے۔ کیونکہ آجکل اُن مُلّاؤں اور مولویوں کی یہ عادت ہے۔ کہ ایک ادنی اختلاف مذہبی کی وجہ سے ایک شخص یا ایک فرقہ کو کافر ٹھیرا دیتے ہیں۔ اور پھر جو کافروں کی نسبت ان کے فتوے جہاد وغیرہ کے ہیں۔ وہی فتوے ان کی نسبت بھی جاری کئے جاتے ہیں۔ پس اس صورت میں امیر صاحب بھی ان فتووں سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ ممکن ہے کہ کسی وقت یہ مُلّا لوگ کسی جُزوی بات پر امیر صاحب پر ناراض ہو کر اُن کو بھی دائرۂ اسلام سے خارج کر دیں اور پھر اُن کیلئے بھی وہی جہاد کے فتوے لکھے جائیں جو کفار کیلئے وہ لکھا کرتے ہیں۔ پس بلاشبہ وہ لوگ جنکے ہاتھ میں مومن یا کافر بنانا اور پھر اس پر جہاد کا فتویٰ لکھنا ہے۔ ایک خطرناک قوم ہے۔ جن سے امیر صاحب کو بھی بے فکر نہیں بیٹھنا چاہیئے۔ اور بلاشبہ ہر ایک گورنمنٹ کیلئے بغاوت کا سرچشمہ یہی لوگ ہیں۔ عوام بیچارے ان لوگوں کے قابو میں ہیں۔ اور ان کے دلوں کی کل ان کے ہاتھ میں ہے۔ جس طرف چاہیں پھیر دیں۔ اور ایک دم میں قیامت برپا کر دیں۔ پس یہ گناہ کی بات نہیں ہے۔ کہ عوام کو اُن کے پنجے سے چھڑا دیا جائے۔ (مسیح موعودؑ)

(یہ خطرہ امیر امان اللہ کے عہد میں رونما ہو گیا۔ یعنی پورے ۲۸ سال بعد)

دُعا اور تدبیر میں تناقض نہیں

خدا کا قانونِ قدرت جو ہماری نظر کے سامنے ہے۔ ہمیں بتلا رہا ہے۔ کہ سلسلۂ تدابیر اور معالجات کا طلب اور استدعا سے وابستہ ہے۔ یعنی جب ہم فکر کے ذریعہ سے یا کسی اور طریق جستجو کے ذریعہ سے کسی تدبیر اور علاج کو طلب کرتے ہیں۔ یا اگر ہم طلب کرنے میں احسن طریق کا ملکہ نہ رکھتے ہوں یا اگر اس میں کامل نہ ہوں۔ تو مثلاً اس غور اور فکر کیلئے کسی ڈاکٹر کو منتخب کرتے ہیں۔ اور وہ ہمارے لئے اپنی فکر اور غور کے وسیلہ سے کوئی احسن طریق ہماری شفا کا سوچتا ہے تب اس کو قانونِ قدرت کی حد کے اندر کوئی طریق سُوجھ جاتا ہے۔ جو کسی درجہ تک ہمارے لئے مفید ہوتا ہے۔ سو وہ طریق جو ذہن میں آتا ہے۔ وہ درحقیقت اُس خوض اور غور اور فکر اور توجہ کا نتیجہ ہوتا ہے جس کو ہم دوسرے لفظوں میں دعا کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ فکر اور غور کے وقت جبکہ ہم ایک مخفی امر کی تلاش میں نہایت عمیق دریا میں اُتر کر ہاتھ پیر مارتے ہیں۔ تو ہم ایسی حالت میں بزبانِ حال

اُس اعلیٰ طاقت سے فیض طلب کرتے ہیں جس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔ غرض جبکہ ہماری رُوح ایک چیز کے طلب کرنے میں بڑی سرگرمی اور سوز و گداز کے ساتھ مبدء فیض کی طرف ہاتھ پھیلاتی ہے۔ اور اپنے تئیں عاجز پاکر فکر کے ذریعہ سے کسی اور جگہ سے روشنی ڈھونڈتی ہے۔ تو درحقیقت ہماری وہ حالت بھی دعا کی ایک حالت ہوتی ہے۔ اس دعا کے ذریعہ سے دنیا کی کل حکمتیں ظاہر ہوئی ہیں۔ اور ہر ایک بیت العلم کی کنجی دعا ہی ہے۔ اور کوئی علم اور معرفت کا دقیقہ نہیں جو بغیر اس کے ظہور میں آیا ہو۔ ہمارا سوچنا ہمارا فکر کرنا اور ہمارا مطلب اور مختی کیلئے خیال کو دوڑانا یہ سب امور دعا ہی میں داخل ہیں۔ صرف فرق یہ ہے کہ عارفوں کی دعا آداب و معرفت کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ اور ان کی رُوح مبدء فیض کو شناخت کرکے بصیرت کے ساتھ اُس کی طرف ہاتھ پھیلاتی ہے۔ اور محجوبوں کی دعا صرف ایک سرگردانی ہے جو فکر اور غور اور طلب اسباب کے رنگ میں ظاہر ہوتی ہے۔ وہ لوگ جن کو خدا تعالیٰ سے ربط معرفت نہیں۔ اور نہ اس پر یقین ہے۔ وہ بھی فکر اور غور کے وسیلہ سے یہی چاہتے ہیں کہ غیب سے کوئی کامیابی کی بات اُن کے دل میں پڑ جائے۔ اور ایک عارف دعا کرنے والا بھی اپنے خدا سے یہی چاہتا ہے۔ کہ کامیابی کی راہ اُس پر کھُلے۔ لیکن محجوب جو خدا تعالیٰ سے ربط نہیں رکھتا۔ وہ مبدء فیض کو نہیں جانتا۔ اور عارف کی طرح اس کی طبیعت بھی سرگردانی کے وقت ایک اور جگہ سے مدد چاہتی ہے اور اسی مدد کے پانے کے لئے وہ فکر کرتا ہے۔ مگر عارف اس مبدء کو دیکھتا ہے۔ اور یہ تاریکی میں چلتا ہے۔ اور نہیں جانتا۔ کہ جو کچھ فکر اور غوض کے بعد بھی دل میں پڑتا ہے۔ وہ بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ متفکر کے فکر کو بطور دعا قرار دیکر بطور قبول دعا اس علم کو فکر کرنے والے کے دل میں ڈالتا ہے۔ غرض جو حکمت اور معرفت کا نکتہ فکر کے ذریعے سے دل میں پڑتا ہے۔ وہ بھی خدا سے ہی آتا ہے اور فکر کرنے والا اگرچہ نہ سمجھے۔ مگر خدا تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ مجھ سے ہی مانگ رہا ہے آخر وہ خدا سے اُس مطلب کو پاتا ہے۔ اور جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا ہے۔ یہ طریق طلب روشنائی اگر علی وجہ البصیرت اور ہادی حقیقی کی شناخت کے ساتھ ہو۔ تو یہ عارفانہ دعا ہے اور اگر صرف فکر اور غوض کے ذریعہ سے یہ روشنی لامعلوم مبدء سے طلب کی جائے۔ اور نور حقیقی کی ذات پر کامل نظر نہ ہو۔ تو وہ محجوبانہ دعا ہے :۔

اب اس تحقیق سے تو یہی ثابت ہوا۔ کہ تدبیر کے پیدا ہونے سے پہلا مرتبہ دعا کا ہے

جس کو قانون قدرت نے ہر ایک بشر کے لئے ایک امر لابدی اور ضروری ٹھہرا رکھا ہے۔ اور ہر ایک طالب مقصود کو طبعاً اس پُل پر سے گذرنا پڑتا ہے۔ پھر جائے شرم ہے کہ کوئی ایسا خیال کرے کہ دعا اور تدبیر میں کوئی تناقض ہے۔ دعا کرنے سے کیا مطلب ہوتا ہے۔ یہی تو ہوتا ہے۔ کہ وہ عالم الغیب جس کو دقیق در دقیق تدبیریں معلوم ہیں۔ کوئی احسن تدبیر دل میں ڈالے۔ یا بوجہ خالقیت اور قدرت اپنی طرف سے پیدا کرے۔ پھر دعا اور تدبیر میں تناقض کیونکر ہوا؟

دُعا اور تدبیر کا باہمی رشتہ

دیکھا جاتا ہے۔ کہ انسانی طبائع کسی مصیبت کے وقت جس طرح تدبیر اور علاج کی طرف مشغول ہوتی ہیں۔ ایسا ہی طبعی جوش سے دعا اور صدقہ اور خیرات کی طرف جھک جاتی ہیں۔ اگر دنیا کی تمام قوموں پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ انہیں کسی قوم کا کانشنس (ضمیر) اس متفق علیہا مسئلہ کے برخلاف ظاہر نہیں ہوا۔ پس یہی ایک روحانی دلیل اس بات پر ہے۔ کہ انسان کی شریعت باطنی نے بھی قدیم سے تمام قوموں کو یہی فتویٰ دیا ہے۔ کہ وہ دعا کو اسباب اور تدابیر سے الگ نہ کریں۔ بلکہ دعا کے ذریعہ سے تدابیر کو تلاش کریں۔ غرض دعا اور تدبیر انسانی طبیعت کے دو طبعی تقاضے ہیں۔ کہ جو قدیم سے اور جب سے انسان پیدا ہوا ہے دو حقیقی بھائیوں کی طرح انسانی فطرت کے خادم چلے آئے ہیں۔ اور تدبیر و دعا کیلئے بطور نتیجہ ضروریہ کے اور دعا تدبیر کیلئے بطور محرک اور جاذب کے ہے۔ اور انسان کی سعادت اسی میں ہے۔ کہ وہ تدبیر کرنے سے پہلے دعا کیساتھ معبود فیض سے مدد طلب کرے۔ تا اس چشمہ لازوال سے روشنی پاکر عمدہ تدبیریں میسر آسکیں۔ (مسیح موعودؑ)

دُعا اور قضا و قدر

آجکل مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ بھی پایا جاتا ہے۔ جو کہتے ہیں۔ کہ دعا کچھ چیز نہیں ہے۔ اور قضا و قدر بہرحال وقوع میں آتی ہے۔ لیکن افسوس کہ یہ لوگ نہیں جانتے۔ کہ باوجود سچائی مسئلہ قضا و قدر کے پھر بھی خدا تعالیٰ کے قانون قدرت میں بعض آفات کے دور کرنے کیلئے بعض چیزوں کو سبب ٹھہرا رکھا ہے۔ جیسا کہ پانی پیاس بجھانے کیلئے اور روٹی بھوک کے دور کرنے کیلئے قدرتی اسباب ہیں۔ پھر کیوں اسباب سے

تعجب کیا جائے۔ کہ دعا بھی حاجت براری کیلئے خدا تعالیٰ کے قانون قدرت میں ایک سبب ہے جس میں قدرت حق نے فیوض الٰہی کے جذب کرنے کیلئے ایک قوت رکھی ہے۔ ہزاروں عارفوں راستبازوں کا تجربہ گواہی دے رہا ہے۔ کہ درحقیقت دعا میں ایک قوت جذب ہے۔ اور ہم بھی اپنی کتابوں میں اسبارے میں اپنے ذاتی تجارب لکھ چکے ہیں۔ اور تجربہ سے بڑھ کر اور کوئی ثبوت نہیں۔ اگرچہ یہ سچ ہے۔ کہ قضا و قدر میں پہلے سے سب کچھ قرار پا چکا ہے۔ مگر جس طرح یہ قرار پا چکا ہے۔ کہ فلاں شخص بیمار ہو گیا۔ اور پھر یہ دوا استعمال کریگا۔ تو وہ شفا پا جائے گا۔ اسی طرح یہ بھی قرار پا چکا ہے۔ کہ فلاں مصیبت زدہ اگر دعا کریگا تو قبولیت دعا سے اسباب نجات اس کے لئے پیدا کئے جائینگے۔ اور تجربہ گواہی دے رہا ہے کہ جس جگہ خدا تعالیٰ کے فضل سے یہ اتفاق ہو جائے کہ بمعہ شرائط دعا ظہور میں آوے وہ کام ضرور ہو جاتا ہے۔ اِسیکی طرف قرآن شریف کی یہ آیت اشارہ فرما رہی ہے — ادعونی استجب لکم یعنی تم میرے حضور میں دعا کرتے رہو۔ آخر میں قبول کرلوں گا تعجب کہ جس حالت میں باوجود قضا و قدر کے مسئلہ پر یقین رکھنے کے تمام لوگ بیماریوں میں ڈاکٹروں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ تو پھر دعا کا بھی کیوں دوا پر قیاس نہیں کرتے۔

دُعا اور علاج

ہم یقیناً جانتے ہیں۔ کہ کسی مرض کے متعلق ڈاکٹروں اور طبیبوں کے ہاتھ میں کوئی ایسی دوا نہیں۔ جس پر دعویٰ کر سکیں۔ کہ وہ قضا و قدر کے ساتھ پوری لڑائی کر کے تمام قسم کی طبائع کو ضرور کسی مرض سے حکماً نجات دے دیگی۔ بلکہ ہمارا یقین ہے۔ کہ اب تک طبیبوں کو ایسی دوا میسر ہی نہیں آئی۔ اور نہ آسکتی ہے۔ کہ جو حکماً ہر ایک طبیعت اور عمر اور ہر ایک ملک کے آدمی کو مفید پڑے اور ہرگز خطا نہ جائے۔ لہٰذا باوجود تدبیر کے بہرحال دعا کا خانہ خالی ہے۔ . . . . . پھر جبکہ قانون قدرت ہی تبلا رہا ہے۔ کہ علم طب ظنی ہے۔ اور تمام تدابیر اور معالجات بھی ظنی تو اس صورت میں کس قدر بدنصیبی ہے۔ کہ ایسے ظنیات پر بھروسہ کر کے مبدء فیض اور رحمت سے بذریعہ دعا طلب فضل نہ کیا جائے۔ دُعا سے ہم کیا چاہتے ہیں۔ یہی تو چاہتے ہیں۔ کہ وہ عالم الغیب جس کو اصل حقیقت مرض کی بھی معلوم ہے اور دوا بھی معلوم ہے۔ وہ ہماری

دستگیری فرماوے اور چاہے تو وہ دوائیں ہمارے لئے میسّر کرے۔ جو نافع ہوں۔ اور یا اپنے فضل و کرم سے وہ دن ہی ہم کو نہ دکھلاوے۔ کہ ہمیں دواؤں اور طبیبوں کی حاجت پڑے۔ کیا اس میں شک ہے۔ کہ ایک اعلیٰ ذات تمام طاقتوں والی موجود ہے۔ جس کے ارادہ اور حکم سے ہم جیتے اور مرتے ہیں اور جس طرف اس کا ارادہ جھکتا ہے تمام نظام زمین اور آسمان کا اسی طرف جھک جاتا ہے۔ اگر وہ چاہتا ہے۔ کہ کسی ملک کی حالت صحت کسی وقت عمدہ ہو۔ تو ایسے اسباب پیدا کر دیتا ہے۔ جن سے پانی اس ملک کا ہر ایک عفونت سے محفوظ رہے۔ اور ہوا میں کوئی تغیر غیر طبعی پیدا نہ ہو۔ اور غذائیں صالح میسّر آویں۔ اور دوسرے تمام مخفی اسباب کیا ارضی اور کیا سماوی جو مضر صحت ہیں۔ ظہور اور بروز نہ کریں۔

دعا کا اصل مقصد اطمینان قلب ہے

(بعض لوگ) اپنی نظر خطا کار کی وجہ سے یہ اعتراض کر بیٹھتے ہیں۔ کہ بہتیرے ایسے آدمی نظر آتے ہیں۔ کہ باوجود اس کے کہ وہ اپنے حال اور قال سے دعا میں فنا ہوتے ہیں۔ پھر بھی اپنے مقاصد میں نامراد رہتے اور نامراد مرتے ہیں۔ اور بمقابل ان کے ایک اور شخص ہوتا ہے۔ کہ نہ دعا کا قائل اور نہ خدا کا قائل وہ ان پر فتح پاتا ہے۔ اور بڑی بڑی کامیابیاں اسکو حاصل ہوتی ہیں۔ سو جیسا کہ ابھی میں نے اشارہ کیا ہے۔ اصل مطلب دعا سے اطمینان اور تسلی اور حقیقی خوشحالی کا پانا ہے۔ اور یہ ہرگز صحیح نہیں۔ کہ ہماری حقیقی خوشحالی صرف اُسی امر میں میسّر آسکتی ہے۔ جس کو ہم بذریعہ دعا چاہتے ہیں۔ بلکہ وہ خدا جو جانتا ہے۔ کہ ہماری حقیقی خوشحالی کس امر میں ہے۔ وہ کامل دعا کے بعد ہمیں عنایت کر دیتا ہے۔ جو شخص روح کی سچائی سے دعا کرتا ہے۔ وہ ممکن نہیں کہ حقیقی طور پر نامراد رہ سکے۔ بلکہ وہ خوشحالی جو صرف دولت سے مل سکتی ہے۔ اور نہ حکومت سے اور نہ صحت سے۔ بلکہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ جس پیرایہ میں چاہے وہ عنایت کر سکتا ہے۔ ہاں وہ کامل دعاؤں سے عنایت کی جاتی ہے اگر خدا تعالیٰ چاہتا ہے تو ایک مخلص صادق کو عین مصیبت کے وقت میں دعا کے بعد وہ لذت حاصل ہو جاتی ہے۔ جو ایک شہنشاہ کو تخت شاہی پر حاصل نہیں ہو سکتی۔ سو اسی کا نام حقیقی مراد یابی ہے۔ جو آخر دعا کرنے والوں کو ملتی ہے۔ اور اُن کی آفات کا

خاتمہ بڑی خوشحالی کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن اگر اطمینان اور سچی خوشی حاصل نہیں ہوئی۔ تو ہماری کامیابی بھی ہمارے لئے ایک دُکھ ہے۔ سو یہ اطمینان اور روح کی سچی خوشحالی تدابیر سے ہرگز نہیں ملتی۔ بلکہ محض دعا سے ملتی ہے۔ مگر جو لوگ خاتمہ پر نظر نہیں رکھتے۔ وہ ایک ظاہری مرادیابی یا نامرادی کو دیکھ کر مدار فیصلہ اُسی کو ٹھیرا دیتے ہیں۔ اور اصل بات یہ ہے۔ کہ خاتمہ بالخیر ان ہی کا ہوتا ہے۔ جو خدا سے ڈرتے اور دعا میں مشغول ہوتے ہیں۔ اور وہی بذریعہ حقیقی اور مبارک خوشحالی کے سچی مرادیابی کی دولت عظمیٰ پاتے ہیں ؎

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ملفوظاتِ احمدیہ

(حصّہ سوم)

(سلسلہ کیلئے دیکھو صفحہ ۴۸۳ حصّہ دوم)

مسٹر ڈکسن - میں نے آپ کا مدعا خوب سمجھ لیا ہے اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جہاں کہیں میں جاؤنگا میں یورپین لوگوں میں اس کا تذکرہ کروں گا۔

حضرت مسیح موعودؑ - ہم نے تو آپ کا چہرہ دیکھ کر ہی سمجھ لیا تھا۔ کہ آپ منصف مزاج آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ ہماری دلی آرزو یہی تھی۔ کہ آپ کچھ زیادہ دن ہمارے پاس ٹھیر جاتے تاکہ ہمیں پورا موقع ملتا کہ ہم اپنے اصول آپ کو سمجھا سکتے۔ اور آپ کو اُن پر اچھی طرح سے غور کرنے اور دریافت کرتے رہنے کا موقعہ ملتا۔ لیکن تاہم ہمیں امید ہے کہ آپ کی غور کرنے والی طبیعت ضرور کچھ نہ کچھ فائدہ حاصل کریگی۔ انسان کے اعلیٰ درجہ کے اخلاق کا نمونہ یہی ہے۔ کہ وہ راستی کے قبول کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہے بہت سے امور ایسے ہوتے ہیں کہ انسان محض ماں باپ کی تقلید کی وجہ سے باوجود اس کے کہ اُن میں صریح نقص دیکھتا ہے نہیں چھوڑتا۔ لیکن جو شخص سچے اخلاق اور اخلاقی جرأت سے حصّہ رکھتا ہے وہ ان باتوں کی کچھ پرواہ نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ صرف راستی کا خواہشمند ہوتا ہے بچپن میں انسان کی دو قوتیں بڑی تیز ہوتی ہیں۔ اوّل ہر ایک چیز اس کے دل کے اندر اثر کرتی ہے دوم ہر چیز اُس کے حافظہ میں محفوظ ہو جاتی ہے۔ بچہ کبھی دلائل نہیں پوچھتا کہ کیوں یہ بات اس طرح ہے لیکن اصل شجاعت یہ ہے کہ انسان اُن باتوں کو شیر مادہ کی طرح پی جائے۔ جنکی سچائی پر اُسے یقین کامل ہو جائے

اور جن باتوں میں معرفت کا رنگ اور قوت نہ ہو ان کو چھوڑنے کیلئے فوراً تیار ہو جائے۔ انسان کے جملہ قوائے کا بادشاہ انصاف ہے۔ اگر یہ قوت کسی انسان میں نہ ہو تو سب سچائیوں سے اُسے محروم رہنا پڑتا ہے۔ انسان دنیا میں اس لئے نہیں آیا کہ وہ باطل کا ذخیرہ جمع کرتا رہے۔ بلکہ اُسے حقیقت شناس اور حق پرست ہونا چاہیئے۔ دنیا میں سچائی کے ساتھ باطل بھی موجود ہے اور اس میں ذرا بھی تعجب کی بات نہیں کہ باطل پرست لوگ اُسے سچائی سے بھی بڑھکر چمکدار دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ایک دانشمند انسان اس سے دھوکہ نہیں کھا سکتا۔ بلکہ اس پر لازم ہے کہ ہر ایک بات کو پورے طور پر پرکھ کر قبول کرے موجودہ زمانہ میں مذاہب کا ایک اکھاڑہ لگا ہوا ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ اس کوشش میں ہے۔ کہ وہ اپنے آپ کو سچا ثابت کرے۔ ان حالات میں ایک سمجھدار انسان پر واجب ہے۔ کہ بجائے ان مذاہب کے مدعیوں کی باتوں کو بلا چون و چرا تسلیم کرنے کے اُن کو پرکھ کر دیکھ لے کہ کس مذہب میں روحانیت موجود ہے اور کس کے ساتھ تائیدی نشانات ہیں۔ اور کون اُن میں سے گناہ کے مہلک کیڑے کو ہلاک کرنے کی اپنے اندر طاقت رکھتا ہے۔ میں آپ کو اپنے تجربہ کی بنا پر کہتا ہوں۔ کہ خدا تعالیٰ کی سچی معرفت جس کی گرمی کی وجہ سے گناہ کے جراثیم ہلاک ہو جاتے ہیں۔ وہ اسلام اور صرف اسلام ہی میں ملتی ہے۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ کسی کا خون ان جراثیم کو تباہ و برباد کر دے۔ بلکہ تجربہ تو یہ بتاتا ہے۔ کہ گرے ہوئے خون میں کثرت سے جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں۔ اسلئے قانونِ قدرت کے رو سے بھی کسی کا خون انسان کے گناہوں کی معافی کا ذریعہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ نجات اور پاکیزگی حاصل کرنے کی حقیقی راہ وہی ہے جو میں نے آپ کے سامنے بیان کی ہے۔ اسلئے ساری دنیا پر لازم ہے کہ اسی کو تلاش کرے۔ (الحکم ۲ جلد ۶)

نوٹ:۔ اس تقریر کے ختم ہوتے ہی نہر کا پُل آگیا۔ جو قادیان سے چار میل کے فاصلہ پر ہے۔ جہاں حضرت مسیح موعودؑ نے مسٹر ڈکسن کو بٹالہ کیلئے رخصت کیا اور آپ واپس قادیان تشریف لے گئے۔

۱۹ نومبر ۱۹۰۱ء۔ حضرت مسیح موعودؑ حسب معمول صبح کے وقت سیر کیلئے باہر تشریف لیگئے۔ راستہ میں مولوی محمد احسن صاحب امروہی نے عرض کیا کہ حافظ محمد یوسف صاحب کا ایک خط آیا ہے۔ جس میں اُس نے لکھا ہے۔ کہ اشتہار "ایک غلطی کا ازالہ" میں نے سُنا ہے۔ اس میں نبوت کا دعویٰ مرزا صاحب نے کیا ہے۔ اور تم اب مقلد ہو گئے۔ اسلئے میں تم سے ملاقات کرنی نہیں چاہتا۔ یہ گویا اس کارڈ کا مفہوم تھا۔

اس پر حضرت مسیح موعودؑ نے فرمایا کہ اس خط کا جواب مفصل ان کو لکھدیا جاوے۔ تاکہ تبلیغ ہو جاوے۔ فرمایا کہ تعجب کی بات ہے۔ کہ یہ لوگ اسے دعویٰ جدید کہتے ہیں۔ براہین میں ایسے الہامات موجود ہیں۔ جن میں نبی یا رسول کا لفظ آیا ہے۔ چنانچہ ھوالذی ارسل رسولہ بالھدیٰ اور جری اللہ فی حلل الانبیاء وغیرہ ان پر غور نہیں کرتے اور پھر افسوس یہ نہیں سمجھتے کہ ختم نبوت کی مُہر مسیح اسرائیلی کے آنے سے ٹوٹتی ہے۔ یا خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے سے۔ ختم نبوت کا انکار وہ لوگ کرتے ہیں۔ جو مسیح اسرائیلی کو آسمان سے اُتارتے ہیں۔ اور ہمارے نزدیک تو کوئی دوسرا آیا ہی نہیں۔ نہ بنا بنی نہ پرانا بنی۔ بلکہ خود حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی چادر دوسرے کو پہنائی گئی ہے اور وہ خود ہی آئے ہیں۔ کیا اگر شیشہ (آئینہ) میں حافظ صاحب اپنی تصویر دیکھیں تو کیا عورتوں کو پردہ کرلینا چاہیئے۔ کہ یہ کون غیر محرم گھس آیا۔ آپ ان کو خوب مفصل اور واضح خط لکھیں۔ پھر سلسلہ کلام میں فرمایا کہ انبیا علیہم السلام کے آنے کے وقت لوگوں کے حالات دو قسم کے ہوتے ہیں۔ وہ استعارات کو حقیقت پر محمول کرنا چاہتے ہیں۔ اور حقیقت کو استعارہ بنانا چاہتے ہیں۔ یہی مصیبت اب ان کو پیش آئی ہے۔ یہ کوئی ایسا دجّال دیکھنا چاہتے ہیں۔ جس کی آنکھ درحقیقت باہر نکلی ہوئی ہو۔ اور پورے ستر گز کا اس کا گدھا ہو۔ اور آسمان سے حضرت عیسیٰؑ کبوتر کی طرح منڈلاتے ہوئے اُتریں۔ یہ کبھی ہونا ہی نہ تھا۔ یہودیوں کو بھی حضرت عیسیٰؑ کے وقت یہی مصیبت پیش آئی۔ وہ یہی سمجھے بیٹھے تھے کہ مسیح سے پہلے جیسا کہ ملاکی نبی کی کتاب میں لکھا ہے۔ آسمان سے ایلیا اُتریگا۔ چنانچہ جب مسیحؑ آیا تو اُنہوں نے یہی اعتراض کیا۔ مگر مسیحؑ نے اُن کو جواب میں یہی کہا۔ کہ ایلیا آچکا اور وہ یہی یحییٰ بن زکریا ہے۔ یہودی سمجھتے تھے کہ خود ایلیا آئیگا۔ اس لئے وہ منکر ہوگئے۔ چنانچہ ایک یہودی کی کتاب میں نے منگوائی تھی۔ اس میں وہ صاف لکھتا ہے کہ اگر خدا تعالیٰ ہم سے مواخذہ کریگا تو ہم ملاکی نبی کی کتاب کھولکر رکھ دینگے۔ کہ اس میں تو صاف لکھا ہوا ہے۔ کہ ایلیا پہلے آسمان سے آئیگا یہ کہاں لکھا ہے کہ وہ یحییٰ ہی ہوگا۔ اب ہمارا دعویٰ تو خود حضرت مسیحؑ کی ہائی کورٹ سے فیصلہ ہوگیا۔ کہ جس کے دوبارہ آنے کا وعدہ ہوتا ہے۔ اس کی آمد ثانی کا یہ رنگ ہوتا ہے۔ کہ اُسکی خو بو اور خواص پر کوئی دوسرا آتا ہے۔ یہی دھوکہ اور غلطی ہمارے علما کو لگی ہے۔ یہ اصل میں ایک استعارہ ہے۔ جسکو اُنہوں نے حقیقت پر حمل کرلیا ہے۔ ایسا ہی دجّال اور اس کے لوازمات کو حقیقت بنادیا۔

عیسائیوں نے بھی دھوکا کھایا۔ حضرت عیسیٰؑ نے اپنے بعد فارقلیط کے آنے کی پیشگوئی

کی تھی۔ عیسائیوں نے اس سے روح القدس مراد لی۔ حالانکہ فی الحقیقت اس سے حضرت نبی کریمؐ مراد تھے۔ لفظ فارقلیط۔ دو الفاظ فارق اور لیط سے مرکب ہے۔ لیط شیطان کو کہتے ہیں غرض یہ بڑی خطرناک غلطی ہے۔ جو انبیاءؑ کی بعثت کے وقت لوگ کھایا کرتے ہیں۔ یعنی استعارات کو حقیقت پر اور حقیقت کو استعارات پر محمول کر لیتے ہیں۔

بعد ازاں حضرت مسیح موعودؑ نے حضرت بیوی صاحبہ کی ایک رویا سنائی جو انہوں نے گذشتہ شب دیکھی تھی۔ اور وہ یہ ہے۔ "آپنے دیکھا۔ کہ دوپہر کے بعد ظہر کے وقت جس وقت کہ یکے عموماً بٹالہ سے قادیاں پہنچتے ہیں۔ حضرت مسیح موعودؑ کچھ اسباب اور دو سردے لیکر گئے ہیں اور حضرت بیوی صاحبہ کو دیئے ہیں۔ اُسی وقت مرزا غلام قادر صاحب (حضرت مسیح موعودؑ کے برادر کلاں مرحوم) آگئے ہیں اور ان کے ہمراہ رحمت اللہ (حضرت مسیح موعودؑ کے والد مرحوم کا مختار) بھی ہے۔ اس پر حضرت بیوی صاحبہ نے حضرت مسیح موعودؑ سے دریافت کیا۔ کہ ان کے کھانے کا کیا انتظام ہوگا۔ (اس خیال سے کہ ان کا گھر دوسری طرف ہے۔ اور بیوی بھی موجود ہے۔ جن سے آپ کا موجودہ صورت میں بکلی انقطاع ہے) اس کے جواب میں حضرت مسیح موعودؑ نے فرمایا۔ کہ دراصل وہ مر گئے ہیں۔ اور وہ دونوں گھروں کے دیکھنے کیلئے آئے ہیں۔ حضرت بیوی صاحبہ نے فرمایا۔ کہ رحمت اللہ خاص آپ سے ملنے کیلئے آیا ہے۔ پھر منظور علی ایک لڑکا ایک پوٹلی کپڑوں کی اُس دوسرے گھر میں ہمارے ہی مکان کی سیڑھیوں میں سے گذر کر اُس طرف کو لے گیا ہے۔ جسے اُنہوں نے کھولا تو اس پوٹلی میں سیاہ بوٹی اور سفید زمین کی ایک چھینٹ تھی۔ اس کے بعد ان کا باقی اسباب بھی ادھر ہی آگیا جس پر معلوم ہوا۔ کہ منظور علی جو پوٹلی ادھر لے گیا تھا وہ بھی غلطی سے لے گیا تھا۔ دراصل وہ بھی ادھر ہی کی تھی"۔ اس کے بعد آنکھ کھل گئی حضرت مسیح موعودؑ نے فرمایا۔ کہ اس رویا کے بعض اجزاء میری کل والی رویا سے ملتے ہیں پھر فرمایا۔ کہ غلام قادر میں جو قادر کا لفظ ہے۔ اس کا تعلق دونوں گھروں سے ہے۔ مگر رحمت اللہ مخصوص اسی گھر سے ہے۔ پھر سیر سے واپسی پر آپنے اپنا ایک تازہ الہام سنایا۔ "نواب مبارکہ بیگم"

بعد ازاں پیر سراج الحق نے اپنا ایک رویا سنایا۔ اور آپ اندرون خانہ تشریف لے گئے۔ اسی دن بعد نماز شام آپ مرزا خدا بخش صاحب سے ان کی کتاب عسل مصفّٰی سنتے رہے۔

(الحکم جلد ۵ ۴۴)

۲۰ نومبر ۱۹۰۱ء۔ صبح کی سیر میں حضرت مسیح موعودؑ نے فرمایا۔ "جب انسان حجت اللہ کے

مقام پر ہوتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ ہی اُس کے تمام جوارح ہو جاتا ہے۔ اور یہ بالکل سچی بات ہے۔ کہ جب انسان اللہ تعالیٰ سے پوری پوری صلح کر لیتا ہے اور اپنی مرضی اور تمام خواہشات اور قویٰ کو اُس کے ہی سپرد کر دیتا ہے۔ تو خدا تعالیٰ اس کی ساری قوتیں ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال بعینہٖ ایسی ہے جیسا کہ لوہے کو جب آگ میں ڈال دیا جائے۔ تو وہ خوب گرم ہو کر آگ کی طرح سُرخ ہو جاتا ہے۔ پھر اس وقت اس میں وہی خواص ہوتے ہیں۔ جو آگ کے ہوتے ہیں۔ ذرا بھی فرق نہیں رہتا"۔

پھر سلسلہ بیں کسی دوسرے موقعہ پر فرمایا۔ "میں نے غور کیا ہے کہ مکر کا لفظ آنحضرتؐ اور حضرت مسیحؑ کیلئے قرآن شریف میں آیا ہے اور پھر میرے لئے بھی یہی لفظ براہین احمدیہ میں آیا ہے۔ حضرت مسیحؑ کے قتل کیلئے بھی ایک مخفی منصوبہ کیا گیا تھا۔ اسی طرح آنحضرتؐ کیلئے بھی کیا گیا۔ اور پھر میرے لئے بھی کیا گیا۔ اور ابھی تک موقعہ لگے۔ تو کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی تدبیر (مکر) ان سب پر غالب آئی۔ مکر مخفی اور لطیف تدبیر کو کہتے ہیں۔ لیکھرام نے اپنے خطوط میں مجھے یہی لکھا تھا۔ کہ خیر الماکرین سے میرے لئے کوئی نشان طلب کرو۔ جب خدا تعالیٰ باریک در باریک اسباب سے مجرم کو ہلاک یا ذلیل کرتا ہے۔ اور اپنے راستباز بندے کو دشمن کے منصوبوں اور شرارتوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ تو اس وقت اس کا نام خیر الماکرین بیان کیا جاتا ہے۔ یعنی مجرم کی سزا کیلئے ایسے مخفی اسباب مہیا کرتا ہے۔ کہ جن اسباب کو اس نے کسی بہتری کی غرض کیلئے مہیا کر رکھا ہوتا ہے۔ پس وہی اسباب جو دشمن اپنی بہتری کیلئے تیار کرتا ہے۔ وہ اسکی ہلاکت کا موجب بن جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ حضرت مسیح کو ایسی طرز پر بچایا کہ وہ اسباب جو اُن کی ہلاکت کیلئے جمع کئے گئے تھے انکی زندگی کا موجب ہو گئے۔ اسی طرح آنحضرتؐ کو کس طرح کفار مکہ کے منصوبوں سے بچا لیا۔ اسی طرح پر میرے ساتھ بھی اُس کا وعدہ ہے۔ اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے۔ کہ حضرت مسیحؑ کو بیت المقدس میں اور آنحضرتؐ کو مکہ ہی میں محفوظ کیوں نہ رکھا۔ تو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ سنت اللہ اس طرح نہیں۔ بلکہ خدا تعالیٰ نے اپنا علم ظاہر کرنا چاہا۔ اور اسی لئے ایسی جگہ سے ان کو نکال لیا۔ مکر کی حد اسی وقت تک ہے۔ جب کہ وہ انسانی تدبیر تک ہو۔ مگر جب انسانی منصوبوں کے رنگ سے نکل گیا۔ تو پھر وہ خارق عادت معجزہ ہو جاتا ہے۔ اگر کسی شخص میں ذرہ بھر بھی ایمان ہو۔ تو وہ ان امور کو نہایت صفائی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے کوئی بھی نبی ایسا نہیں گذرا۔ جس کیلئے ہجرت نہ ہو۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۴۴)۔

۲۱ نومبر ۱۹۰۱ء ۔ صبح کی سیر میں حضرت مسیح موعودؑ نے "گناہ سوز فطرت کیسے ملے"

کے مضمون کے ضمن میں ایک تقریر فرمائی۔ جو مضمون آپ نے رسالہ ریویو آف ریلیجنز کیلئے لکھا تھا چلتے چلتے پوری تقریر کا قلمبند کرنا قریباً ناممکن تھا۔ تاہم تقریر کا بہت سا حصہ نوٹ کر لیا گیا تھا جسے اپنے الفاظ میں مرتب کیا گیا ہے۔ رسالہ ریویو آف ریلیجنز کے مضمون کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا۔ ایک ضروری اور غور طلب سوال ہے جسے کل دنیا کی اقوام اور مذاہب نے اپنی اپنی جگہ پر محسوس کیا ہے اور وہ سوال یہ ہے۔ کہ "انسان گناہوں سے کیونکر بچ سکتا ہے"؟ یہ سوال درحقیقت ہر ایک انسان کے دل میں اُٹھتا ہے۔ جبکہ وہ دیکھتا ہے۔ کہ کس طرح پر نفسِ انسانی بے قابو ہو ہو جاتا ہے۔ اور مختلف قسم کے خیالاتِ فاسدہ آ آ کر اُسے گھیر لیتے ہیں۔ ان خیالاتِ بد سے بچنے کیلئے ہر قوم و مذہب نے کوئی نہ کوئی تدبیر نباہ رکھی ہے۔ اور کوئی نہ کوئی حیلہ نکال رکھا ہے۔ مثلاً عیسائیوں نے اس ضرورت اور سوال کو مدّ نظر رکھ کر مسیح کا خون بطور نجات گناہ پیش کیا ہے۔ لیکن انسان کیلئے سب سے اوّل اس بات کا دیکھنا ضروری ہے۔ کہ نجات ہے کیا چیز؟ نجات کی اصل حقیقت تو صرف اسقدر ہے کہ انسان گناہوں سے بچ جائے اور جو فاسقانہ خیالات اس کے دل کو سیاہ کرتے ہیں۔ ان کا سلسلہ بند ہو کر سچی پاکیزگی حاصل ہو۔ اب نجات کی اس تعریف کو مدّ نظر رکھ کر ہم دیکھتے ہیں۔ کہ عیسائیوں نے گناہ سے بچنے کی ضرورت کو محسوس کیا۔ اور لوگوں کے سامنے نجات کے حصول کا یہ ذریعہ پیش کیا کہ مسیح کا خون انسان کو گناہ سے نجات دلا سکتا ہے۔ پس اگر یہ بات درحقیقت درست ہے۔ کہ مسیح کا خون یا کفارہ انسان کو گناہوں سے بچا سکتا ہے تو سب سے پہلے ہم یہ بات معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ کہ کفارہ اور گناہوں سے بچنے کے درمیان کوئی رشتہ اور تعلق بھی ہے یا نہیں۔ جب ہم غور کرتے ہیں تو یہ بات صاف طور پر معلوم ہو جاتی ہے۔ کہ ان دونوں میں باہمی کوئی رشتہ یا تعلق نہیں ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے۔ جیسا کہ ایک استسقا کا مریض ایک طبیب کے پاس علاج کیلئے جائے تو وہ طبیب بجائے اصل بیماری کا علاج کرنے کے مریض سے کہے کہ اسکی کتاب کا ایک جزو لکھدے۔ یہی تیسری مرض کا علاج ہے۔ تو دنیا میں کونسا عقلمند ہوگا جو اس علاج کو قبول کریگا۔ بعینہٖ اسی قسم کا تعلق مسیح کے خون اور گناہ سے بچنے کے درمیان ہے۔ اگر ایسا نہیں۔ تو اور کس قسم کا ہے؟ یا دوسری مثال اس قسم کی سمجھ لو۔ کہ ایک شخص کے سر میں درد ہوتا ہو۔ تو دوسرا آدمی اس پر رحم کھا کر اپنے سر میں ایک پتھر مار لے۔ اور اُسے اس کے درد کا علاج سمجھے۔ یہ کیسی مضحکہ خیز بات ہوگی۔ پس ہمیں کوئی بتلائے۔ کہ عیسائیوں نے سوائے اس کے اور کیا ہمارے سامنے پیش کیا ہے؟ جو کچھ وہ پیش کرتے ہیں۔ وہ تو ایک قابل

شرم ہناوٹ ہے۔ گناہوں کا علاج کیا؟ یسوع کی خودکشی۔ جس کا گناہوں سے پاک کرنے کا کوئی رشتہ اور حقیقی تعلق نہیں۔ ہم بعض دفعہ یہ سوچ کر حیران ہو جاتے ہیں۔ کہ یسوع کو کیا سوجھی۔ کہ دوسروں کو گناہوں سے نجات دلانے کیلئے خود صلیبی موت اختیار کی۔ اگر وہ اپنے آپ کو صلیب کی اس لعنتی موت سے بچا لیتا۔ اور کسی معقول طریقہ پر بنی نوع کو فائدہ پہنچاتا۔ تو اس خودکشی کے فعل سے بدرجہا بہتر اور مفید ہوتا۔ غرض کفارہ کے ابطال پر یہ نہایت زبردست دلیل ہے۔ کہ گناہوں کے علاج اور کفارہ میں باہمی کوئی رشتہ اور تعلق نہیں ہے۔ اور پھر دوسری دلیل ابطال کفارہ پر یہ ہے کہ اس سوال کا جواب سوچا جائے۔ کہ کفارہ نے گناہوں سے بچنے کی فطری خواہش کو کہاں تک پورا کیا؟ اس کا جواب صاف نفی میں ہے۔ چونکہ کفارہ اور علاج گناہ میں کوئی تعلق نہ تھا اسلئے کفارہ گناہوں کے اُس جوش اور سیلاب کو روک نہ سکا۔ جو اس عقیدہ کے ماننے والوں کے درمیان بہ رہا ہے۔ اگر کفارہ میں گناہوں سے بچانے کی کوئی تاثیر ہوتی۔ تو یورپ کے عیسائی مرد و عورت گناہوں سے ضرور بچ جاتے۔ جو کہ ہر قسم کے فسق و فجور میں بُری طرح مُبتلا ہیں۔ اور اگر کسی کو یورپین ممالک کے کثرت گناہ میں شک ہو۔ تو وہ بچشم خود لنڈن کے پارکوں اور ہوٹلوں میں جا کر دیکھ لے۔ کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ زنا کی کثرت اس بات کا خوف دلاتی ہے۔ کہ کہیں اُن ممالک میں زنا کے جواز کا فتویٰ ہی جاری نہ ہو جائے۔ گو عملاً تو وہ رائج ہی ہے۔ شراب کا استعمال اُن ممالک میں اس کثرت سے بڑھتا جا رہا ہے۔ کہ مشہور ہے۔ کہ کچھ روز ہوئے۔ ایک عورت نے کسی ہوٹل میں پینے کیلئے پانی مانگا۔ تو اُسے کہا گیا۔ کہ پانی تو برتن دھونے اور نہانے وغیرہ کے کام آتا ہے۔ پینے کیلئے تو شراب ہی ہوتی ہے۔ ان امور پر غور کر کے دیکھ لو۔ کہ گناہوں کے سیلاب کو روکنے کیلئے یسوع کے خون کا بند تو کافی نہ ہو سکا۔ بلکہ گناہوں کے سیلاب عظیم نے اپنی رَو میں پہلے بندوں کو بھی توڑ دیا۔ اور عیسائیوں کو گناہ کی پوری آزادی اور اباحت کے قریب پہنچا دیا۔ اس لئے اب قدرتاً یہ سوال دل میں پیدا ہوتا ہے۔ کہ کفارہ تو انسانوں کو گناہوں سے بچا نہیں سکتا۔ لیکن کیا کوئی اور طریق بھی ہے۔ جس پر عمل کرنے سے انسان گناہوں سے بچ جائے؟ میں کہتا ہوں۔ کہ ہاں علاج موجود ہے اور ضرور ہے۔ اور وہ علاج یقینی علاج ہے۔ مگر جس طرح سے کہ سچی باتوں کے ساتھ مشکلات ہوتی ہیں۔ ویسے ہی یہ علاج بھی مشکلات سے خالی نہیں۔ یہ یاد رکھو۔ کہ جھوٹ کے ساتھ مشکلات نہیں ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک کیمیاگر جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ ایک دم میں ایک دو ہزار روپیہ بنا سکتا ہے۔ وہ اس فعل میں کوئی مشکلات نہیں رکھتا۔ لیکن اسکے

خلاف ایک زمیندار کو کس قدر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ایک تاجر کو اپنا مال کس قدر خطرہ میں ڈالنا پڑتا ہے۔ پھر ایک ملازم قسم قسم کی پابندیوں اور ماتحتیوں کے نیچے آکر کن مشکلات میں ہے۔ پس تم سہل باتوں سے ڈرو۔ جو لوگ پھونک مار کر سب کچھ بنا دینے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ خطرناک عیّار ہیں۔

میرا مطلب یہ ہے۔ کہ عیسائیوں کا پیش کردہ گناہوں سے بچنے کا علاج تو بجز اباحت کے اور کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔ بلکہ یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے۔ ع عیسائی باش ہرچہ خواہی کن اور یہی وجہ ہے۔ کہ اس مسئلہ پر اعتقاد کی وجہ سے دہریت کی رگ پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے سبب سے انسان گناہ پر دلیر ہو جاتا ہے اور جس قدر سم الفار کی مہلک تاثیر کا ڈر ایک انسان کو اس کے کھانے سے باز رکھ سکتا ہے۔ اس قدر بھی خدا کی ہیبت اُس کو نافرمانی سے نہیں روکتی۔ اسکی وجہ یہی ہے کہ ایسا شخص خدا تعالیٰ کی عظمت۔ اس کی ہیبت اور اس کے جلال و اقتدار سے بے خبر ہوتا ہے۔ تب ہی تو نافرمانی اور سرکشی کو ایک معمولی بات سمجھتا ہے اور گناہ پر دلیر ہو جاتا ہے اور نہیں ڈرتا ادنیٰ درجہ کے حکام اور اُن کے چپراسیوں تک کی نافرمانی سے اس کی جان گھٹ جاتی ہے لیکن خدا تعالیٰ کی نافرمانی سے اُس کے دل پر لرزہ نہیں پڑتا۔ وجہ یہ کہ خدا شناسی کی معرفت اُسے نہیں ملی اسی سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ گناہ کا علاج جو ہم دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ سوائے اس کے کوئی دوسرا علاج نہیں ہے اور وہ یہی ہے۔ کہ لوگوں کو خدا تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو۔ تمام سعادتمندیوں کا مدار خدا شناسی پر ہے اور نفسانی جذبات اور شیطانی محرکات سے روکنے والی صرف ایک ہی چیز ہے۔ جو خدا تعالیٰ کی معرفت کاملہ کہلاتی ہے۔ جس سے پتہ لگ جاتا ہے۔ کہ خدا ہے اور وہ بڑا قادر ہے وہ ذو العذاب الشدید ہے۔ یہی ایک نسخہ ہے۔ جو انسان کی متمردانہ زندگی پر ایک بھسم کر دینے والی بجلی گرا دیتا ہے۔ پس جبتک انسان امنت باللہ کی حدود سے نکل کر عرفت اللہ کی منزل میں قدم نہیں رکھتا۔ تب تک اس کا گناہوں سے بچنا محال ہے۔ اور یہ بات کہ ہم خدا تعالیٰ کی معرفت اور اسکی صفات پر یقین لانے سے گناہوں سے کیونکر بچ جائینگے۔ ایک ایسی صداقت ہے۔ جس کو ہم جھٹلا نہیں سکتے۔ ہمارا روزانہ تجربہ اس امر کی دلیل ہے۔ کہ جس چیز سے انسان ڈرتا ہے۔ اس کے نزدیک بھی نہیں جاتا۔ مثلاً جبکہ اسے یہ علم ہو۔ کہ سانپ ڈس لیتا ہے اور اس کا ڈسا ہوا ہلاک ہو جاتا ہے۔ تو وہ کون دانشمند ہے۔ جو اس کے منہ میں اپنا ہاتھ دینا تو درکنار کبھی اس لاٹھی کے نزدیک بھی جانا پسند کرے۔ جس سے کوئی زہریلا سانپ مارا گیا ہو۔ کیونکہ اُسے خیال ہوتا ہے۔ کہ کہیں اُسکے

زہر کا اثر لاٹھی میں بھی باقی نہ ہو۔ یا اگر کسی شخص کو معلوم ہو جائے۔ کہ فلاں جنگل میں شیر ہے۔ تو ممکن نہیں کہ وہ اس میں سے سفر کر سکے یا کم از کم تنہا اس میں جا سکے۔ بچوں تک میں یہ مادہ اور شعور موجود ہے۔ کہ جس چیز کے خطرناک ہونے کا اُن کا یقین دلایا گیا ہو۔ وہ اس سے ڈرتے ہیں۔ پس جبتک انسان میں خدا کی معرفت اور گناہوں کے زہر کا یقین پیدا نہ ہو۔ کوئی اور طریق خواہ وہ کسی کی خودکشی ہو یا قربانی کا خون نجات نہیں دے سکتا اور گناہ کی زندگی پر موت وارد نہیں کر سکتا۔ یقیناً یاد رکھو کہ گناہوں کا سیلاب اور نفسانی جذبات کا دریا بجز اس کے رُک ہی نہیں سکتا۔ کہ ایک چمکتا ہوا یقین اس کو حاصل ہو۔ کہ خدا ہے۔ اور اسکی تلوار ہے۔ جو ہر ایک نافرمان پر بجلی کی طرح گرتی ہے۔ اور جب تک یہ پیدا نہ ہو۔ انسان گناہ سے بچ نہیں سکتا۔ اگر کوئی شخص یہ کہے۔ کہ وہ خدا پر ایمان رکھتا ہے۔ اور اس بات پر بھی کہ خدا تعالیٰ نافرمانوں کو سزا دیتا ہے تاہم گناہ اس سے دور نہیں ہوتے؟ تو میں کہتا ہوں کہ یہ بات جھوٹ ہے اور محض نفس کا مغالطہ ہے۔ سچے ایمان اور سچے یقین اور گناہ میں باہم عداوت ہے۔ جہاں سچی معرفت اور چمکتا ہوا یقین خدا پر ہو۔ وہاں ممکن نہیں کہ گناہ رہے۔ جبکہ انسانی فطرت میں یہ خاصہ موجود ہے۔ کہ سچی معرفت انسان کو نقصان سے بچا لیتی ہے۔ جس طرح کہ سانپ۔ شیر اور زہر کی مثال مندرجہ بالا سے بتایا جا چکا ہے پھر یہ بات کیونکر درست ہو سکتی ہے۔ کہ ایمان بھی ہو اور گناہ دور نہ ہو۔ میں دیکھتا ہوں کہ میسمریزم میں محض رعب و داب کے سلسلہ کا سبب اُن کے اسرار کے اظہار سے ان کے ممبروں کو روکتا ہے اور کچھ نہیں۔ پھر کیوں خدا تعالیٰ کی عظمت و جبروت پر ایمان گناہ سے نہیں بچا سکتا؟ میں کہتا ہوں کہ اگر خدا تعالیٰ پر سچا ایمان ہو۔ تو وہ ضرور بچا سکتا ہے اور بالضرور بچا سکتا ہے۔ پس گناہ سے بچنے کیلئے حقیقی راہ خدا تعالیٰ کی تجلیات ہیں۔ لیکن اس کیلئے ایسی آنکھ کا پیدا کرنا شرط ہے جو اُن تجلیات کا مشاہدہ کر سکے اور خدا تعالیٰ کی عظمت کو دیکھ لے اور پھر اس یقین کی ضرورت ہے۔ جو گناہ کے زہر پر پیدا ہو۔ زمین سے تاریکی پیدا ہوتی ہے اور آسمان اس تاریکی کو دور کر دیتا ہے اور ایک روشنی عطا کرتا ہے۔ زمینی آنکھ بے نور ہوتی ہے۔ جبتک کہ آسمانی روشنی کا ظہور اور طلوع نہ ہو۔ اس کیلئے جب تک آسمانی نور جو نشانات کے رنگ میں ملتا ہے کسی دل کو تاریکی سے نجات نہ دے۔ انسان اس پاکیزگی کو کب پا سکتا ہے جو گناہ سے بچنے میں ملتی ہے۔ اس لئے گناہوں سے بچنے کیلئے اُس نور کی تلاش کرنی چاہیئے۔ جو

یقین کی روشنی کے ساتھ آسمان سے اُترتا ہے۔ اور ایک ہمت اور قوت عطا کرتا ہے۔ اور تمام قسم کے گرد و غبار سے دل کو پاک کرتا ہے اس وقت انسان گناہ کے زہرناک اثر کو شناخت کر لیتا اور اس سے دور بھاگتا ہے جب تک یہ حاصل نہیں گناہوں سے بچنا محال ہے۔ یہ ایک طریق ہے۔ جو ہم پیش کرتے ہیں اسپر اگر کوئی اعتراض ہو سکتا ہے۔ تو بیشک ہم ہر ایک شخص کو اجازت دیتے ہیں۔ کہ وہ اُسے ہمارے سامنے پیش کرے۔ تا ایسا نہ ہو کہ وہ کسی عیسائی کے سامنے اس اصول کو بیان کرے اور پھر اُس کا کوئی اعتراض سُنکر اُسے شرمندہ ہونا پڑے۔ جو اعتراض اس پر ہو سکتا ہے۔ بیشک کیا جائے۔

(نوٹ:۔ اس پر شیخ یعقوب علی صاحب ایڈیٹر الحکیم نے عرض کی کہ اب اس سوال کا جواب باقی رہتا ہے۔ کہ جب گناہوں سے بچنے کیلئے سچی معرفت اور چمکتے ہوئے یقین کی ضرورت ہے۔ جو خدا تعالیٰ کی عظمت اور گناہ کے خطرناک زہر سے آگاہ کرے تو ایسا یقین کیونکر پیدا ہو؟)

حضرت مسیح موعودؑ نے فرمایا۔ کہ بیشک یہی بات ہے جسے میں خود بھی بیان کرنا چاہتا تھا۔ یہ بات کہ ایسا یقین کیونکر پیدا ہو۔ اس کیلئے اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں کہ ایسے یقین کے خواہشمند کیلئے ضروری ہے کہ وہ کونوا مع الصّٰدِقِین سے حصّہ لے۔ صادق سے صرف یہی مراد نہیں۔ کہ انسان زبان سے جھوٹ نہ بولے۔ یہ بات تو بہت سے دیگر مذاہب مثلاً ہندوؤں اور دہریوں میں بھی پائی جا سکتی ہے۔ بلکہ صادق سے مراد وہ شخص ہے۔ جس کی ہر بات صداقت اور راستی ہونے کے علاوہ اُس کے تمام حرکات و سکنات و اقوال سب صدق سے بھرے ہوئے ہوں۔ گویا یوں کہو کہ اس کا وجود ہی صدق ہو گیا ہو۔ اور اس کے اس صدق پر بہت سے تائیدی نشان اور آسمانی خوارق گواہ ہوں۔ چونکہ صحبت کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ اس لئے جو شخص ایسے آدمی کے پاس جو اپنے حرکات و سکنات و اقوال و افعال میں خدائی نمونہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ صحت نیت اور پاک ارادے اور مستقیم جستجو سے ایک مدت تک رہیگا۔ تو یقین کامل ہے کہ اگر وہ دہریہ بھی ہوگا تو آخر خدا تعالیٰ کے وجود پر ایمان لے آئیگا۔ کیونکہ صادق کا وجود خدا نما وجود ہوتا ہے۔ انسان اصل میں اُنس کا مجموعہ ہے۔ یعنی دو محبتوں کا۔ ایک اُنس وہ خدا تعالیٰ سے کرتا ہے اور دوسرا اُنس بنی نوع انسان سے۔ چونکہ انسانوں کو تو اپنے قریب پاتا اور دیکھتا ہے۔ اور اپنی نوع ہونے کی وجہ سے اُن سے فوراً متاثر ہو جاتا ہے۔ اس لئے ایک کامل انسان کی صحبت اور صادق کی معیت اُسے وہ نور عطا کرتی ہے جس سے وہ خدا تعالیٰ کو دیکھ

لیتا ہے۔ اور گناہوں سے بچ جاتا ہے۔ انسان کے دراصل دو وجود ہوتے ہیں ایک وجود تو وہ ہے۔ جو ماں کے پیٹ میں تیار ہوتا ہے اور جسے ہم اور تم دیکھتے ہیں جسے لیکر وہ رحم مادر سے باہر آتا ہے۔ اور یہ وجود بلا کسی فرق کے سب انسانوں کو ملتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ایک اور وجود بھی انسان کو دیا جاتا ہے۔ جو صادق کی صحبت میں تیار ہوتا ہے۔ یہ وجود بظاہر ایسا نہیں ہوتا کہ ہم اسے چھو کر یا ٹٹول کر دیکھ لیں مگر وہ ایسا وجود ہوتا ہے کہ اس کے پیدا ہونے پر اس مادی وجود پر ایک قسم کی موت وارد ہو جاتی ہے۔ اور وہ خیالات و حرکات و افعال جو اس سے پہلے صادر ہوتے تھے یا دل میں گذرتے تھے۔ یہ اُن سے بالکل الگ ہو جاتا ہے اور شبہات سے جو اس کے دل کو تاریک کئے رہتے تھے اُن سے اسے نجات مل جاتی ہے۔ اور یہ وجود ہی حقیقی نجات ہوتا ہے۔ جو سچی پاکیزگی کے بعد ملتا ہے۔ کیونکہ جبتک شبہات سے نجات نہیں۔ اُسے تاریکی سے نجات نہیں اور اسے سچی پاکیزگی میسّر نہیں۔ اور وہ خدا کو دیکھ نہیں سکتا اور اسکی عظمت و ہیبت کا اس کے دل پر اثر نہیں ہو سکتا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کو دیکھ نہیں سکتا۔ اور جو شخص اس دنیا میں خدا تعالیٰ کے دیکھنے سے بے نصیب ہے وہ قیامت کو بھی محروم ہی ہوگا جیسا کہ خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں فرمایا ہے۔ من کان فی ھٰذہٖ اعمٰی فھو فی الاٰخرۃ اعمٰی۔ اس سے یہ مُراد تو نہیں ہو سکتی۔ کہ جو اس دنیا میں اندھے ہیں۔ وہ قیامت کو بھی اندھے ہی ہونگے۔ بلکہ اس کا مفہوم یہی ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کو ڈھونڈھنے والوں کے دل نشانات سے ایسے سوز کئے جاتے ہیں۔ کہ وہ خدا تعالیٰ کو دیکھ لیتے ہیں۔ اور اسکی عظمت و جبروت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ دنیا کی ساری عظمتیں اور بزرگیاں اُن کی نگاہ میں ہیچ ہو جاتی ہیں۔ اور اگر خدا تعالیٰ کو دیکھنے کی آنکھوں اور اُس کے دریافت کرنے کے حواس سے اس دنیا میں اس کو حصّہ نہیں ملا۔ تو اس دوسرے عالم میں بھی وہ نہیں دیکھ سکیگا۔ پس اللہ تعالیٰ کو جیسا کہ وہ ہے کسی غلطی کے بدوں شناخت کرنا اور اسی دنیا میں سچے اور صحیح طور پر اس کی ذات و صفات کی معرفت حاصل کرنا ہی تمام روشنیوں اور تجلّیات کی کلید ہے۔ اسی سے وہ آگ پیدا ہوتی ہے۔ جو سب سے پہلے انسان کی گنہگار حالت پر موت وارد کرتی ہے اور پھر اسکو نور عطا کرتی ہے۔ جس سے وہ گناہ کو شناخت کرتا اور اسکی زہر پر اطلاع پا کر اس سے ڈرتا اور دُور بھاگتا ہے۔ پس یہی دو قسم کی آگ ہے۔ جو ایک طرف گناہ کو جلاتی اور دوسری طرف نیکیوں کی قدرت عطا کرتی ہے۔ اور اس کا نام جلال اور جمال کی آگ ہے۔ کیونکہ انسان

گناہ سے تو جلالی رنگ اور ہیبت سے ہی بچ سکتا ہے۔ یعنی جب یہ علم ہو۔ کہ اللہ تعالیٰ اس گناہ کی سزا میں شدید العذاب ہے اور مالک یوم الدین ہے۔ تو اس وقت انسان پر ایک ہیبت سی طاری ہو جائیگی جو اسے گناہ سے بچائیگی۔ اور جمال نیکیوں کی طرف جذب کرتا ہے۔ یعنی جب کہ یہ معلوم ہو جائے کہ خدا تعالیٰ رب العالمین ہے۔ رحمٰن ہے اور رحیم ہے۔ تو بے اختیار ہو کر دل اسکی طرف کھنچا جائیگا اور ایک سرور اور لذت کے ساتھ نیکیوں کا صدور ہونے لگیگا۔ جس طرح چاندی اور سونے کے صاف کرنے کیلئے ضروری ہے کہ اُسے کٹھالی میں ڈال کر اُس کے نیچے خوب آگ روشن کی جائے۔ جس سے وہ میل کچیل جو اُن کے ساتھ ملا ہُوا ہوتا ہے۔ فی الفور الگ ہو جاتا ہے۔ پھر بعد اس کے ان کو عمدہ اور خوبصورت زیورات کی شکل میں لانے کیلئے جو کسی حسین کے لئے بنایا جائے۔ اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ دوبارہ آگ دے کر ان کو مفید مطلب بنا لیا جائے۔ اور جب تک ان کو دو آگوں میں نہ ڈالا جائے۔ وہ خوبصورت اور درخشاں زیور کی شکل اختیار نہیں کر سکتے۔ عینہٖ اسی طرح جب تک انسان بھی جلالی اور جمالی آگوں میں نہ ڈالا جائے وہ گناہ سوز فطرت لیکر نیک بننے کے قابل نہیں ہوتا۔ اس لئے سب سے پہلے گناہ کو جلایا جاتا ہے۔ اور پھر جمالی آگ سے اُسے نیکی کی قوت عطا کی جاتی ہے۔ تب اسکی فطرت میں ایک روشنی اور چمک آجاتی ہے۔ جو نیکی اور بدی میں تمیز بتا کر اُسے نیکی کی طرف جذب کر لیتی ہے اس وقت اُسے ایک نئی پیدائش ملتی ہے۔ سورہ الدہر میں اسی پیدائش کی حالت کا بیان کافوری اور زنجبیلی شربت کی مثال سے کیا ہے۔ چنانچہ پہلے فرمایا:۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ مِنْ کَاْسٍ کَانَ مِزَاجُهَا کَافُوْرًا یعنی مومن جو خدا کے نیک بندے ہیں وہ کافوری پیالے پیتے ہیں۔ کافور کا لفظ اسلئے اختیار کیا گیا ہے۔ کہ کَفَرَ ڈھانکنے کو کہتے ہیں اور کافور مبالغہ کا صیغہ ہے۔ یعنی بہت ڈھانکنے والا۔ اسی طرح لفظ طاعون بھی ہے اور میں سمجھتا ہوں۔ کہ اس کا نام طاعون اسلئے رکھا گیا ہے۔ کہ یہ اہل حق پر طعن کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اور طاعون اور دیگر امراض وبائی ہیضہ وغیرہ میں کافور نہایت مفید چیز ہے۔ غرض کافوری پیالے کا پہلے ذکر فرمایا ہے۔ اور یہ اسلئے تاکہ اوّل یہ بنایا جائے۔ کہ کامل ہونے کے لئے کافوری پیالہ پہلے پینا چاہیئے۔ تاکہ دنیا کی محبت سرد ہو جائے۔ اور فسق و فجور کے وہ خیالات جو دل سے پیدا ہوتے تھے اور جن کی زہر روح کو ہلاک کرتی تھی۔ دبا دیئے جائیں۔ اور اس طرح پر انسان گناہ کی حالت سے نکل آئے۔ چونکہ پہلے میل کچیل کا دور ہونا ضروری تھا۔ اس لئے کافوری پیالہ پلایا گیا اور اس کے بعد دوسرا حصہ زنجبیل کا ہے۔ زنجبیل اصل میں دو الفاظ سے مرکب ہے زنا اور جبل سے

اور زناء لغت عرب میں اُوپر چڑھنے کو کہتے ہیں۔ اور جبل پہاڑ کو۔ اسلئے اس مرکب لفظ کے معنے یہ ہوئے کہ پہاڑ پر چڑھ گیا۔ اور یہ بات واقع ہے۔ کہ ایک زہریلے اور وبائی مرض کے بعد انسان کو اعلیٰ درجہ کی صحت تک پہنچنے کیلئے دو حالتوں میں سے گذرنا پڑتا ہے۔ اوّل وہ حالت ہوتی ہے۔ جبکہ زہریلے اور خطرناک مادے رُک جاتے ہیں اور انہیں اصلاح کی صورت پیدا ہوتی ہے اور زہریلے حملوں سے نجات ملتی ہے اور وہ مواد دبائے جاتے ہیں لیکن اعضائے جسمانی بدستور کمزور رہتے ہیں اور انہیں کوئی طاقت اور سکت نہیں ہوتی جس سے وہ کام کرنیکے قابل ہوں اور ربودگی کی سی حالت ہوتی ہے اور یہ وہ حالت ہے جسے کافوری پیالہ پینے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی اس حالت میں گناہ کا زہر دبا دیا جاتا ہے۔ اور گناہ کے زہر کے اُس جوش کو ٹھنڈا کیا جاتا ہے۔ جو نفس کی سرکشی اور خودسری کی حالت میں ہوتا ہے۔ لیکن ابھی تک نیکی کرنے کی طاقت و قوت نہیں آتی۔ دوسری حالت جس کا نام زنجبیلی حالت ہے۔ یہ وہ ہوتی ہے۔ جبکہ صحت کامل کے بعد توانائی اور طاقت آجائے۔ یہاں تک کہ پہاڑوں پر بھی چڑھ سکے۔ اور زنجبیل کی تاثیر چونکہ حرارت غریزی کو بڑھاتا ہے۔ اسلئے اللہ تعالیٰ نے یہ ذکر کرکے بتا دیا۔ کہ سب سے پہلے مومنوں کے گناہوں کی حالت پر موت وارد کی جاتی ہے اور پھر اُنہیں نیکی کی توفیق اور قوت عطا کی جاتی ہے۔ گناہ کی حالت میں انسان پستی اور ذلت میں ہوتا ہے اور جوں جوں گناہ کرتا جاتا ہے۔ نیچے ہی نیچے چلا جاتا ہے۔ لیکن جس وقت اُس کے گناہوں پر موت وارد ہو جاتی ہے۔ تو اس پستی کے گڑھے میں ہی پڑا رہتا ہے۔ جبتک کہ اُسے اوپر چڑھنے کیلئے زنجبیلی شربت نہ ملے۔ پس نیکیوں کی توفیق عطا ہو جانے پر وہ اوپر چڑھنا شروع کرتا ہے۔ اور یہ پہاڑ کی گھاٹیاں وہی ہیں جو صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ میں بیان ہوئی ہیں۔ خدا تعالیٰ کے راستبازوں اور منعم علیہم کی راہ ہی وہ اصل مقصود ہے جو انسان کیلئے خدا تعالیٰ نے رکھا ہے چونکہ اللہ تعالیٰ واحد ہے اور وحدت کو پسند کرتا ہے۔ اسلئے سب کام وحدت ہی کے ذریعہ سے کرتا ہے وہ اگر چاہتا تو سب لوگوں کو نبی بنا دیتا۔ مگر یہ امر وحدت کے خلاف تھا۔ اسلئے ایسا نہیں کیا۔ تاہم اس میں بخل بھی نہیں ہے۔ ہر ایک شخص جو اس کی راہ کو اختیار کرنے کیلئے سچا مجاہدہ کرتا ہے وہ اس کا لطف اور ذوق حاصل کر لیتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے۔ کہ اُمت میں ابدال ہوتے ہیں۔ جن کی فطرت کو بدلا دیا جاتا ہے۔ اور یہ تبدیلی اتباع سنّت اور دعاؤں سے ملتی ہے"۔

حضرت مسیح موعودؑ نے یہاں تک تقریر فرمائی تھی۔ کہ مولوی سیّد محمد احسن صاحب امروہی نے عرض کیا۔ کہ حضور یہ جو عیسائی لوگ بعض انبیاء کی زلۃ الاقدام کو قرآن شریف سے

بیان کرتے ہیں اس کا کیا جواب ہے۔ حضرت مسیح موعودؑ نے فرمایا:۔

یہ ان لوگوں کی غلطی ہے۔ گناہ کی تعریف میں انہوں نے دھوکا کھایا ہے۔ گناہ اصل میں جُناح سے لیا گیا ہے۔ اور جُناح کا تبادلہ لگ سے کیا گیا ہے۔ جیسے فارسی والے کر لیتے ہیں اور جناح اصل میں عمداً کسی طرف میل کر لینے کو کہتے ہیں۔ پس گناہ سے مراد ہے۔ کہ عمداً بدی کی طرف میل کیا جائے۔ ہم یہ ہرگز نہیں مان سکتے کہ انبیاء سے عمداً گناہ سرزد ہوا ہو اور نہ ہی قرآن شریف میں ایسا کہیں ذکر ہے۔ انبیاء سے گناہ کا صدور اس لئے ناممکن ہے۔ کہ عارفانہ حالت کے انتہائی مقام پر وہ ہوتے ہیں اور یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ عارف بدی کی طرف میل کرے۔ یہ سُنکر مولوی سید محمد احسن صاحب نے عرض کیا۔ کہ قرآن شریف میں جو بعض انبیاء کے زلتہ الاقدام کا ذکر ہوتا ہے تو وہ حقیقت میں اس سے زیادہ نہیں۔ کہ بشری تقاضاء کے مطابق کوئی اجتہادی خطا ہو جائے اور یہ ہو جانا کوئی بعید نہیں۔ کیونکہ انبیاء بشریت سے تو الگ نہیں ہوتے۔ اس پر حضرت مسیح موعودؑ سے دریافت کیا گیا کہ فَعَصٰی اٰدَمُ رَبَّہٗ کے کیا معنی ہیں؟

آپ نے فرمایا:۔ عَصٰی سے عمد تو نہیں پایا جاتا۔ کیونکہ دوسری جگہ خود خدا تعالیٰ فرماتا ہے فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَہٗ عَزْمًا۔ عَصٰی کے لفظ سے یاد آیا۔ میرا ایک فقرہ ہے۔ اَلْعَصَا عِلَاجُ مَنْ عَصٰی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جلالی تجلیات ہی سے انسان گناہ سے بچ سکتا ہے۔ (الحکم جلد ۵ ص۴۵)۔

۲۷ نومبر ۱۹۰۱ء۔ اللہ تعالیٰ کا کلام جو اس کے برگزیدوں اور رسولوں پر نازل ہوتا ہے اس میں ذرا بھی خشک نہیں۔ کہ وہ اپنے اندر عظیم الشان اعجاز رکھتا ہے اور کوئی شخص تنہا یا دوسروں کی مدد سے اس کی مثل لانے پر قادر نہیں ہوتا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی ہمت سلب کر دیتا ہے۔ اور اس طرح پر اپنے کلام کا معجزہ ہونا ثابت کرتا ہے۔ وہ بار بار مخالفین حق کو اس کی مثل لانے کی دعوت اور تحدی کرتا ہے۔ لیکن کوئی شخص اس کے مقابلے کے لئے اُٹھ نہیں سکتا۔ قرآن شریف جو اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ ایک کامل معجزہ ہے۔ دوسری کتابوں کے بارے میں ہمیں نظر نہیں آتا کہ ان میں ایسی تحدی کی گئی ہو۔ جیسی قرآن شریف نے اپنا مثل لانے کیلئے کی ہے۔ اگرچہ ہم اپنے تجربہ اور قرآن شریف کے معجزہ کی بنا پر یہ ایمان لاتے ہیں۔ کہ خدا تعالیٰ کا کلام ہر حالت میں معجزہ ہوتا ہے۔ تاہم قرآن شریف کا

اعجاز جس کا ماہیت اور جامعیت کے ساتھ معجزہ ہے۔ دوسرے کو ہم اس جگہ پر نہیں رکھ سکتے۔ کیونکہ اس کے معجزہ ہونے کی بہت سی وجوہات اور صورتیں ہیں۔ اور کوئی شخص بھی اسکی مثال لانے پر ہرگز ہرگز قادر نہیں۔ وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ کلام الٰہی معجزہ نہیں ہوتا۔ وہ بڑے ہی گستاخ اور دلیر ہیں۔ کیا وہ نہیں جانتے اور دیکھتے کہ خدا تعالیٰ کی ساری مخلوق بے مثل اور لانظیر ہے۔ پھر اس کا کلام کیوں بے نظیر نہ ہو۔ ساری دنیا کے مدبر اور صناع مل کر اگر ایک تنکا بنانا چاہیں تو ہرگز ہرگز نہیں بنا سکتے۔ پھر خدا کے کلام کا مقابلہ انسان کیسے کر سکتے ہیں؟ محض کلام یا الفاظ کے اشتراک سے کہدینا کہ یہ کوئی معجزہ نہیں۔ بڑی حماقت اور اپنی موٹی عقل کا ثبوت دینا ہے کیونکہ ان اعلیٰ مدارج اور کمالات پر ہر شخص اطلاع نہیں پا سکتا۔ جیسے ایک باریک بین نگاہ دیکھ سکتی ہے۔

میرا یہ مذہب ہے۔ کہ آنحضرتؐ کی خالص کلام لعل کی طرح چمکتی ہے۔ لیکن باایں ہمہ قرآن شریف آپ کے خاص کلام سے بالکل الگ اور ممتاز نظر آتا ہے۔ اسکی کیا وجہ ہے؟ ہر چیز کے مراتب ہوتے ہیں۔ مثلاً کپڑا ہے تو کھدر۔ ململ۔ خاصہ۔ لٹھا محض کپڑا ہونے کی حیثیت سے تو کپڑا ہی ہیں۔ اور اس لحاظ سے بھی کہ وہ سارے سفید ہیں۔ بظاہر ایک مساوات رکھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اسی طرح ریشم بھی سفید ہوتا ہے۔ لیکن کیا ہر ایک آدمی نہیں جانتا۔ کہ ان سب کے جُدا جُدا مراتب ہیں۔ اور ان میں فرق پایا جاتا ہے۔ ع گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی۔ پس جس طرح پر ہم جملہ اشیاء میں ایک امتیاز اور فرق دیکھتے ہیں۔ اسی طرح پر کلام میں بھی مدارج اور مراتب ہیں۔ آنحضرتؐ کا کلام دوسرے انسانوں کے کلام سے بالاتر اور ایک عظمت اپنے اندر رکھتا ہے۔ اور ایک پہلو سے اعجازی حد تک پہنچا ہوا ہے۔ لیکن خدا تعالیٰ کے کلام کے برابر ہرگز نہیں۔ پھر کوئی دوسرا کلام کس طرح خدا تعالیٰ کے کلام کا مقابلہ کر سکتا ہے؟ یہ ایک موٹی اور بدیہی بات ہے۔ جس سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ قرآن شریف ایک معجزہ ہے۔ علاوہ ازیں اور بھی وجوہات ہیں۔ جن کے سبب سے اسے اعجاز کا درجہ حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کلام اس قدر خوبیوں کا مجموعہ ہے۔ جو کسی پہلی کتاب میں ہرگز نہیں پائی جاتیں۔ خاتم النبیین کا لفظ جو آنحضرتؐ پر بولا گیا ہے۔ بجائے خود چاہتا ہے۔ اور بالطبع اس لفظ میں یہ مفہوم بھی رکھا گیا ہے۔ کہ وہ کتاب جو آنحضرتؐ پر نازل ہوئی ہے۔ وہ بھی خاتم الکتب ہو۔ اور سارے کمالات اس میں موجود ہوں۔ اور فی الحقیقت وہ جملہ کمالات قرآن شریف میں موجود ہیں۔ کیونکہ

کلام الٰہی کے نزول کا عام قاعدہ اور اصول یہ ہے۔ کہ جسقدر قوت قدسی اور کمال باطنی اُس شخص کا ہوتا ہے۔ جس پر کلام الٰہی نازل ہوتا ہے۔ اس قدر قوت اور شوکت اس کلام الٰہی میں ہوتی ہے۔ آنحضرتؐ کی قوت قدسی اور کمال باطنی چونکہ اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ رکھتی تھی۔ جس سے بڑھ کر نہ کسی انسان میں ہوئی اور نہ ہوگی۔ اس لئے قرآن شریف بھی تمام سابقہ کتب اور صحائف سے نہایت اعلیٰ مقام اور مرتبہ پر واقع ہوا ہے۔ جہاں تک کہ کوئی دوسرا کلام نہیں پہنچا۔ وجہ یہ کہ آنحضرتؐ کی استعداد اور قوتِ قدسی تمام سابقہ انسانوں سے بڑھی ہوئی تھی۔ اور تمام مقاماتِ کمال آپؐ پر ختم ہو چکے تھے۔ اور آپؐ انتہائی نقطہ پر پہنچے ہوئے تھے۔ اس مقام پر قرآن شریف جو آپؐ پر نازل ہوا۔ وہ کمال کو پہنچا ہوا ہے۔ اور جس طرح نبوت کے کمالات آپ پر ختم ہو گئے۔ اس طرح پر اعجاز کلام کے کمالات قرآن شریف پر ختم ہو گئے۔ اور آپؐ خاتم النبیین ٹھیرے اور آپ کی کتاب خاتم الکتب ٹھیری۔ جس قدر مراتب اور وجوہ اعجاز کلام کے ہو سکتے ہیں۔ اُن سب کے اعتبار سے آپؐ کی کتاب انتہائی نقطہ پر پہنچی ہوئی ہے۔ یعنی کیا باعتبار فصاحت و بلاغت۔ کیا باعتبار ترتیب مضامین۔ کیا باعتبار تعلیم کیا باعتبار کمالات تعلیم۔ کیا باعتبار ثمراتِ تعلیم۔ غرض جس پہلو سے دیکھو۔ اُسی پہلو سے قرآن شریف کا کمال نظر آتا ہے۔ اور اس کا اعجاز ثابت ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف نے کسی خاص امر کی نظیر نہیں مانگی۔ بلکہ عام طور پر نظیر طلب کی یعنی جس پہلو سے چاہو۔ مقابلہ کرلو۔ خواہ بلحاظ فصاحت و بلاغت خواہ بلحاظ مطالب و مقاصد۔ خواہ بلحاظ تعلیم۔ خواہ بلحاظ پیشگوئیوں اور غیب کے جو قرآن شریف میں موجود ہے۔ غرض کسی رنگ میں دیکھو یہ معجزہ ہے۔ گو نادان لوگ میری مخالفت کی وجہ سے اس امر کو قبول نہ کریں۔ لیکن اس سے قرآن شریف کے اعجاز میں کوئی فرق نہیں آسکتا۔ یہ لوگ جوش تعصب میں بعض وقت یہاں تک اندھے ہو جاتے ہیں۔ کہ ادب کے کل طریقوں کو پسِ پُشت ڈال دیتے ہیں لدھیانہ کے مباحثہ میں للہ ظہر و بطن بنے نے پیش کیا۔ تو مولوی محمد حسین صاحب کو جوش آگیا۔ اور راوی کی مخالفت شروع کر دی۔ کیا خدا کے کلام سے محبت اور ارادت کا یہی تقاضا ہونا چاہیئے تھا۔ یاد رکھو۔ الطریقۃ کلہ ادب اگر اسے درست نہ سمجھتا تھا تو قرآن شریف کی محبت کی وجہ سے اس قدر مخالفت بھی تو جائز نہ تھی۔ الغرض قرآن شریف ایک کامل اور زندہ معجزہ ہے اور کلام کا معجزہ ایسا ہوتا ہے۔ کہ کبھی اور کسی زمانہ میں وہ پرانا اور بوسیدہ نہیں ہو سکتا۔ اور نہ فنا کا ہاتھ اُس پر چل سکتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے معجزات کا اگر آج نشان دیکھنا چاہیں تو کہاں ہے؟

کیا یہودیوں کے پاس وہ عصا ہے۔ اور اُس میں اِس وقت بھی کوئی قدرت سانپ بننے کی ہے غرض جسقدر معجزات کل انبیاء سے صادر ہوئے اُن انبیاء کے ساتھ ہی اُن کے معجزات کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ لیکن ہمارے نبی کریم کے معجزات ایسے ہیں۔ کہ وہ ہر زمانہ اور ہر وقت تازہ بتازہ اور زندہ موجود ہیں۔ ان معجزات کا موجود ہونا اور ان پر موت کا ہاتھ نہ چلنا صاف طور پر اس امر کی شہادت دے رہا ہے۔ کہ آنحضرت ہی زندہ نبی ہیں۔ اور حقیقی زندگی یہی ہے۔ جو آپ کو عطا ہوئی۔ اور کسی دوسرے نبی اور انسان کو نہیں ملی۔ آپکی تعلیم اس لئے زندہ تعلیم ہے۔ کہ اس کے ثمرات اور برکات اس وقت بھی ویسے ہی موجود ہیں۔ جیسے آج سے تیرہ سو سال پیشتر موجود تھے دوسری کوئی تعلیم ہمارے سامنے اس وقت ایسی موجود نہیں ہے۔ جس پر عمل کرنے والا یہ دعویٰ کر سکے کہ اس کے ثمرات اور برکات اور فیوض سے اُسے حصہ دیا گیا ہے۔ اور اس کے سبب سے وہ ایک آیت اللہ ہوگیا ہے۔ لیکن ہم خدا کے فضل و کرم سے قرآن شریف کی تعلیم کے ثمرات اور برکات کا نمونہ اب بھی موجود پاتے ہیں۔ اور ان تمام آثار اور فیوض کو جو نبی کریم کی سچی اتباع سے ملتے ہیں۔ پاتے ہیں۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے اس سلسلہ کو اسی لئے قائم کیا ہے۔ تا وہ اسلام کی سچائی پر زندہ گواہ ہو۔ اور ثابت کر کے دنیا کو دکھادے کہ وہ برکات اور آثار اس وقت بھی رسول اللہ کے کامل اتباع سے ظاہر ہوتے ہیں۔ جو تیرہ سو سال پہلے ظاہر ہوتے تھے۔ چنانچہ فللہ الحمد اب تک اس وقت تک ظاہر ہو چکے ہیں۔ اور ہر قوم اور ہر مذہب کے سرگروہوں کو ہم نے دعوت دی ہے۔ کہ وہ ہمارے مقابلہ میں آکر اپنی صداقت کا نشان دکھائیں۔ مگر ان میں سے ایک بھی مقابلہ پر نہیں آیا۔ جو اپنے مذاہب کی سچائی کا کوئی عملی نمونہ دکھا سکتا۔ ہم خدا تعالیٰ کے کلام کو معجز نما مانتے ہیں۔ اور ہمارا یقین اور دعویٰ ہے کہ کوئی دوسری کتاب اس بارہ میں قرآن شریف کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اور میں علی وجہ البصیرۃ کہتا ہوں۔ کہ قرآن شریف کا کوئی سا امر پیش کیا جائے۔ وہ اپنی جگہ پر ایک نشان اور معجزہ ہے۔ مثال کے طور پر اُس کی تعلیم کو ہی دیکھو۔ تو وہ ایک عظیم الشان معجزہ نظر آتی ہے اور واقع میں یہ معجزہ ہے۔ اور ایسے حکیمانہ نظام اور فطری تقاضوں کے موافق واقع ہوئی ہے۔ کہ کوئی دوسری تعلیم اس کا ہرگز مقابلہ نہیں کر سکتی۔ قرآن شریف کی تعلیم پہلی ساری تعلیموں کی متمم اور مکمل ہے۔ اور پہلوؤں کو چھوڑ کر میں اس وقت صرف ایک پہلو تعلیم کا دکھا کر ثابت کرتا ہوں کہ قرآن شریف کی تعلیم نہایت اعلیٰ درجہ پر واقع ہوئی ہے۔ اور ایک معجزہ ہے۔ مثلاً توریت کی تعلیم احالات

موجودہ کے لحاظ سے کہو یا ضروریات وقت کے مطابق) کا سارا زور قصاص اور بدلہ پر ہے۔ جیسے آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت۔ اور اس کے بالمقابل انجیل کی تعلیم کا سارا زور عفو۔ صبر اور درگذر پر ہے۔ اور اسکی یہانتک تاکید ہے۔ کہ اگر کوئی شخص ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسری بھی اس کی طرف پھیر دی جائے اور اگر کوئی ایک کوس بیگار لے جائے۔ تو اس کے ہمراہ دو کوس چلے جاؤ۔ اور کُرتہ مانگے تو چوغہ بھی دیدو۔ اسی طرح ہر بات میں توریت اور انجیل کی تعلیمات میں یہ بات نظر آئیگی۔ کہ توریت افراط کا پہلو لیتی ہے۔ تو انجیل تفریط کا۔ لیکن قرآن شریف موقع اور محل کے لحاظ سے حکمت اور وسط یعنی میانہ روی کی تعلیم دیتا ہے۔ جہاں دیکھو اور جس بارہ میں قرآن شریف کی تعلیم پر نگاہ ڈالو۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ وہ محل اور موقع کا سبق دیتا ہے۔ گو ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں۔ کہ نفس تعلیم جملہ کتب الٰہیہ کا ایک ہی ہے۔ لیکن اس امر سے کسی کو انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ کہ توریت اور انجیل میں سے ہر ایک نے ایک ایک پہلو پر زور دیا ہے۔ برخلاف اُن کے قرآن شریف نے فطرت انسانی کے تقاضے کے موافق تعلیم دی ہے۔ یہ کہنا کہ چونکہ توریت کی تعلیم افراط کے مقام پر ہے۔ اس لئے وہ خدا کی طرف سے نہیں۔ یہ صحیح نہیں۔ اصل بات یہ ہے۔ کہ اُس وقت کی ضرورتوں کے لحاظ سے ایسی تعلیم بکار تھی۔ اور چونکہ توریت اور انجیل قانون مختص المقام کی مانند تھیں۔ اس لئے ان کی تعلیموں میں دوسرے پہلوؤں کو مدّنظر نہیں رکھا گیا۔ لیکن قرآن شریف چونکہ تمام دنیا اور جملہ بنی نوع انسان کیلئے تھا اسلئے اسکی تعلیم کو ایسے مقام پر رکھا جو فطرت انسانی کے صحیح تقاضوں کے موافق تھی۔ اور یہی اس میں حکمت تھی۔ کیونکہ حکمت کے معنے ہیں۔ وضع الشیئ فی محلہ یعنی کسی چیز کو اُس کے اپنے محل پر رکھنا۔ پس یہ حکمت قرآن شریف نے ہی سکھائی ہے۔

توریت جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے۔ ایک بیجا سختی پر زور دے رہی تھی۔ اور انتقامی قوت کو بڑھاتی تھی۔ مگر انجیل بالمقابل بیہودہ عفو پر زور مارتی تھی۔ اسلئے قرآن شریف نے ان دونوں پہلوؤں کو چھوڑ کر میانہ روی کی حقیقی تعلیم دی۔ کہ جزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا فمن عفیٰ واصلح فاجرہ علی اللہ۔ یعنی بدی کی جزا اُسی قدر بدی ہے۔ لیکن جو شخص معاف کردے اور اس معاف کرنے میں اصلاح مقصود ہو تو اس کا اجر اُس کے رب کے پاس ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۵)۔

اب اس تعلیم پر غور کرو۔ کہ نہ یہ توریت کی طرح محض انتقام پر ہی زور دیتی ہے اور نہ انجیل کی طرح ایسے عفو پر جو بسا اوقات خطرناک نتائج کا موجب ہو سکتا ہے۔ بلکہ قرآن شریف کی تعلیم حکیمانہ نظام اپنے اندر رکھتی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے۔ جیسے مثلاً ہمارا ایک خدمت گار ہے جو بڑا نیک اور شریف چلن رکھتا ہے۔ کبھی اُس نے خیانت نہیں کی۔ اور نہ کبھی نقصان کیا۔ اگر کسی دن وہ ہمیں چائے پلانے کیلئے لے آئے اور اتفاقیہ اُس کے ہاتھ سے پیالیاں گر کر ٹوٹ جائیں تو اس وقت مقتضائے وقت کیا ہوگا۔ کیا یہ کہ اسکو سزا دیں یا معاف کردیں؟ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ایسے شریف خدمتگار کو معاف کر دینا ہی اس کے واسطے کافی سزا ہوگی۔ لیکن برخلاف اس کے ایک شریر خدمتگار ہے جو ہر روز کوئی نہ کوئی نقصان کر چھوڑتا ہے۔ ایسی صورت میں اُسے معاف کر دینا اُسے اور بھی دلیر کرنا ہے۔ اسلئے اس کو سزا دینی ضروری ہوگی۔ لیکن انجیل کی یہ تعلیم نہیں اگر اسکی تعلیم پر عمل کیا جائے تو اس کے معنے یہ ہونگے۔ کہ اگر انگریزی گورنمنٹ سے کوئی سلطنت ہندوستان مانگے۔ تو وہ انگلستان بھی اُس کے حوالے کر دے۔ کیا عملاً انجیل کی تعلیم مانی جا سکتی ہے؟ ہرگز نہیں گورنمنٹ کے سیاست مدن کے اصولوں پر مختلف محکموں کا قیام۔ عدالتوں کا اجرا اور دشمن سے حفاظت کیلئے افواج کا رکھنا وغیرہ جتنے امور ہیں وہ سب انجیل کی تعلیم کے خلاف ہیں۔ اسلئے کہ انجیل کی تعلیم کے موافق کوئی انتظام ہو سکتا ہی نہیں۔

غرض قرآن شریف کی تعلیم جس پہلو اور جس معاملہ میں دیکھو۔ اپنے اندر حکیمانہ پہلو رکھتی ہے۔ افراط اور تفریط سے بالکل پاک ہے اور نقطہ وسط پر قائم ہے۔ اور اسی لئے اس اُمت کا نام امت وسطاً رکھا گیا ہے۔ یہ بات کہ توریت اور انجیل کی تعلیم کیوں اعتدال اور وسط پر واقع نہیں ہوئی۔ اس سے خدا تعالیٰ پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ اور نہ اس تعلیم کو ہم خلاف آئین حکمت کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ حکمت کے معنے ہیں۔ وضع الشیئ فی محلہ۔ اُس وقت کی حکمت کا یہی تقاضا تھا۔ کہ ایسی تعلیم دی جائے۔ اور جیسا کہ ہم نے بتایا ہے۔ کہ سزا کے محل پر سزا دینا بھی حکمت ہے۔ اور عفو کے مقام پر عفو کر دینا حکمت ہے۔ اسی طرح اس وقت انسانی طبائع کی حالت کچھ ایسی ہی واقع ہوئی تھی۔ کہ تعلیم کو ایک پہلو پر رکھنا پڑا۔ بنی اسرائیل چار سو برس تک فرعون کی غلامی میں رہے تھے۔ اور اس وجہ سے ان لوگوں کے عادات اور رسومات کا ان پر بہت بڑا اثر پڑا ہوا تھا۔ اور قاعدہ کی بات ہے کہ بادشاہوں کے اطوار۔ عادات اور آئین ملکداری کا اثر محکوم رعایا پر ضرور پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ رعایا کے مذہب پر بھی اثر جا پڑتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے

الناس علیٰ دین ملوکھم۔ ہمارے ملک میں سکھوں کی عملداری میں عام لوگوں میں بھی یہ اثر پڑا ہوا تھا۔ کہ عموماً لوگ ڈاکہ زن اور دھاڑوی ہو گئے تھے۔ ہری سنگھ وغیرہ برائیں ہی لوٹ لیا کرتا تھا۔ اسی طرح پر فرعونیوں کی غلامی میں رہ کر بنی اسرائیل عدل کو کچھ سمجھتے ہی نہ تھے۔ ان پر چونکہ ہمیشہ ظلم ہوا کرتا تھا۔ اسلئے وہ بھی اعتدا اور ظلم کر بیٹھتے تھے۔ پس ان کی اصلاح کیلئے پہلا مرحلہ یہی ہونا چاہیئے تھا۔ کہ ان کو عدل کی تعلیم دی جاتی۔ اس لئے ان کو یہ تعلیم دی گئی۔ کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت۔ چنانچہ اس تعلیم پر وہ اسقدر پختہ ہو گئے۔ کہ پھر انہوں نے انتقام لینا ہی شریعت کا مغز سمجھ لیا۔ اور یہ مذہب بنا لیا۔ کہ اگر بدلہ نہ لیا جائے تو گنہگار ٹھیرینگے اسلئے جب حضرت عیسیٰؑ تشریف لائے تو انہوں نے دیکھا۔ کہ بنی اسرائیل کی حالت ایسی ہو گئی ہے۔ تو انہوں نے اُن کی سخت مزاجی کو دور کرنے کیلئے حد درجہ کے عفو کی تعلیم پیش کی کیونکہ جس قدر زور کے ساتھ وہ انتقام پر قائم ہو چکے تھے۔ اگر اس سے بڑھ کر عفو کی تعلیم نہ دیجاتی تو وہ مؤثر ثابت نہ ہوتی۔ اسلئے اُن کی ساری تعلیم کا دارومدار عفو پر رہا۔ پس ان وجوہ اور اسباب کے لحاظ سے یہ دونوں تعلیمیں اگرچہ اپنی اپنی جگہ حکمت پر مبنی ہیں۔ لیکن ان کو قانون مختص المقام یا قانون مختص الوقت کی طرح سمجھنا چاہیئے۔ نہ ابدی اور دائمی قانون۔

اللہ تعالیٰ کی حکمتیں اور احکام دو اقسام کے ہوتے ہیں۔ بعض مستقل اور دائمی ہوتے ہیں۔ اور بعض آنی۔ اور وقتی ضرورتوں کے لحاظ سے صادر ہوتے ہیں۔ اگرچہ اپنی جگہ اُن میں بھی ایک استقلال ہوتا ہے۔ تاہم وہ آنی ہی ہوتے ہیں۔ مثلاً سفر میں روزہ اور نماز کے متعلق دیگر احکام ہیں۔ اور قیام کی حالت میں اور عورت جب گھر سے باہر نکلتی ہے۔ تو برقعہ اوڑھ کر نکلتی ہے۔ لیکن گھر کے اندر ایسی ضرورت نہیں پڑتی۔ کہ برقعہ اوڑھے رہے اسی طرح پر توریت اور انجیل کے احکام آنی اور وقتی ضروریات کے مطابق تھے۔ لیکن آنحضرتؐ جو شریعت اور کتاب لے کر آئے۔ وہ مستقل اور ابدی شریعت ہے۔ اسلئے اس کے احکام بالکل کامل اور مکمل ہیں۔ اور وہ قانون مستقل کا حکم رکھتی ہے۔ اگر قرآن شریف نہ بھی آیا ہوتا۔ تب بھی توریت و انجیل منسوخ ہو جاتیں۔ کیونکہ وہ مستقل اور ابدی قوانین نہ تھے۔ بعض نادان یہ اعتراض کر دیتے ہیں۔ کہ ایسا کیوں کیا گیا؟ اور خدا تعالیٰ نے پہلی کتب کو کیوں منسوخ کیا۔ کیا اُسے پورا پورا علم نہ تھا۔ پہلے ہی کیوں نہ مکمل مستقل اور ابدی شریعت بھیجی؟ یہ اعتراض بالکل نادانی پر مبنی ہے کیونکہ یہ کلیہ قاعدہ نہیں ہے۔ کہ ہر نسخ کیلئے علم کا نہ ہونا ضروری ہو اور اگر یہ بات صحیح ہے۔

کہ ہر نسخ میں عدم علم ثابت ہوتا ہے۔ تو پھر اس بات کا کیا جواب ہے۔ کہ جو پارچات ایک چھوٹی عمر کے بچے مثلاً سال دو سال کی عمر والے کو پہنائے جاتے ہیں۔ کیوں وہی پارچات دس پندرہ سال یا بیس پچیس سال کے نوجوان کو نہیں پہنائے جا سکتے۔ کیا یہ ممکن ہے۔ کہ ایک نوجوان آدمی ایک بچہ کا گز نصف گز کا کرتہ پہن سکے۔ یقیناً کوئی سلیم الطبع انسان اس بات سے اتفاق نہیں کریگا۔ بلکہ ایسی حرکت پر ہنسی اُڑائیگا۔ اس مثال سے نہایت صفائی سے معلوم ہوگیا۔ کہ ہر نسخ کے لئے عدم علم کا ثابت ہونا ضروری نہیں۔ جب خود ہمارا جسم ہر وقت معرض تغیر میں ہے۔ تو لازمی بات ہے۔ کہ ہماری ضروریات بھی اس تغیر کے ساتھ ساتھ بدلتی رہیں۔ اور ان تبدیلیوں کے مطابق جو نسخ ہوتا رہتا ہے۔ وہ نہایت حکمت اور علم پر مبنی ہوتا ہے۔ نہ کہ عدم علم پر۔ پس ایسا اعتراض کم فہمی پر مبنی ہے۔ جس طرح ایک نوزائیدہ بچے کے منہ میں روٹی کا ٹکڑا یا گوشت کی بوٹی نہیں دے سکتے اسی طرح پر انسان کی ابتدائی حالت میں شریعت کے وہ اسرار نہیں دیئے جاتے۔ جو انسان کے کمال پر جا کر ملتے ہیں۔ طبیب ایک وقت مریض کو خود مسہل دیتا ہے۔ لیکن دوسرے وقت جب مریض مرض اسہال سے علیل ہو۔ تو اُسے قابض دوائیں دیتا ہے۔ ہر حالت میں وہ ایک ہی نسخہ کیسے رکھ سکتا ہے۔ غرض قرآن شریف ایک حکمت کی کتاب ہے اور مستقل شریعت ہے اور ساری تعلیمات الٰہیہ کا مخزن ہے۔ قرآن شریف کا سب سے پہلا معجزہ اسکی اعلیٰ درجہ کی تعلیم ہے پھر دوسرا معجزہ اسکی پیشگوئیاں ہیں۔ سورہ فاتحہ۔ سورہ تحریم اور سورہ نور میں کتنی عظیم الشان پیشگوئیاں ہیں۔ رسول کریم کی ساری مکی زندگی پیشگوئیوں سے بھری ہوئی ہے۔ ان سب پر اگر خدا ترس دل لے کر ایک دانشمند انسان غور و تدبر کرے۔ تو اس پر واضح ہو جائیگا۔ کہ آنحضرت کو کس قدر غیب کی خبروں پر خدا تعالیٰ سے اطلاع ملی۔ ایسے وقت میں جبکہ ساری کی ساری قوم آپ کی مخالف تھی اور کوئی ہمدرد و رفیق نہ تھا یہ کہنا۔ کہ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ چھوٹی بات ہو سکتی ہے۔ ظاہری اسباب کے لحاظ سے تو یہ فتویٰ دیا جاتا تھا۔ کہ آپکا خاتمہ ہی ہو جائیگا۔ مگر ایسی حالت میں آپ اپنی کامیابی اور دشمنوں کی ذلت اور نامرادی کی پیشگوئیاں کر رہے ہیں۔ اور آخر اُسی طرح وقوع میں آیا جیسا آپ نے فرمایا تھا۔ پھر آپ نے تیرہ سو سال بعد قائم ہونے والے سلسلہ کی اور اُس وقت کے آثار و علامات کی پیشگوئیاں کیسی بے نظیر اور عظیم الشان کی ہیں۔ دنیا کی کسی دوسری آسمانی کتاب کی پیشگوئیاں ذرا پیش تو کرو۔ کیا حضرت مسیح کی پیشگوئیاں ان قرآنی پیشگوئیوں کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ جن میں صرف اتنا ہی لکھا ہے۔ کہ زلزلے آئینگے۔ قحط پڑینگے۔

آندھیاں آئینگی۔ مُرغ بانگ دیگا وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کی معمولی پیشگوئیاں تو ہر ایک شخص کر سکتا ہے اور دنیا میں یہ خواہ مخواہ ہوتے رہتے ہیں۔ پھر ان میں غیب گوئی کی کونسی بات پائی گئی۔ اس کے مقابلہ میں قرآن شریف کی پیشگوئیوں پر نظر کرو۔ الٓمٓ۔ غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِھِمْ سَیَغْلِبُوْنَ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ لِلّٰہِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ وَیَوْمَئِذٍ یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ (ترجمہ) میں اللہ بہت جاننے والا ہوں رومی اپنی سرحدیں اہل فارس سے مغلوب ہو گئے ہیں۔ اور بہت ہی جلد چند سال میں یقیناً غالب ہونے والے ہیں۔ پہلے اور آئندہ آنیوالے واقعات کا علم اور اُن کے اسباب اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ جس دن رومی غالب ہونگے۔ وہی دن ہوگا جب مومن بھی خوشی کرینگے۔ اب غور کرکے دیکھو کہ یہ کیسی حیرت انگیز اور جلیل القدر پیشگوئی ہے۔ اور ایسے وقت میں کیگئی۔ جبکہ مسلمان اپنی ضعف اور کمزوری کی وجہ سے خود خوف اور خطرہ میں تھے۔ نہ ان کے پاس کوئی سامان تھا۔ اور نہ طاقت۔ اور ایسی حالت میں تھے کہ مخالفین اسلام کہتے تھے۔ کہ یہ گروہ بہت جلد نیست و نابود ہو جائے گا۔ فتح کی مدت کی قید بھی اس پیشگوئی میں لگادی اور پھر یومئذ یفرح المومنون کہکر دوہری پیشگوئی بنادی۔ یعنی جس روز رومی فارسیوں پر غالب آئینگے۔ اسی دن مسلمان بھی بامراد ہو کر خوش ہونگے۔ چنانچہ جس طرح پر یہ پیشگوئی کی گئی تھی۔ اُسی طرح پر بدر کے دن یہ پوری ہوگئی۔ ادہر رومی غالب آئے اور ادہر مسلمانوں کو بدر کے مقام پر فتح کامل نصیب ہوئی۔ ایسا ہی سورہ یوسف آیت لِلسَّآئِلِیْنَ کہکر اس سارے قصے کو آنحضرتؐ کیلئے بطور پیشگوئی بیان فرمایا۔ غرض جہاں تک دیکھا جائے۔ قرآن شریف کی پیشگوئیاں بڑے اعلیٰ درجہ پر واقع ہوئی ہیں۔ اور دوسری کوئی کتاب اس رنگ میں ان پیشگوئیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ کیونکہ یہی نہیں کہ قرآن شریف کی پیشگوئیاں آنحضرتؐ کی زندگی میں ہی پوری ہوگئیں۔ بلکہ ان کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ چنانچہ ہمارے اس زمانے میں بھی کئی پیشگوئیاں پوری ہو رہی ہیں۔ اور ابھی بہت سی باقی ہیں جو آئندہ پوری ہونگی۔ منجملہ ان پیشگوئیوں کے جو اس وقت پوری ہوئی ہیں۔ اس سلسلہ کی پیشگوئی ہے۔ جو قرآن شریف کے شروع سے آخر تک چلی گئی ہے۔ چنانچہ سورۃ فاتحہ میں صراط الذین انعمت علیہم کہہ کر مسیح موعود کی پیشگوئی فرمائی۔ اور پھر اسی سورۃ میں مغضوب اور ضالین دو گروہوں کا ذکر کرکے یہ بھی بتادیا۔ کہ جب مسیح موعود آئیگا تو اس وقت ایک قوم مخالفت کرنے والی ہوگی۔ اور ضالین میں یہ اشارہ کیا کہ وہ قتل دجال اور کسر صلیب کیلئے آئیگا۔ کیونکہ مغضوب سے یہود اور ضالین سے بالاتفاق نصاریٰ

مراد ہیں۔ اور آخر قرآن شریف میں بھی شیطان کا ذکر فرمایا۔ جو اصل دجّال ہے۔ اور ایسا ہی سورہ نور کی آیت استخلاف میں مسیح موعود یا خاتم الخلفا کی پیشگوئی کی اسی طرح سورہ تحریم میں صراحت کے ساتھ ظاہر کر دیا۔ کہ اس اُمّت میں بھی ایک مسیح آنے والا ہے۔ کیونکہ جب مومنوں کی مثال مریم کی سی ہے تو اس اُمّت میں سے کم از کم ایک شخص تو ایسا ہو۔ جو مریم صفت ہو۔ اور مریم میں نفخ روح ہو کر مسیح پیدا ہُوا۔ گویا مریمی صفت والے مومن میں جب نفخ روح ہوا۔ تو وہ خود ہی مسیح بن گیا (الحکم جلد ۱۰ ۱۶) ان پیشگوئیوں کا ظہور جو اس سلسلہ کی صُورت میں ہُوا ہے۔ کیا یہ چھوٹی سی بات ہے؟ نہیں بلکہ اس سلسلہ کا موجود ہونا ایک بڑی پیشگوئی کا پورا ہونا ہے جو آنحضرتؐ نے تیرہ سو سال پہلے کی تھی اس قدر مدت دراز پہلے خبر دیدینا یہ قیافہ شناسی اور اٹکل بازی نہیں ہو سکتی۔ اور پھر یہ پیشگوئی اکیلی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ہزاروں وہ آیات و نشانات ہیں۔ جو موجودہ زمانے کیلئے پہلے ہی سے بتا دیئے گئے تھے۔ اور علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ خود ہمارے ہاتھ پر ہزاروں نشانات کا سلسلہ جاری کر دیا چنانچہ ہماری کئی سو پیشگوئیاں پوری ہو چکی ہیں۔ جو قبل از وقت ملک میں شائع کی گئی تھیں۔ اور اپنے اپنے وقت پر سچی نکلیں۔ جنہیں ہمارے اکثر مخالف بھی جانتے ہیں۔ کیا یہ قرآن کریم کا معجزہ اور اس کی پاک تعلیم کا نتیجہ اور اثر نہیں ہے؟ اور کیا یہ آنحضرتؐ کی قوت قدسی اور تاثیر انفاس کے ثمرات نہیں؟ ماننا پڑیگا کہ یہ سب کچھ آپؐ ہی کی طفیل ہے۔ کیونکہ یہ مسلمہ بات ہے۔ ؎

خارقے کز ولی مسموع است　　معجزۂ آں نبیؐ متبوع است

اسلئے جس قدر نشانات اور آیات ہمارے ہاتھ سے ظاہر ہو رہی ہیں۔ یہ دراصل آنحضرتؐ کے ہی خوارق اور معجزات اور قرآن شریف کی ہی پیشگوئیاں ہیں۔ کیونکہ یہ سب کچھ آنحضرتؐ کے اتباع اور قرآن کریم کی تعلیم کے ثمرات ہیں۔ اور اس وقت دوسرا کوئی مذہب نہیں۔ جس کا کوئی پیرو اور متبع یہ دعویٰ کر سکے۔ کہ وہ پیشگوئیاں کر سکتا ہے۔ یا اس سے خوارق کا ظہور ہوتا ہے۔ اس لئے اس پہلو سے قرآن شریف کا معجزہ تمام دیگر کتب کے اعجاز سے بڑھا ہُوا ہے۔

پھر قرآن شریف کی بے نظیری کا دوسرا پہلو فصاحت اور بلاغت کا ہے۔ اور فصاحت و بلاغت ایسے اعلیٰ درجہ پر اور ایک مسلم امر ہے۔ کہ انصاف پسند دشمن بھی اس کے قائل ہیں۔ تیرہ سو سال گذرے قرآن شریف نے فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ کا دعویٰ کیا۔ لیکن یہ آجتک کسی مخالف سے ممکن نہیں ہُوا۔ کہ اس کی مثل لا سکے۔ عرب میں جو بڑے بڑے فصحا اور بلغا تھے اور خاص خاص مواقع پر بڑے بڑے مجمع کرتے اور اُن میں اپنے قصائد سنایا کرتے تھے۔ وہ

بھی اس کا مقابل لانے سے عاجز رہ گئے۔ قرآن شریف کی فصاحت و بلاغت ایسی نہیں ہے۔ کہ اس میں صرف الفاظ کا ہی تتبع کیا ہے۔ اور معانی اور مطالب کی پرواہ نہیں کی۔ نہیں بلکہ جیسا اعلیٰ درجہ کے الفاظ نہایت عمدہ ترتیب کے ساتھ رکھے ہوئے ہیں۔ ویسا ہی اُن میں اعلیٰ درجہ کے حقائق و معارف کو بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ بات انسان کے اختیار سے باہر ہے۔ کہ وہ حقائق و معارف بھی بیان کرے۔ اور پھر فصاحت و بلاغت الفاظ کے مراتب کو بھی ملحوظ رکھے۔ ایک جگہ قرآن شریف کے بارہ میں فرمایا۔ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ۔ یعنی اُن پر ایسے صحائف پڑھتا ہے۔ کہ جن میں حقائق و معارف ہیں۔ انشاء پرداز جانتے ہیں۔ کہ انشاء پردازی میں پاکیزہ تعلیم اور اخلاق فاضلہ کو ملحوظ رکھنا بہت ہی مشکل ہے۔ اور پھر ایسی مؤثر اور جاذب تعلیم دینا جو صفات رذیلہ کو دور کر کے دکھا بھی دے۔ اور اُن کی جگہ اعلیٰ درجہ کی خوبیاں پیدا کر دے نزول قرآن کے وقت عربوں کی جو حالت تھی۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ وہ لوگ سارے عیوب اور برائیوں کا مجموعہ بنے ہوئے تھے۔ اور صدہا سال سے اُنکی حالت بگڑی ہوئی تھی۔ لیکن آنحضرتؐ کے فیوض و برکات میں کتنی قوت تھی۔ کہ تیئیس ۲۳ سال کی قلیل مدت میں کل ملک کی کایا پلٹ دی۔ یہ تعلیم قرآن کا ہی اثر تھا۔ اگر قرآن شریف کی ایک چھوٹی سی چھوٹی سورۃ بھی لیکر دیکھی جائے۔ تو معلوم ہو جائیگا۔ کہ اس میں علاوہ فصاحت و بلاغت کے مراتب کے تعلیم کی ذاتی خوبیاں اور کمالات بھی بھرے پڑے ہیں۔ مثلاً سورۃ اخلاص کو ہی دیکھو۔ جس میں توحید کے کل مراتب کو بیان فرمایا ہوا ہے۔ اور ہر قسم کے شرکوں کی تردید کی ہوئی ہے۔ اسی طرح سورۃ فاتحہ کو دیکھو۔ کہ کس قدر اس میں اعجاز بھرا پڑا ہے۔ چھوٹی سی سورۃ ہے۔ جس میں کُل سات آیات ہیں۔ لیکن دراصل یہ سورۃ سارے قرآن شریف کا خلاصہ اور نچوڑ اور فہرست ہے۔ اس میں جہاں خدا تعالیٰ کی ہستی۔ اسکے صفات۔ دعا کی ضرورت۔ اسکی قبولیت کے اسباب اور ذرائع۔ مفید اور سودمند دعاؤں کا طریق۔ نقصان رساں راہوں سے بچنے کی ہدایت۔ سکھائی ہے۔ وہاں دنیا کے کل مذاہب باطلہ کا رد بھی اسی میں موجود ہے۔

تم اکثر کتب اور اہل مذاہب کو دیکھو گے۔ کہ وہ دیگر مذاہب کی برائیاں اور نقص بیان کرتے اور اُن پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ لیکن ایسا کرتے ہوئے اُن میں سے کوئی بھی یہ نہیں کرتا۔ کہ اُن کے مقابل اپنی طرف سے کوئی عمدہ اور اُن سے بہتر تعلیم بھی پیش کرے۔ اور یہ دکھائے۔ کہ اگر وہ فلاں بُری بات سے بچانا چاہتا ہے۔ تو اسکی بجائے فلاں اچھی اور بہتر تعلیم پیش کرتا ہے یہ فخر صرف قرآن شریف کو ہی ہے۔ کہ وہ جہاں دیگر مذاہب باطلہ کا رد کرتا ہے۔ اور ان کی غلط تعلیمات کا

پردہ فاش کرتا ہے۔ وہیں اپنی سچی اور بہتر تعلیم کو پیش بھی کر دیتا ہے۔ جس کا مختصر نمونہ سورۃ فاتحہ میں موجود ہے۔ جس کے ایک ایک لفظ میں مذاہب باطلہ کی تردید کر دی ہے۔ مثلاً فرمایا:۔ الحمد للہ ساری تعریفیں خواہ وہ کسی قسم کی ہوں۔ اللہ تعالیٰ کیلئے ہی سزاوار ہیں۔ گویا یہ لفظ بیان فرما کر یہ ثابت کیا۔ کہ قرآن شریف جس خدا کو منوانا چاہتا ہے۔ وہ تمام نقائص سے منزہ اور تمام صفات کاملہ سے متصف ہے۔ کیونکہ عربی زبان میں اللہ کا لفظ اُسی ہستی پر بولا جاتا ہے۔ جس میں کسی قسم کا کوئی نقص نہ ہو۔ اور کمال دو قسم کے ہوتے ہیں۔ یا بلحاظ حُسن کے اور یا بلحاظ احسان کے۔ پس ہر دو اقسام کے کمال اس لفظ میں موجود ہیں۔ دیگر مذاہب نے جو نام خدا تعالیٰ کیلئے تجویز کئے ہیں۔ وہ ایسے جامع نہیں ہیں۔ پھر یہی لفظ اللہ کا دیگر مذاہب باطلہ کے معبودوں کی ہستی اور ان کی صفات کے مسئلہ کی پوری پوری تردید کرتا ہے۔ مثال کے طور پر عیسائی مذہب کو لو۔ جس خدا کو وہ منواتا ہے۔ وہ ایک عاجز ضعیف عورت کا بچہ تھا۔ جس کا نام یسوع تھا۔ جو معمولی انسانی بچوں کی طرح دُکھ درد کے ساتھ اپنی ماں کے پیٹ سے نکلا۔ عوارض انسانی میں مبتلا رہا۔ بھوک پیاس کی تکلیف اُٹھائی۔ اور سخت تکالیف اور دُکھ برداشت کئے۔ انسان میں جس قدر ضعف اور کمزوریاں ہوتی ہیں وہ اُن سب کا شکار رہا۔ اور آخر کار یہودیوں کے ہاتھ سے پیٹا گیا۔ جنہوں نے اُسے پکڑوا کر صلیب پر چڑھوا دیا۔ اب عیسائیوں کے خدا کی اس صورت کو جو انجیل مروجہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ کسی دانشمند کے سامنے پیش کرو۔ تو کیا وہ اس بات کو تسلیم کر سکتا ہے۔ کہ ایسا کمزور خدا تمام صفاتِ کاملہ سے متصف ہے۔ اور اس میں کوئی نقص نہیں؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ اُسے تسلیم کرنا پڑیگا۔ کہ ایسا خدا انسانی کمزوریوں اور نقصوں کا مکمل نمونہ ہے۔ پس الحمد للہ کہنے والا کب ایسے کمزور مصلوب اور ملعون خدا کو قبول کر سکتا ہے۔ عیسائیت کے مقابل اسلام ایسے خدا کی طرف بُلاتا ہے۔ جس میں کسی قسم کا کوئی نقص ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر آریہ مذہب کو دیکھو۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ اُن کے ایشور نے ذرات عالم اور ارواح عالم کو بنایا ہی نہیں بلکہ جس طرح وہ خود ازلی ابدی ہے۔ ویسے ہی اُس کے مقابل ذرات و ارواح ایک مستقل ہستی رکھنے والی اشیاء ہیں۔ جو اپنے قیام اور بقا کے لئے خدا کی کسی قسم کی محتاج نہیں ہیں۔ بلکہ ایک طرح خدا اپنی خدائی کو چلانے کیلئے ان اشیاء کا محتاج ہے۔ وہ کسی چیز کا خالق نہیں۔ پھر جب کسی چیز کا خالق نہیں۔ تو یہ سمجھ لینا کچھ دشوار نہیں کہ جب وہ کسی چیز کا خالق نہیں۔ تو ان کا مالک کیسے ہو سکتا ہے۔ ایسا ہی آریوں کا اعتقاد ہے

کہ وہ رازق۔ کریم وغیرہ کچھ بھی نہیں۔ کیونکہ انسان کو جو کچھ اس دنیا میں ملتا ہے۔ وہ اس کے اپنے اعمال کا پھل ہے۔ اور اس سے زیادہ اسے کچھ مل ہی نہیں سکتا۔ اب غور کرو کہ جس خدا میں اس قدر نقائص پیش کئے جاویں کیا عقل سلیم ایسے خدا کو تسلیم کرنے پر رضامند ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ اسی طرح سے جتنے بھی مذاہب باطلہ دنیا میں موجود ہیں الحمد للہ کا جملہ اللہ تعالیٰ کے متعلق اُن کے کل غلط اور بیہودہ خیالات و معتقدات کی تردید کرتا ہے۔

پھر اس کے بعد رب العٰلمین کا لفظ ہے۔ اور جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے۔ اللہ وہ ذات جمیع صفات کاملہ ہے۔ جو تمام نقائص سے منزّہ اور حُسن اور احسان کے اعلیٰ نکتہ پر پہنچا ہوا ہو۔ تاکہ اُس بے مثل اور بے مانند ذات کی طرف لوگ کھنچے جائیں۔ اور روح کے جوش اور کشش سے اُس کی عبادت کریں۔ اس لئے پہلی خوبی احسان کی صفت رب العالمین کے اظہار سے ظاہر فرمائی ہے۔ یعنی جس اللہ کے ذریعہ سے کل مخلوقات فیض ربوبیت سے فائدہ حاصل کر رہی ہے۔ لیکن اس کے مقابل دیگر مذاہب نے جو اس وقت دنیا میں موجود ہیں۔ اس صفت کا بھی انکار کر دیا ہے۔ مثلاً آریہ جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا ہے یہ اعتقاد رکھتے ہیں۔ کہ انسان کو جو کچھ مل رہا ہے۔ وہ سب اُس کے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ ہے۔ اور خدا کی ربوبیت سے وہ ہرگز بہرہ ور نہیں ہے۔ کیونکہ جب وہ خدا کو اپنی ارواح کا خالق ہی نہیں مانتے اور اُنہیں اپنے بقا و قیام میں خدا کا بالکل غیر محتاج سمجھتے ہیں۔ تو انہیں اس کی صفت ربوبیت کا بھی انکار کرنا پڑا۔ اسی طرح عیسائی بھی اس صفت ربوبیت کے منکر ہیں۔ کیونکہ وہ یسوع مسیح کو اپنا رب سمجھتے ہیں۔ اور ربنا المسیح ربنا المسیح پکارتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کو جمیع مافی العالم کا رب نہیں مانتے بلکہ مسیح کو اس کے فیض ربوبیت سے باہر قرار دیتے اور خود اسی کو رب مانتے ہیں۔ ایسا ہی ہندو بھی اس صداقت سے منکر ہیں۔ کیونکہ وہ ہر ایک چیز کو اپنا رب جانتے اور اُسکی پوجا کرتے ہیں۔ برہمسماج والے بھی خدا تعالیٰ کی ربوبیت تامہ کے منکر ہیں۔ کیونکہ وہ یہ اعتقاد رکھتے ہیں۔ کہ خدا تعالیٰ نے جو کچھ کرنا تھا۔ وہ سب یکبارہی کر دیا۔ اور جملہ عالم اور اس کی قوتیں جو ایک دفعہ پیدا ہو چکی ہیں۔ وہ مستقل طور پر اپنے کام میں لگی ہوئی ہیں۔ خدا تعالیٰ اُن میں کسی قسم کا تصرّف نہیں کر سکتا۔ اور نہ اُن میں کوئی تغیّر و تبدل واقع ہو سکتا ہے۔ گویا ان کے نزدیک خدا تعالیٰ اب محض معطل ہے۔ غرض جہاں تک دیگر مذاہب پر غور کیا جائے اور اُن کے اعتقادات کی جانچ پڑتال کی جائے۔ تو صاف طور پر معلوم ہو جائیگا۔ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رب العالمین ہونے کے قائل

نہیں ہیں۔ یہ خوبی جو نہایت اعلیٰ درجہ کی خوبی ہے اور جس کا مشاہدہ انسان کو ہر آن ہو رہا ہے صرف اسلام ہی بتاتا ہے۔ اور اس طرح پر صرف اسی ایک لفظ کے ساتھ تمام قسم کے بیہودہ اور غلط اعتقادات کی بیخکنی کرتا ہے۔ جو اس صفت کے خلاف دوسرے مذاہب والوں نے بنالئے ہیں۔

پھر قرآن شریف نے اللہ تعالیٰ کی صفت الرحمٰن بیان فرمائی ہے اور اس صفت کا تقاضا یہ ہے۔ کہ وہ انسانوں کی فطری خواہشوں کو بغیر اُسکی دُعا یا التجا کے اور بدوں کسی عامل کے عمل کے خود بخود عطا فرماتا ہے۔ مثلاً جونہی کہ انسان پیدا ہوتا ہے۔ تو اس کے قیام و بقا کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ پہلے سے ہی موجود ہوتی ہیں۔ انسان پیدا پیچھے ہوتا ہے۔ لیکن اسکی ماں کی چھاتیوں میں اُسکے لئے دودھ پہلے اُترآتا ہے۔ آسمان۔ زمین۔ چاند۔ سورج۔ ستارے ہوا۔ پانی وغیرہ جملہ اشیا جو خدا تعالیٰ نے انسان کے فائدے کیلئے بنائی ہیں۔ یہ سب اسکی صفت رحمانیت کے تقاضے سے ہیں۔ اس کے خلاف دیگر مذاہب والے یہ نہیں مانتے۔ کہ خدا تعالیٰ بلا مبادلہ بھی فضل کرسکتا ہے۔ آریہ تو سرے سے اس مسئلہ کو مانتے ہی نہیں۔ جیسا کہ رب العالمین کے معانی میں بیان ہو چکا ہے۔ عیسائیوں نے بھی کفارہ کا مسئلہ ثابت کرنے کیلئے یہ اعتقاد بنا رکھا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ رحم بلا مبادلہ نہیں کرسکتا۔ آریوں سے دریافت طلب یہ امر ہے۔ کہ یہ زمین آسمان۔ چاند۔ سورج۔ ہوا۔ پانی وغیرہ اشیاء انسان کے کونسے گذشتہ اعمال کا پھل ہیں۔ (الحکم جلد ۷ ۱۷)۔

پھر اللہ تعالیٰ کی صفت رحیم بیان کی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی اس صفت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ انسان کی محنت اور کوشش کو ضائع نہیں کرتا۔ بلکہ اُن پر ثمرات اور نتائج مرتب کرتا ہے۔ اگر ایک انسان کو یہ یقین ہی نہ ہو۔ کہ اس کی کوشش اور محنت کوئی پھل لائیگی۔ تو پھر وہ سست اور نکما ہو جائے گا۔ خدا تعالیٰ کی یہ صفت انسان کی امیدوں کو وسیع کرتی اور نیکیوں کے کرنیکی طرف جوش سے لی جاتی ہے۔ اور یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ قرآن شریف کی اصطلاح میں خدا تعالیٰ اس وقت رحیم کہلاتا ہے۔ جبکہ لوگوں کی دُعا۔ تضرع اور اعمال صالح کو قبول فرما کر آفات اور بلاؤں اور تضیع اعمال سے اُن کو محفوظ رکھتا ہے۔ رحمانیت تو عام تھی۔ لیکن رحیمیت خاص انسانوں سے تعلق رکھتی ہے۔ کیونکہ انسان کے سوا دیگر مخلوق میں دُعا۔ تضرع اور اعمال صالح کا ملکہ اور قوت نہیں ہے۔ رحمانیت اور رحیمیت میں یہی فرق ہے۔ کہ رحمانیت دعا کو نہیں چاہتی۔ لیکن رحیمیت دعا کو چاہتی ہے۔ اور یہ انسان کیلئے ایک خلعت خاصہ ہے۔ اور اگر انسان انسان

ہو کر اس صفت سے فائدہ نہ اُٹھائے۔ تو ایسا انسان حیوانات بلکہ جمادات کے برابر ہے۔ خدا تعالیٰ کی یہ صفت بھی تمام مذاہب باطلہ کے رد کیلئے کافی ہے۔ کیونکہ بعض مذاہب اباحت کی طرف مائل ہیں۔ اور وہ یہ مانتے ہیں۔ کہ دنیا میں ترقیات نہیں ہوتی ہیں۔ آریہ مذہب جب کہ اس صفتِ خداوندی کے فیضان سے منکر ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ کا کب قائل کہا جا سکتا ہے۔ سید احمد خانصاحب مرحوم نے بھی دُعا کا انکار کیا ہے۔ اور اس طرح پر وہ فیض جو دعا کے ذریعہ سے انسان کو ملتا ہے۔ اس سے اُسے محروم رکھا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ کی چوتھی صفت مالك یوم الدین بیان فرمائی ہے۔ اور جو لوگ قیامت کے منکر ہیں۔ اس میں اُن کا رد موجود ہے۔ جسکی مزید تفصیل قرآن شریف میں بہت جگہ آئی ہے اللہ تعالیٰ کی اس صفت اور صفت رحیمیت میں یہ فرق ہے۔ کہ رحیمیت میں دعا اور عبادت کے ذریعہ سے کامیابی کی راہ پیدا ہوتی ہے۔ جس پر ایک حق ہوتا ہے۔ لیکن صفت مالک یوم الدین اُس حق پر ثمرہ عطا کرتی ہے۔ بعد اس کے فقرہ اِیَّاكَ نَعْبُدُ تمام باطل معبودوں کی تردید کرتا ہے۔ اور جملہ مشرکین کا رد اس میں موجود ہے۔ کیونکہ اس سورہ میں پہلے اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ کا بیان فرمایا ہے۔ اور اس کے بعد اُن صفاتِ کاملہ رکھنے والے خدا کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ ایاك نعبد یعنی اے صفاتِ کاملہ رکھنے والے خدا جو رب العالمین۔ رحمٰن۔ رحیم اور مالکِ یوم الدین ہے۔ ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ یہ ہر چہار صفات جو اُمّ الصفات کہلاتی ہیں۔ معبودانِ باطلہ میں کہاں پائی جاتی ہیں۔ کیا وہ لوگ جو پتھروں درختوں و حیوانات وغیرہ دیگر اشیاء کی پرستش کرتے ہیں اپنے ان معبودوں میں ان صفات کو ثابت کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔

اسی طرح ایاك نستعین میں ان لوگوں کا رد ہے۔ جو دُعا اور اس کی قبولیت کے منکر ہیں۔

پھر اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم میں آجکل کے موجودہ لوگوں کا رد ہے۔ جو یہ مانتے ہیں۔ کہ جملہ قسم کے روحانی فیوض اور برکات ختم ہو گئے ہوئے ہیں۔ اور کسی موسن کی محنت اور مجاہدہ کوئی مفید نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا۔ اور نہ کسی مسلمان کو اُن برکات اور ثمرات سے حصہ مل سکتا ہے۔ جن سے گذشتہ منعم علیہ گروہ کو ملتا تھا۔ یہ لوگ گویا اب قرآن کے فیوض کو بالکل بے اثر مانتے ہیں۔ اور آنحضرتؐ کی تاثیرات قدسیہ کے قائل نہیں۔ کیونکہ اگر اب ایک بھی آدمی اس قسم کا نہیں ہو سکتا۔ جو منعم علیہ گروہ کے رنگ سے رنگین ہو سکے۔

تو پھر اس دعا کے مانگنے کا فائدہ کیا ہوا؟ لیکن ایسا ہرگز نہیں یہ ان لوگوں کی غلطی بلکہ سخت غلطی ہے۔ جو ایسا یقین کر بیٹھتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کے فیوض اور برکات کا دروازہ اب بھی اسی طرح کھلا ہے۔ جس طرح گذشتہ زمانوں میں کھلا تھا۔ لیکن وہ جملہ فیوض اور برکات محض آنحضرتؐ کے اتباع سے ملتے ہیں۔ اور اگر کوئی شخص آنحضرتؐ کے اتباع کے بغیر یہ دعویٰ کرے۔ کہ وہ روحانی برکات اور سماوی انوار سے حصہ پاتا ہے۔ تو ایسا شخص جھوٹا اور کذاب ہے۔ سید عبدالقادر صاحب جیلانیؒ کی چند عبارات ایسی تھیں۔ جو قرآن کے رنگ کی تھیں۔ مولوی عبدالحی صاحب جنہوں نے اتباع سنت کیا ہے اور مجھے اُن سے بہت محبت ہے۔ اُن کا مذہب توحید کا تھا۔ اور وہ بدعات و محدثات سے ہمیشہ الگ رہتے تھے۔ وہ اُن عبارات کے متعلق فرماتے ہیں۔ کہ اگر یہ قرآن کے موافق ہیں۔ تو معترض کو اس کا کیا جواب دیا جائے۔ کہ یہ کیوں قرآن کی مثل ہیں؟ اس پر آپ فرماتے ہیں۔ کہ ولیوں کی کرامات اور خوارق انبیاؑ کے معجزات ہی کی طرح ہوتے ہیں۔ اسلئے یہ فی الحقیقت قرآن مجید کا ہی معجزہ کہلائیگا۔ اور اصل بات بھی یہی ہے۔ کہ سنت کی کامل اتباع کے بعد جو خوارق ملتے ہیں وہ فی الحقیقت آنحضرتؐ اور قرآن کریم کے ہی خوارق ہیں۔ اور اگر اب ان خوارق اور معجزات کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ تو پھر معاذ اللہ آنحضرتؐ کی بڑی بھاری ہتک ہوگی۔ کہ آپ کی کامل پیروی کسی کو روحانی کمالات نہیں بخش سکتی۔

یہ جو اللہ تعالیٰ نے حضرت نبی کریم کے بارے میں فرمایا۔ انا اعطیناک الکوثر۔ یہ آیت اُس وقت نازل ہوئی تھی۔ جب کہ ایک کافر نے آپ کی نسبت کہا۔ کہ آپ کی اولاد نرینہ نہیں ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ اس نے ابتر کا لفظ آپکی نسبت استعمال کیا تھا۔ جس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ان شانئک ھو الابتر۔ تیرا دشمن ہی ابتر و بے اولاد ہے اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ کہ آپ کے پیرو جو روحانی طور پر ہمیشہ ہوتے رہینگے وہ آپ کی اولاد ہونگے۔ کیونکہ وہ آپ کے علوم و برکات کے وارث اور اُن سے حصہ پانے والے ہونگے۔ ان آیات کو آیت ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین کے ساتھ ملا کر پڑھو۔ تو اصل حقیقت معلوم ہو جاتی ہے۔ اگر حضرت نبی کریم کی روحانی اولاد بھی نہ ہوتی تھی تو پھر معاذ اللہ آنحضرتؐ ابتر ٹھہرتے ہیں۔ حالانکہ اس آیت میں خدا تعالیٰ نے آپ کے اعدا کو ابتر فرمایا ہے

انا اعطیناک الکوثر سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپؐ کو روحانی اولاد بکثرت دی گئی ہے۔ اور اگر ہم یہ اعتقاد نہ رکھیں کہ آپؐ کی روحانی اولاد کثرت سے ہوئی ہے۔ تو پیشگوئی مندرجہ آیت بالا سے منکر ٹھیرینگے۔ اسلئے ایک سچے مسلمان کیلئے یہ ماننے کے سوا چارہ نہیں ہے اور اُسے ماننا پڑیگا۔ کہ آنحضرت کی تاثیرات قدسی ابدالاباد کیلئے ویسی ہی ہیں۔ جیسی کہ تیرہ سو سال قبل تھیں۔ چنانچہ ان تاثیرات کے ثبوت کیلئے ہی اللہ تعالیٰ نے یہ سلسلہ قائم کیا ہے۔ اور اس وقت اسی قسم کی برکات و آیات ظاہر ہو رہی ہیں۔ جو آپ کے وقت میں ظاہر ہوئی تھیں۔ سچی بات یہی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے دعا اھدنا الصراط المستقیم نہ سکھائی ہوتی۔ تو وہ لوگ جو اپنے نفس کی تکمیل چاہتے ہیں۔ مر ہی جاتے۔

لاہور میں ایک مولوی عبدالحکیم صاحب سے میرا مباحثہ ہوا۔ تو میں نے اس کے سامنے یہی پیش کیا تھا کہ تم اللہ تعالیٰ کے مکالمات سے کیوں ناراض ہوتے ہو۔ حضرت عمرؓ بھی بھی تو محدث تھے۔ اس پر اُس نے صاف طور پر انکار کر دیا۔ اور کہا کہ آنحضرتؐ نے فرضی طور پر کہا تھا۔ حضرت عمرؓ فی الحقیقت محدث نہ تھے اور یہ محال ہے کہ آئندہ کسی کو الہام ہو۔ آجکل کے علما کو اس بات پر بالکل ایمان نہیں ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی پیارے بندے سے مکالمات کر سکتا ہے اور یہ لوگ ہمیشہ کیلئے مکالمات کا دروازہ بند کئے بیٹھے ہیں اور خدا تعالیٰ کو اُنہوں نے گونگا خدا مان لیا ہے جو کبھی تکلم نہیں کرتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ قرآن شریف میں جو یہ آیا ہے لھم البشریٰ فی الحیوٰۃ الدنیا ان لوگوں کے نزدیک اس کا کیا مطلب ہے؟ جب ملائکہ ایسے مومنوں پر نازل ہوتے ہیں اور ان کو بشارتیں دیتے ہیں۔ تو وہ بشارات کس کی طرف سے دیتے ہیں۔ یہ اعتقاد رکھ کر اُنہیں قرآن شریف کا بھی انکار کرنا پڑیگا۔ کیونکہ سارا قرآن شریف انہی باتوں سے بھرا پڑا ہے کہ خدا تعالیٰ نیک بندوں کو شرف مکالمہ عطا کرتا ہے۔ اگر یہ شرف کسی کو ملتا ہی نہیں۔ تو پھر قرآن شریف کی تاثیرات کا ثبوت کہاں سے ملیگا؟ اگر آفتاب ہی دھندلا اور تاریک ہو۔ تو ایسی روشنی میں سیاہ اور سپید کی کوئی کس طرح تمیز کر سکیگا؟ اور کیا ایسی صورت میں وہ یہ کہکر فخر کریگا۔ کہ اس میں روشنی نہیں بلکہ تاریکی ہے۔ (الحکم جلد ۱ ع ۱۹)

اس طرح پر قرآن شریف کی تاثیرات اور آنحضرت کی قوت قدسی کی برکات کے بارے میں یہ اعتقاد رکھنا کہ وہ ایک خاص زمانہ اور خاص اشخاص کے لئے ہی مخصوص

تھے ۔ اور آئندہ کیلئے ان سب کا سلسلہ بند ہوگیا ہے ۔ آنحضرتؐ اور قرآن مجید کی سخت بے ادبی و توہین ہے ۔ اور نہ صرف یہی بلکہ خود اللہ تعالیٰ کی پاک ذات پر اعتراض کرتا ہے خوب یاد رکھو ۔ کہ انبیاء کا وجود دنیا میں اس لئے نہیں آیا کرتا ۔ کہ وہ محض ریاکاری اور نمود کے طور پر ہی ہو اور اگر اُن سے آئندہ کے لئے کوئی فیض جاری نہیں ہوتا اور مخلوقِ خدا کو کوئی روحانی فائدہ نہیں پہنچتا ۔ تو پھر یہی ماننا پڑیگا ۔ کہ وہ محض نمائش کے طور پر ہیں ۔ اور معاذ اللہ ان کا وجود و عدم وجود برابر ہے ۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے ۔ بلکہ انبیاء دنیا کیلئے بہت سی برکات اور فیوض کا باعث ہوا کرتے ہیں ۔ اور ان سے ایک چشمہ خیر جاری ہوتا ہے اور جس طرح پر آفتاب سے ساری دنیا فائدہ حاصل کرتی ہے اور اس کا فائدہ کسی خاص حد پر جا کر منقطع نہیں ہو جاتا ۔ بلکہ ہمیشہ کیلئے جاری رہتا ہے ۔ اسی طرح پر آنحضرتؐ کے فیوض و برکات کا آفتاب ہمیشہ کیلئے چمکتا رہتا ہے ۔ اور سعادتمندوں کو فائدہ پہنچاتا رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے ۔ قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ۔ یعنی ان کو کہدو ۔ کہ اگر تم چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے محبوب بن جاؤ ۔ تو میری اطاعت کرو ۔ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کریگا ۔ گویا آپ کی سچی اطاعت اور اتباع انسان کو اللہ تعالیٰ کا محبوب بنا دیتی ہے ۔ اور گناہوں کی بخشش کا ذریعہ ہوتی ہے ۔ پس جبکہ آپکی اتباع کامل اللہ تعالیٰ کا محبوب بنا دیتی ہے ۔ تو پھر کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ ایک محبوب اپنے محب سے کلام نہ کرے اگر یہ مان لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ ایک شخص کو باوجود اپنا محبوب بنا لینے کے پھر بھی اس سے کلام نہیں کرتا ۔ تو گویا وہ معاذ اللہ اکم ہے حالانکہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے معبودانِ باطل کیلئے یہ نقص بیان فرمایا ہے کہ وہ اپنے پرستاروں کے ساتھ کلام نہیں کرتے ۔ لیکن ہم اس بات کے ثابت کرنے کیلئے ہر وقت تیار ہیں ۔ کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب اور پیارے بندوں کے ساتھ کلام کیا کرتا ہے ۔ اور اسی غرض کیلئے اس نے اس سلسلہ کو قائم کیا ہے کہ جہاں آنحضرتؐ کی سچی اتباع کے آثار و ثمرات ہر وقت پائے جاتے ہیں ۔ اس وقت بھی وہ خدا جو ہمیشہ سے ناطق خدا ہے ۔ اپنا لذیذ کلام دنیا کی ہدایت کیلئے بھیجا کرتا ہے ۔ اور قرآن شریف کے اعجاز کا ثبوت اس وقت بھی دے رہا ہے ۔ اور یہ قرآن شریف ہی کا معجزہ ہے کہ جو ہم تحدی کر رہے ہیں ۔ کہ ہمارے بالمقابل قرآن شریف کے حقائق و معارف ہمارے مخالف عربی زبان میں لکھیں ۔ لیکن کسی کو اتنی جرأت و قدرت نہیں ہوتی ۔ کہ ہمارے مقابلہ کیلئے میدان میں

نکل سکے ہمارا مقابلہ دراصل آنحضرتؐ کا مقابلہ ہے۔ کیونکہ واٰخرین منھم لما یلحقوا بھم جو فرمایا گیا ہے۔ اس وقت جو تعلیم الکتاب والحکمۃ دی جارہی ہے۔ اور ایک قوم کو اس وقت بھی اللہ تعالیٰ صحابہؓ کی مانند بنانا چاہتا ہے۔ اس کی اصلی غرض یہی ہے۔ کہ تا قرآن شریف کا معجزہ ثابت ہو۔ ماحصل یہ ہے کہ قرآن شریف ایک ایسا معجزہ ہے کہ نہ اس سے قبل اس کی مثل کوئی ہوا اور نہ آئندہ کبھی ہوگا۔ اور اس کے فیوض و برکات کا چشمہ ہمیشہ جاری ہے۔ اور وہ ہر زمانہ میں اسی طرح نمایاں و درخشاں ہے جیسا کہ آنحضرتؐ کے زمانہ میں تھا۔ علاوہ ازیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ ہر شخص کا کلام اس کی ہمت کے مطابق ہوتا ہے۔ جس قدر کسی شخص کی ہمت اور عزم اور اعلیٰ مقاصد ہونگے۔ اُسی پایہ کا اس کا کلام ہوگا۔ اور وحی الٰہی میں بھی یہی رنگ ہوتا ہے۔ جس شخص پر وحی الٰہی کا نزول ہوتا ہے۔ جس قدر وہ شخص ہمت بلند رکھنے والا ہوگا۔ اُسی پایہ کا کلام الٰہی اُسے ملیگا۔ آنحضرت کی ہمت و استعداد و عزم کا دائرہ چونکہ بہت ہی وسیع تھا۔ اس لئے جو کلام آپ کو ملا۔ وہ بھی بڑے پایہ اور رتبہ کا ہے۔ دوسرا کوئی شخص نہ اس ہمت و حوصلہ کا کبھی پیدا ہوگا۔ اور نہ ایسا کلام کبھی نازل ہوگا۔ کیونکہ آپؐ کی دعوت کسی محدود زمانہ یا مخصوص قوم کیلئے نہ تھی۔ جس طرح سابقہ انبیا کی ہوتی تھی بلکہ آپ کی شان میں فرمایا۔ قل انی رسول اللہ الیکم جمیعًا۔ نیز فرمایا ما ارسلنٰک الا رحمۃ للعٰلمین۔ جس شخص کی بعثت اور رسالت کا دائرہ اس قدر وسیع ہو۔ اس کا مقابلہ کون شخص کرسکتا ہے۔ اس وقت اگر کسی شخص پر قرآن شریف کی کوئی آیت الہام بھی ہو۔ تو ہمارا یہ اعتقاد ہے۔ کہ اس کے اس الہام میں اس کا اتنا دائرہ وسیع نہیں ہوگا۔ جس قدر آنحضرتؐ کا تھا اور یہی وجہ ہے کہ خواب کی تعبیر میں معبرین نے یہ اصول قائم کر رکھا ہے۔ کہ خواب ہر شخص کی حیثیت اور حالت کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص غریب ہے۔ تو اس کی خواب اس کی ہمت اور مقاصد کے اندر ہوگی۔ اسی طرح امیر کی اپنے رنگ و حیثیت کی اور بادشاہ کی اپنے رتبہ کے مطابق۔ مثلاً اگر ایک غریب شخص خواب میں دیکھے۔ کہ اُس کے سر میں خارش ہوتی ہے۔ تو اس کی یہ تعبیر تو ہونے سے رہی۔ کہ اس کے سر پر تاج شاہی رکھا جائیگا۔ بلکہ اُس کے لئے تو یہی مراد ہوگی۔ کہ وہ کسی سے جُوئیں کھائیگا۔ جس طرح انسانوں کی استعدادوں کے دائرے مختلف ہیں۔ اسی طرح پر کلام الٰہی کے دوائر بھی مختلف ہیں اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں بے مثل ہونے کے اور بھی بیشمار پہلو ہوتے ہیں۔ وہ

صرف اُس ایک پہلو سے ہی بے مثل نہیں ہوتا جو ہمارے خیال میں ہوتا ہے۔ کیونکہ وحی خدا تعالیٰ کے اس کلام کا نام ہے۔ جو بدوں تدبر نازل ہو۔ لیکن انسانی کلام ہمیشہ تدبر کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ اور پھر اس میں اصلاح بھی ہوتی رہتی ہے۔ لیکن کلام الٰہی میں کوئی اصلاح ممکن نہیں۔ ہر ایک چیز کا بے نظیر ہونا مقابلہ پر منحصر ہے۔ مثلاً اگر دو مُرغ ہوں تو اُن میں سے ایک دوسرے مُرغ کا مقابلہ کرنے اور اسکی نسبت کے باعث بے نظیر کہلائیگا۔ لیکن غیر جنس مثلاً ہاتھی کے مقابل تو اسکی کوئی حیثیت ہی قرار نہیں پا سکتی۔ اسی طرح پر جبکہ کرامات وغیرہ کا سلسلہ اللہ تعالیٰ نے رکھا ہوا ہے۔ پھر کیوں نہ اُس کے کلام میں بھی اعجاز کا رنگ پایا جائے۔ جس طرح ہر زمانہ میں اولیاء اللہ سے کرامات ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ اسی طرح پر اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف کے اعجازی کلام ہونے کے ثبوت میں اپنے کلام کا معجزہ رکھا ہوا ہے۔ جس طرح حضرت سید عبدالقادر جیلانیؒ کا کچھ کلام اپنے اندر معجزانہ طاقت رکھتا تھا۔ اسی طرح اس زمانے میں بھی قرآن شریف کے کلام کے اعجاز کے ثبوت میں مسیح موعودؑ کو کلام کا معجزہ دیا گیا۔ اور ساتھ ہی اس کے آنحضرت کے خوارق و نشانات کے ثبوت کیلئے اُسے دیگر خوارق و نشانات بھی دیئے گئے۔ جس جس قسم کے نشانات اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کو دیئے تھے۔ اسی قسم کے نشانات اس سلسلہ میں رکھ دیئے گئے ہیں۔ کیونکہ یہ سلسلہ آپؐ ہی کے نقشِ قدم پر ہے۔ اور دراصل وہی سلسلہ ہے۔ آیت آخرین منہم میں آنحضرت کی بروزی آمد کا وعدہ پیشگوئی کے رنگ میں پہلے سے ہی دیدیا گیا ہوا تھا۔ پس جس طرح آنحضرت کو بمثیل کلام کا معجزہ اور نشان دیا گیا تھا۔ اور قرآن شریف جیسی بے نظیر اور لاثانی کتاب آپؐ کو دی گئی تھی۔ اسی طرح پر آپؐ کی اس بروزی آمد میں بھی کلام کا ہی نشان دیا گیا۔ غور کر کے دیکھ لو۔ کس قدر تحدّی کے ساتھ غیرت دلانے والے الفاظ میں ہم نے مخالفین کو مقابلہ کیلئے بلایا۔ لیکن کسی کو حوصلہ اور ہمت نہیں ہوئی۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کی تمام ہمتوں کو سلب کر لیا ہے۔ اور اُن کے علوم و قابلیتوں کو چھین لیا ہے۔ باوجود بڑے بڑے دعاوی کرنے اور اپنے علوم کی لاف زنیاں مارنے کے ہمارے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے ان سب کو ذلیل اور شرمندہ کر دیا ہے۔

آنحضرت کا دوسرا بڑا معجزہ شق القمر تھا۔ شق القمر دراصل ایک قسم کا خسوف تھا۔ جو آنحضرتؐ کے اشارہ سے واقع ہوا۔ اسی طرح اس زمانے میں بھی اللہ تعالیٰ نے کسوف و خسوف کا ایک نشان دکھایا جو مسیح موعودؑ اور مہدیؑ کیلئے مخصوص تھا۔ اور جو ابتدائے دنیا سے آجتک کبھی اس رنگ میں نہیں دکھایا گیا۔ اور یہ صرف مسیح موعود کے زمانہ کا نشان رکھا گیا تھا۔ اور احادیث میں اسے مہدی کا

نشان قرار دیا گیا تھا جس مہدی کے بارہ میں آنحضرت نے فرمایا تھا۔ کہ وہ آپؐ کے نام پر آئے گا اس میں نقطہ یہی ہے۔ کہ جس قسم کے نشانات آنحضرتؐ کو دیئے گئے تھے۔ اسی رنگ کے نشان مہدی کو بھی دیئے جانے ضروری تھے۔ کیونکہ اُسکی آمد آپؐ کی آمد ہے۔

غرضیکہ قرآن شریف اپنے اندر ایک بیمثل روحِ زندگی رکھتا ہے اور بغیر کسی قسم کی نسبت اور مقابلہ کے وہ ایک مستقل اعجاز ہے۔ ہمیں بھی جو اعجاز کلام دیا گیا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے۔ جیسی ایک عمارت کو نقشہ کی صورت میں دکھایا جاتا ہے۔ یا ایک آئینہ کو دوسرے آئینہ میں دکھایا جائے۔ مسلمانوں کیلئے یہ امر کس قدر رنج کا موجب ہوتا۔ اگر یہ قبول کر لیا جاتا۔ کہ ان کو کوئی خوارق یا نشانات نہیں دیئے گئے۔ کیونکہ گذشتہ نشانات آئندہ زمانہ کے لوگوں کیلئے بطور ایک کہانی کے رہ جاتے ہیں۔ لیکن فطرتِ انسانی ہمیشہ تازہ بتازہ نشانات دیکھنا چاہتی ہے۔ مجھے ان خشک موحدوں پر نہایت افسوس آتا ہے۔ جو یہ سمجھ بیٹھے ہیں۔ کہ اب خوارق و نشانات کوئی نہیں ہو سکتے۔ اور نہ ان کی ضرورت ہے۔ ایسی خشک زندگی سے تو مر جانا ہی بہتر ہے۔ اگر خدا تعالیٰ نے اپنے فضل کا باب بند کر دیا ہے اور اس پر قفل لگا دیا ہے تو اھدنا الصراط المستقیم کی دعا کی تعلیم دینے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کی مثال تو ایسی ہوئی۔ کہ ایک شخص کی مشکیں باندھ دی جائیں اور پھر اُسے مار مار کر کہا جائے۔ کہ چل۔ بھلا ایسی صورت میں وہ کیسے چل سکتا ہے فیوض اور برکات کے دروازے تو خود بند کر دیئے اور پھر ساتھ ہی کہدیا کہ اھدنا الصراط المستقیم کی دعا ہر روز نماز میں کئی بار مانگا کرو۔ اگر قانونِ قدرت یہ رکھا تھا۔ کہ آنحضرت کے بعد معجزات اور برکات کا سلسلہ ختم کر دیا تھا۔ اور کسی شخص کو کسی قسم کا کوئی فیض اور برکت نہیں ملنی تھی تو پھر اس دعا کی تعلیم دینے کا کیا مطلب ؟ اگر اس دُعا کا کوئی نتیجہ نہیں۔ تو پھر نصاریٰ کی تعلیم کے آثار و نتائج اور اسلام کی تعلیم کے آثار و نتائج میں کیا فرق ہوا؟ لکھا تو انجیل میں بھی یہی ہے۔ کہ اسکی پیروی سے تم پہاڑ کو بھی ہلا سکو گے۔ لیکن اب ایک جوتی بھی سیدھی نہیں کر سکتے۔ پھر یہ بھی لکھا ہے۔ کہ مسیح جیسے معجزات بھی دکھاؤ گے لیکن ایک بھی عیسائی کوئی معجزہ نہیں دکھا سکتا۔ پھر لکھا ہے کہ زہر کھالو گے تو اثر نہ کریگی لیکن اب تمام سانپ ڈستے اور کتے کاٹتے ہیں اور عیسائی لوگ ان کے زہر سے ہلاک ہو جاتے ہیں اور ایک بھی نمونہ اپنی تائید کی دعا کا دکھا نہیں سکتے ان کا ایسا نہ کر سکنا اُن کے مذہب پر ایک کاری حربہ ہے۔ اور ان پر اسلام کی حجت ہے۔ اور یہی عیسائی مذہب کے ابطال پر ایک دلیل ہے کہ اس میں زندگی کی روح اور تاثیرات نہیں ہیں اور یہ اس امر کا بھی ثبوت ہے۔ کہ اُنہوں نے نبی کی تعلیم حقہ کو چھوڑ دیا ہے۔ اگر ہم بھی یہ بات

مان لیں۔ کہ اسلام میں بھی اب نشانات اور خوارق نہیں رہے۔ اور یہ دعا جو ہمیں سکھائی گئی ہے اس کا کوئی اثر اور نتیجہ نہیں ہے تو کیا اس کے یہ معنے نہ ہونگے۔ کہ یہ اعمال بالکل بے فائدہ ہیں۔ مگر ایسا ہرگز نہیں۔ خدا تعالیٰ جو دانا اور حکمت والا ہے۔ وہ نبوت کی تاثیرات کو ہمیشہ قائم رکھتا ہے۔ اور اب بھی اُس نے اس سلسلہ کو اسی لئے قائم کیا ہے۔ کہ وہ اس امر کی سچائی پر گواہ ہو۔ قرآن شریف کے اندر جس قدر اعجاز معارف بحر کلامی کے موجود ہیں۔ اس زمانے میں اللہ تعالیٰ ان سب کو ظاہر کر رہا ہے۔ تا کہ آنحضرتؐ کی نبوت اور آپؐ کے خوارق کا ثبوت ہوں۔ یہی ایک ہتھیار اور کاری حربہ ہے۔ جو ہمیں اللہ تعالیٰ نے عطا کیا ہے اور جس کے ذریعہ سے ہم مذاہب باطلہ کے سحر کو توڑنا چاہتے اور قرآن شریف کو خدا تعالیٰ کا زندہ کلام ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اسے منتر جنتر بنانا نہیں چاہتے۔ (الحکم جلد ۷ ۶)۔

۳۰ نومبر ۱۹۰۳ء۔ صاحبزادہ بشیر احمد صاحب و شریف احمد صاحب و مبارکہ بیگم صاحبہ کے ختم قرآن شریف پر آمین ہوئی۔ مساکین اور تبامی کو کھانا کھلایا گیا اور احباب موجودہ قادیان کو دعوت دی گئی۔ (الحکم جلد ۵ ۴۴)۔

۳ دسمبر ۱۹۰۱ء۔ بعد نماز مغرب حضرت مسیح موعودؑ نے مسجد مبارک میں جمع بین الصلوٰتین ذیل کی تقریر فرمائی:۔

سب صاحبان کو معلوم ہے۔ کہ ایک مدت سے خدا جانے قریباً چھ ماہ یا کم و بیش عرصہ سے ظہر و عصر کی نماز جمع کی جاتی ہے۔ میں اس بات کو مانتا ہوں۔ کہ ایک عرصہ سے جو مسلسل نمازیں جمع کی جا رہی ہیں اس کی وجہ سے ایک نو وارد یا نو مرید کو (جسے ہمارے اغراض و مقاصد کی کوئی خبر نہیں ہوتی) یہ شبہ گذرتا ہوگا۔ کہ کاہلی کے سبب سے شاید ہم نمازیں جمع کر لیتے ہونگے۔ جس طرح بعض غیر مقلد ذرا سے ابر کے سبب سے یا کسی عدالت میں جانیکے باعث نمازیں جمع کر لیتے ہیں۔ اور بلا مطر و بلا عذر نمازیں جمع کر لینا جائز سمجھتے ہیں۔ لیکن میں سچ سچ کہتا ہوں۔ کہ ہم کو اس جھگڑے کی ضرورت اور حاجت نہیں اور نہ ہم اس میں پڑنا اچھا سمجھتے ہیں۔ کیونکہ میں طبعاً اور فطرتاً اس بات کو پسند کرتا ہوں۔ کہ نمازیں اپنے اوقات مقررہ پر ادا کی جائیں۔ اور میں نماز موقوتہ کے مسئلہ کو بہت ہی عزیز سمجھتا ہوں۔ بلکہ سخت مطر میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ کہ نماز اپنے وقت پر ادا کی جائے۔ اگرچہ شیعوں اور غیر مقلدوں نے اس امر پر بڑے بڑے مباحثات کئے ہیں۔ لیکن ہمیں ان سے کوئی غرض نہیں۔ وہ

لوگ صرف نفس کی کاہلی سے کام لیتے ہیں۔ اور سہل حدیثوں کو اپنے مفید مطلب پاکر اُن سے کام لے لیتے ہیں۔ مگر مشکل احادیث کو موضوع اور مجروح ٹھیرا دیتے ہیں۔ لیکن ہمارا یہ مدعا ہرگز نہیں۔ بلکہ احادیث کے متعلق ہمیشہ سے ہمارا مسلک یہی رہا ہے۔ کہ جو حدیث قرآن اور سنت کے مخالف نہ ہو۔ وہ اگرچہ ضعیف بھی ہو تب بھی اس پر عمل کر لینا چاہیئے۔ ہم جو اس وقت نمازیں جمع کر کے پڑھ رہے ہیں اس کی اصل وجہ یہ ہے۔ کہ میں اللہ تعالیٰ کی تفہیم۔ القا۔ اور الہام کے بدوں کسی امر میں کچھ بھی نہیں کیا کرتا۔ بعض امور ایسے ہوتے ہیں۔ کہ میں اُنہیں ظاہر نہیں کرتا۔ لیکن اکثر ظاہر ہوتے ہیں۔ جہاں تک خدا تعالیٰ نے اس جمع بین الصلوٰۃ کے بارے میں مجھ پر ظاہر کیا ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ نے ہمارے لئے تجمع له الصلوٰۃ کی بھی ایک عظیم الشان پیشگوئی کی تھی جو اس زمانہ میں پوری ہو رہی ہے۔ میرا یہ بھی مذہب ہے کہ اگر کوئی امر خدا تعالیٰ کی طرف سے مجھ پر ظاہر کیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی حدیث کی صحت یا عدم صحت کے متعلق۔ تو گو علمائے ظواہر و محدثین اس کو موضوع یا مجروح ہی ٹھیراویں۔ مگر میں اس کے مقابل و معارض کی حدیث کو موضوع کہوں گا۔ اگر خدا تعالیٰ نے اس کی صحت مجھ پر ظاہر کر دی ہو۔ جیسے مثلاً لا مهدی الا عیسیٰ والی حدیث۔ گو محدثین اس پر کلام کرتے ہیں۔ لیکن مجھ پر خدا تعالیٰ نے یہی ظاہر کیا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ اور میرا یہ مذہب اپنا ہی ایجاد کردہ نہیں۔ بلکہ یہ مسلمانوں کا مسلمہ مسئلہ ہے۔ کہ اہل کشف و الہام لوگ محدثین کی تنقید حدیث کے محتاج اور پابند نہیں ہوتے۔ خود مولوی محمد حسین صاحب نے اپنے رسالہ میں اس مضمون پر بڑی بحث کی ہے۔ اور اس امر کو تسلیم کر لیا ہے۔ کہ مامور اور اہل کشف محدثین کی تنقید کے پابند نہیں ہوتے ہیں۔ میں صاف صاف کہتا ہوں۔ کہ میں جو کچھ کرتا ہوں۔ محض اللہ تعالیٰ کے القا اور اشارہ سے کرتا ہوں۔ یہ پیشگوئی جو حدیث تجمع له الصلوٰۃ میں کیگئی ہے۔ یہ مسیح موعود اور مہدی کی ایک علامت ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ وہ ایسی دینی خدمات اور کاموں میں مصروف رہیگا۔ کہ اس کیلئے نماز جمع کی جائیگی۔ اب جبکہ یہ نشان پورا ہو گیا۔ اور ایسے واقعات پیش آ گئے۔ کہ ہمیں نمازیں جمع کر کے پڑھنی پڑیں۔ تو اس کو بڑی عظمت کی نگاہ سے دیکھنا چاہیئے۔ نہ کہ استہزا اور انکار کے رنگ میں۔ دیکھو۔ انسان کے اپنے اختیار میں اس کی اپنی موت اور فوت نہیں ہے اس نشان کے پورا ہونے پر اب مخالف لوگ رکیک اور نامعقول عذر تراشتے ہیں۔ اور اسے اغراض کے

رنگ میں پیش کرکے حدیث کی صحت اور عدم صحت کے سوال کو لے بیٹھے ہیں۔ لیکن میں سچ کہتا ہوں۔ کہ اگر خدانخواستہ اس نشان کے پورا ہونے سے پہلے ہم پر موت آجاتی تو یہی لوگ اس حدیث کو جسے اب موضوع ٹھہرا رہے ہیں۔ آسمان پر چڑھا دیتے اور موجودہ شور و شر سے بڑھکر غل مچاتے اور دشمن کیلئے ہم پر حملہ کرنے کا یہی ہتھیار ہو جاتا۔ لیکن اب جب کہ وہ حدیث ہماری صداقت کا ایک نشان اور گواہ ٹھہرتی ہے۔ تو اُسے نکما اور لاشے قرار دیا جاتا ہے۔ پس ایسے لوگوں کیلئے ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اُنہوں نے ہماری صداقت کے صدہا نشان دیکھے۔ لیکن ان کا انکار پر انکار کر دیا۔ اور صادق کو کاذب ٹھہرانے پر سارا زور لگا دیا۔ گذشتہ نشانوں میں سے کس نشان کو اُنہوں نے مانا۔ کہ آئندہ امید رکھی جائے۔ کہ وہ کسی نشان کو قبول کر لینگے۔ کیا کسوف و خسوف کا کوئی چھوٹا نشان تھا۔ اس کے پورا ہو جانے سے پہلے اُسے مہدی معہود کا نشان قرار دیتے تھے۔ لیکن جب وہ پورا ہو گیا۔ تو اُسے بھی مشکوک کرنیکی کوشش کی۔ ایسے مخالفوں کی کورچشمی اور تعصب کا کیا علاج ہو سکتا ہے۔ اب رہی اپنی جماعت۔ سو اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ کہ اس کیلئے ہمارا نمازوں کو جمع کرکے پڑھنا ابتلا کا موجب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جس قوم نے دمشق کے منارہ پر فرشتوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے زرد پوش مسیح کے نزول کی حقیقت کو خدا تعالیٰ کے فضل سے سمجھ لیا ہے۔ اور جس نے خدائی صفات رکھنے والے دجّال کا انکار کرکے اُس کی اصل حقیقت پر اطلاع پائی ہے اور اسی طرح جس قوم نے دابۃ الارض اور دجال کے متعلق مخالف لوگوں کے خانہ ساز مجموعوں کو چھوڑ دیا۔ اور مجھ پر نیک ظنی کرکے مخالفین سے الگ ہو گئے۔ تو یہ امر اُن کیلئے کسی روک اور ابتلا کا موجب کیونکر ہو سکتا ہے اس بات کو خوب یاد رکھو کہ اب بات صرف حسن ظنی تک نہیں رہی۔ بلکہ خدا تعالیٰ نے ان کو معرفت اور بصیرت کے مقام تک پہنچا دیا ہے۔ اور وہ دیکھ چکے ہیں کہ میں وہی ہوں۔ جس کا خدا نے وعدہ کیا تھا۔ ہاں میں فی الحقیقت وہی ہوں۔ جس کا سارے نبیوں کی زبان پر وعدہ ہوا تھا۔ اسی پر بس نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی معرفت بڑھانے کیلئے منہاج نبوت پر اسقدر نشانات میرے ہاتھ پر ظاہر کئے۔ کہ لاکھوں انسان ان کے گواہ ہیں۔ دوست دشمن۔ دور و نزدیک۔ ہر مذہب و ملت کے لوگ ان نشانات کے گواہ ہیں۔ میرے لئے زمین نے اپنے نشانات الگ ظاہر کئے۔ اور آسمان نے الگ۔ وہ نشانات و علامات جو میرے لئے مقرر تھیں

وہ سب پوری ہوگئیں۔ پھر اس قدر نشانات کے بعد اگر کوئی شخص میرا انکار کرتا ہے۔ تو وہ ہلاک ہوتا ہے۔ میں دعوے سے کہتا ہوں۔ کہ تم میں سے ہر ایک شخص پر خدا تعالیٰ نے ایسا فضل کیا ہے۔ کہ کوئی بھی تم میں سے نہیں۔ جس نے کوئی نہ کوئی نشان اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہو۔ کیا تم میں سے کوئی بھی ایسا شخص ہے کہ جو یہ کہہ سکے کہ اُس نے کوئی نشان نہیں دیکھا۔ میں یقیناً کہتا ہوں۔ ایک بھی نہیں۔ پھر ایسی بصیرت اور معرفت بخشنے والے نشانوں کے بعد مجھ پر حُسنِ ظن ہی نہیں رہا۔ بلکہ میری سچائی اور خدا کی طرف سے مامور ہو کر آنے پر تم سب لوگ علی وجہ البصیرۃ گواہ ہو۔ اور تم پر خدا تعالیٰ کی حجت پوری ہو چکی ہے۔ پھر وہ شخص بڑا ہی بدقسمت اور نادان ہوگا۔ جو اتنے نشانات دیکھنے کے بعد بھی اس پیشگوئی کے پورا ہونے پر کسی ابتلا میں پڑ جائے۔ حالانکہ اس کا پورا ہونا اُس کے ازدیادِ ایمان کا موجب ہونا چاہیئے تھا۔ اور جیسا کہ حضرت نبی کریمؐ نے فرمایا تھا۔ آنے والے موعود کا یہ بھی ایک نشان ہوگا۔ کہ اسکے لئے نماز جمع کی جائیگی۔ تو ایسے لوگوں کو جنہوں نے آنحضرتؐ کی اس پیشگوئی کو پورا ہوتے دیکھ لیا خدا تعالیٰ کا شکر گذار ہونا چاہیئے۔ لیکن اگر اس وقت کوئی شخص یہ کہے۔ کہ یہ حدیث موضوع ہے۔ تو اس کا ایک جواب تو میں پہلے دے چکا ہوں۔ کہ اہل کشف اور مامورانِ الٰہی تنقید احادیث میں محدثین کے اصولوں کے محتاج اور پابند نہیں ہوتے اور جب کہ اس حدیث کی صحت کو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر ظاہر کر دیا ہے۔ تو اس کے ضعیف ہونے پر زور دینا تقویٰ کے خلاف ہے۔ پھر میں یہ بھی کہتا ہوں۔ کہ محدثین خود ہی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں۔ کہ احادیث میں مرد کیلئے سونے کا زیور پہننا منع ہے۔ لیکن اس بارے میں وہ کیا جواب رکھتے ہیں؟ جب کہ حضرت عمرؓ نے ایک صحابیؓ کو سونے کے کنگن پہنا دیئے۔ حالانکہ اس صحابیؓ نے انکار بھی کیا۔ مگر حضرت عمرؓ نے اسکو سونے کے کنگن پہنا کر ہی چھوڑے۔ اب قابلِ غور امر یہ ہے۔ کہ کیا حضرت عمرؓ اس حرمت کے حکم سے ناواقف تھے؟ ہرگز نہیں۔ وہ اس حکم سے بخوبی واقف و آگاہ تھے۔ لیکن آنحضرتؐ کی پیشگوئی کے پورا ہونے پر ہزار ہا احادیث کو قربان کرنے پر تیار تھے۔ اب قابلِ غور امر یہ ہے۔ کہ جب ایک پیشگوئی کے پورا ہونے نے ایک حرمت کا جواز کرا دیا۔ تو بلا مطر و بلا عذر والی بات پر انکار کیوں۔ احادیث میں تو یہاں تک بھی آیا ہے۔ کہ اپنی خواب کو سچا کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ چہ جائیکہ حضرت نبی کریمؐ کی ایک پیشگوئی کے پورا کرنے کیلئے تیار نہ ہو۔ ایسا شخص دشمن اسلام ہے۔ اور معاذ اللہ آنحضرتؐ کو جھوٹا ٹھہرانا چاہتا اور آپؐ کے

مخالفوں کو آپ پر اعتراضات کا موقعہ دینا چاہتا ہے۔ صحابہؓ کا مذہب یہی تھا۔ کہ وہ آنحضرتؐ کی پیشگوئیوں کے پورا ہونے پر اپنی معرفت اور ایمانی ترقی دیکھتے تھے۔ اور وہ آپ کے اسقدر عاشق تھے۔ کہ جب آنحضرتؐ سفر پر تشریف لے جاتے۔ اور فرمادیا کرتے۔ کہ فلاں جگہ نماز جمع کرلی جائیگی۔ تو صحابہؓ ضرور ہی کوشش کرتے۔ کہ آپ کی بات پوری ہو۔ اور اسی مقام پر نماز جمع ہو۔ یہی نہیں بلکہ خود نبی کریم اپنی پیشگوئیوں کے پورا ہونے کے بہت مشتاق تھے۔ مثلاً غور کرو کہ آپ حدیبیہ کی طرف کیوں تشریف لیگئے۔ کیا آپ کو کوئی وقت یا میعاد بتائی گئی تھی۔ کہ آپ وہاں گئے۔ آخر کیا بات تھی؟ اصل بات یہی تھی۔ کہ آپ چاہتے تھے۔ کہ خدا تعالیٰ کی بتائی ہوئی پیشگوئی کسی طرح پوری ہو۔ یہ ایک نہایت باریک سر اور دقیق نکتہ معرفت ہے۔ جسے ہر ایک شخص سمجھ نہیں سکتا۔ کہ انبیاء اور اہل اللہ کیوں پیشگوئیوں کے پورا ہونے اور کرنے کیلئے ایک غیر معمولی رغبت اور تحریک اپنے دلوں میں رکھتے ہیں۔ جس قدر بھی انبیاء گذرے ہیں یا اس امت میں اہل اللہ ہوئے ہیں۔ اُن کو فطرۃً اس بات کی تڑپ دی جاتی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے نشانوں کے پورا کرنے کیلئے ہمہ تن کوشش کریں مثلاً دیکھو۔ حضرت مسیح تخت داؤد کی بحالی والی پیشگوئی کے پورا کرنے کیلئے کس قدر کوشش اور سعی کرتے رہے یہاں تک کہ اپنے شاگردوں کو حکم دیا۔ کہ جس کے پاس تلوار اور ہتھیار نہ ہو۔ وہ اپنے کپڑے بیچ کر ہتھیار خریدے۔ اب اگر اس پیشگوئی کے پورا کرنے کیلئے حضرت مسیح فطرتی جوش نہ رکھتے تھے۔ جو انبیاء کو ہوتا ہے تو ان کے ایسا حکم دینے کا کیا مطلب تھا۔ ایسا ہی اگر حضرت نبی کریمؐ میں پیشگوئی کے پورا کرنے کیلئے فطرتی جوش نہ تھا۔ تو آپ کیوں حدیبیہ تشریف لیگئے۔ حالانکہ پیشگوئی میں فتح کا کوئی وقت اور میعاد بھی نہ بتائی گئی تھی۔ اصل بات یہی ہے۔ کہ انبیاء و اولیاء اللہ تعالیٰ کے نشانات کی عزت کرنا چاہتے ہیں۔ اور چونکہ اُن کے پورا ہوجانے پر معرفت اور یقین میں ترقی ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کا ظہور ہوتا ہے۔ جس کے ظہور کیلئے وہ بیتاب ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ ان کے پورا کرنے کیلئے سعی بلیغ کرتے ہیں۔ حضرت نبی کریمؐ کا قاعدہ تھا۔ کہ جب کوئی نشان پورا ہوتا تو آپ سجدہ میں گر جاتے۔ جب تک کہ انسان کا دل دھویا نہ جائے اور ایمان حجاب اور زنگ کی تہوں سے صاف نہ کیا جائے۔ سچا اسلام اور سچی توحید جو مدار نجات ہے حاصل نہیں ہوسکتی۔ اور دل کے دھونے اور ان حجاب ظلمانی کے دور کرنے کا آلہ یہی نشانات الٰہیہ ہیں۔ جن کے ذریعے سے خود اللہ تعالیٰ کی ہستی اور نبوت پر ایمان پیدا ہوتا ہے اور جبتک سچا ایمان

نہ ہو۔ انسان جو کچھ اعمال کرتا ہے۔ وہ محض رسوم کی پابندی اور ظاہرداری کے طور پر کرتا ہے۔
(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۲)۔

پس جب اللہ تعالیٰ کا منشا ایسا ہی تھا۔ کہ ہر دو نمازیں جمع کی جایا کریں۔ تاکہ اس کا نشان پورا ہو۔ تو میرا نورِ قلب کب اسکے خلاف کرنے کی رائے دے سکتا تھا۔ اسلئے میں نے چاہا۔ کہ یہ ہونا چاہیئے۔ تاکہ ہمارے نبی کریم کی پیشگوئی پوری ہو۔ ممکن تھا۔ کہ ایسے واقعات پیش ہی نہ آتے۔ لیکن جب ایسے واقعات پیش آگئے۔ کہ ہمیں نمازیں جمع کرنی پڑیں۔ کیونکہ مصروفیت از بس ضروری تھی۔ اور ان امور پر توجہ ٹھیک طور لگائی جانی نہایت ضروری تھی۔ تو نبی کریم کی اس پیشگوئی کے پورا ہونے کا وقت آگیا۔ اور وہ پوری ہوگئی۔ یعنیہ جس طرح پر کہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا۔ والحمد للہ علیٰ ذٰلک۔ پھر جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ ان نمازوں کا جمع کرنا اللہ تعالیٰ کے اشارہ۔ ایما۔ اور القا سے تھا۔ حالانکہ ہمارے مخالف تو معمولی عذر پر بھی نمازوں کو جمع کر لیا کرتے ہیں۔ اور مسجدوں میں بھی نہیں جاتے۔ بلکہ اپنے گھروں میں ہی پڑھ لیا کرتے ہیں۔ مولوی محمد حسین صاحب کو ہی قسم دیکر پوچھ لیا جائے۔ کہ کیا اس نے کبھی کسی حاکم کے پاس جاتے وقت نمازیں جمع کی ہیں یا نہیں۔ جب معترضین کا خود یہ حال ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کے ایک عظیم الشان نشان پر کیوں اعتراض کیا جاتا ہے۔ اگر معترض میں تقویٰ اور خدا ترسی ہو۔ تو اعتراضات کرنے سے پہلے اپنے گھر میں ہی سوچ لے کہ وہ کیا کہتا ہے؟ اور اس کا اثر اور نتیجہ کیا ہوگا۔ اور یہ اعتراض کس پر جاکر پڑیگا۔ میں نے اس اجتہاد میں یہ بھی سوچا کہ ممکن تھا کہ ہم دس دن میں ہی اس کام کو ختم کر دیتے۔ جو اس پیشگوئی کے پورا ہونے کا موجب اور سبب ہوا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی پسند فرمایا۔ کہ جب یہ لوگ اپنے نفس کے آرام کی خاطر دو دو ماہ نمازیں جمع کرتے رہتے ہیں۔ تو حضرت نبی کریم کی پیشگوئی کی تکمیل کیلئے ایسی دراز مدت چاہیئے۔ جسکی نظیر نہ ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اگرچہ وہ مصالح ابھی تک مجھ پر نہیں کھلے۔ جن کی وجہ سے ایسا ہوا۔ لیکن اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے۔ اور مجھے امید ہے۔ کہ وہ ضرور کسی وقت کھل جائینگے۔ دیکھو میں ضعف دماغ کی بیماری بدستور لاحق ہے۔ اور بعض دفعہ ایسی حالت ہو جاتی ہے۔ کہ گویا موت قریب ہے اور تم میں سے اکثر میری ایسی حالت کو بچشم خود دیکھا بھی ہے۔ اس کے علاوہ پیشاب کی بیماری بھی عرصہ ہے۔ گویا یہ دونوں زرد چادریں مجھے پہنائی گئی ہیں۔ ایک بدن کے اوپر کے حصہ میں اور دوسری بدن کے نچلے حصہ

ان ہر دو بیماریوں کی وجہ سے صافی وقت بہت کم ملتا ہے۔ مگر ان ایام میں اللہ تعالیٰ نے اپنا خاص فضل فرمایا۔ کہ صحت بھی اچھی رہی۔ اور کام عمدہ طرح سے ہوتا رہا۔ مجھے تو ان لوگوں کے جمع بین الصلوٰتین کے اعتراضات سُنکر ان پر افسوس اور تعجب ہوتا ہے۔ حالانکہ اُنہوں نے خود مسیح موعودؑ کی قسمت میں بہت سے اجتماع رکھے ہوئے ہیں۔ مثلاً کسوف وخسوف کا اجتماع ہوا۔ جو میری آمد کا نشان تھا۔ پھر اذا النفوس زوجت بھی میرے ہی لئے ہے اور پھر اٰخرین منھم لما یلحقوا بھم بھی ایک اجتماع ہے۔ اس میں اولین و آخرین کو ملایا گیا ہے۔ اور یہ ایک عظیم الشان جمع ہے جو رسول اللہؐ کے برکات اور فیوض کی زندگی پر دلیل اور گواہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک جمع ہے۔ کہ خدا تعالیٰ نے تبلیغ کے سارے سامان ہمارے لئے جمع کر دیئے ہیں۔ چنانچہ مطبع کا سامان۔ کاغذ کی کثرت۔ ڈاک خانوں۔ تار۔ ریل اور دخانی جہازوں کے ذریعہ سے کل دنیا ایک شہر کا حکم رکھتی ہے۔ اور پھر ہر روز نئی سے نئی ایجادات اس جمع کو اور بھی بڑھا رہی ہیں۔ کیونکہ اسباب تبلیغ اور بھی بڑھتے جا رہے ہیں۔ اس وقت ہم فونوگراف سے بھی تبلیغ کا کام لے سکتے ہیں۔ اخبارات اور رسالہ جات کا اجرا بھی بہت کام دے سکتا ہے غرض تبلیغ کیلئے اسقدر سامان مہیا ہو گئے ہیں۔ کہ ان کی نظیر کسی گذشتہ زمانہ میں نہیں ملتی۔ رسول اللہ کی بعثت کے اغراض میں سے ایک غرض تکمیل دین بھی تھی۔ جس کیلئے فرمایا گیا الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی۔ اس تکمیل میں دو قسم کی تکمیل مقصود تھی۔ اوّل تکمیل ہدایت۔ دوم تکمیل اشاعت ہدایت۔ تکمیل ہدایت کا زمانہ تو آنحضرت کا مبارک زمانہ تھا۔ لیکن تکمیل اشاعت ہدایت کا زمانہ آپؐ کا دوسرا زمانہ تھا جبکہ اٰخرین منھم لما یلحقوا بھم کا وقت آنے والا تھا۔ اور وہ وقت اب ہے۔ یعنی مسیح موعودؑ کا زمانہ اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے ان ہر دو زمانوں یعنی تکمیل ہدایت و تکمیل اشاعت ہدایت کے زمانوں کو بھی اس طرح پر ملا دیا ہے۔ اور یہ بھی ایک عظیم الشان جمع ہے۔ پھر یہ بھی وعدہ تھا کہ اس زمانہ میں یعنی مسیح موعودؑ کے زمانہ میں دنیائے جہان کے جملہ ادیان کو جمع کر دیا جائے گا اور ان پر ایک دین یعنی اسلام کو غالب کر دیا جائیگا۔ یہ بھی مسیح موعودؑ کے وقت کی ایک جمع ہے کیونکہ لیظھرہ علی الدین کلہ کا زمانہ جملہ مفسرین کے نزدیک مسیح موعود کا ہی زمانہ ہوگا۔ پھر لکھا ہے۔ کہ وہ ایسا امن کا زمانہ ہوگا۔ کہ بھیڑیا اور بھیڑ ایک گھاٹ پر پانی پئینگے۔ جیسا کہ اس وقت نظر آتا ہے۔ ہمارے مخالفوں نے ہمارے قتل کے کتنے منصوبے کئے۔ مگر وہ کیوں کامیاب نہ

ہو سکے۔ وہ صرف اسی گورنمنٹ کے حسن انتظام اور امن کی وجہ سے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ بھی ارادہ فرمایا ہوا تھا۔ کہ اس زمانہ میں اسلام کے حقائق و معارف جمع کئے جائینگے۔ میں دیکھتا ہوں۔ کہ جس طرح ظہر و عصر کی نمازیں جمع ہوئی ہیں ایسا ہی ظہر و عصر کے اوقات کے اجتماع کا حال ہے۔ ظہر اسمان کے جلالی رنگ کا مظہر ہے اور عصر جمالی رنگ کا۔ اسلئے خدا تعالیٰ اس زمانہ میں جلال و جمال ہر دو کا اجتماع چاہتا ہے۔ چونکہ میرا نام اُس نے آدم بھی رکھا ہے۔ اور آدم کیلئے یہ بھی فرمایا ہے کہ اس کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا یعنی جلالی اور جمالی ہر دو رنگ اس میں رکھے۔ اس لئے اس جگہ بھی جلال اور جمال کا اجتماع کر کے دکھا دیا۔ جلالی رنگ میں طاعون وغیرہ اللہ تعالیٰ کی گرفتیں ہیں جن کو سب لوگ دیکھ رہے ہیں۔ اور جمالی رنگ میں اس کے انعامات اور مبشرانہ وعدے ہیں۔ اور پھر میری دانست میں اللہ تعالیٰ نے میرے ساتھ ایک اور جمع کی بھی خبر دے رکھی ہے جسکی اللہ تعالیٰ نے مجھے اطلاع بھی دی ہے اور وہ یہ ہے کہ میری پیدائش میں میرے ساتھ ایک لڑکی بھی اُس نے رکھی ہے اور پھر قومیت اور نسب میں بھی ایک جمع رکھی اور وہ یہ کہ ہماری ایک دادی سیدہ تھیں اور دادا صاحب اہل فارس تھے۔ اب بھی خدا تعالیٰ نے اس قسم کی جمع خود ہمارے گھر میں بھی رکھی ہے۔ کہ ایک صحیح النسب سیدہ میرے نکاح میں آئی۔ اسی طرح جس طرح اللہ تعالیٰ نے مجھے پہلے سے بشارت دی تھی۔ اب غور تو کرو۔ کہ خدا تعالیٰ نے کسقدر اجتماع یہاں رکھے ہوئے ہیں۔ ان تمام اجتماعوں کو خدا تعالیٰ نے مصلحت عظیمہ کیلئے ہی جمع کیا ہے۔

ہماری جماعت کیلئے تو یہ امر دور از ادب ہے۔ کہ وہ اس قسم کی باتیں پیش کریں۔ یا اُن کے وہم میں بھی ایسی باتیں آئیں اور میں پھر سچ سچ کہتا ہوں۔ کہ میں جو کچھ کرتا ہوں۔ وہ خدا تعالیٰ کی تفہیم اور اشارہ سے کرتا ہوں۔ پھر کیوں اسکو پیشگوئی سمجھ کر اسکی عزت نہیں کرتے۔ جس طرح حضرت عمرؓ نے آنحضرتؐ کی پیشگوئی سمجھ کر ایک صحابی کو سونے کے کنگن پہنا دیئے۔ اب تم بتاؤ۔ کہ تم اور کیا چاہتے ہو۔ اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے اس قدر نشانات جمع کر دیئے ہیں اگر اللہ تعالیٰ پر ذرا سا بھی ایمان ہو تو کوئی وہم اور خیال اس قسم کا پیدا نہیں ہو سکتا جس سے اعراض کا رنگ پایا جائے اور اگر اسقدر نشانات دیکھکر بھی کوئی شخص اعراض کرتا اور ہم سے علیحدہ ہوتا ہے تو وہ بیشک ہماری جماعت سے نکل جائے اور ہم سے علیحدہ ہو جائے خدا تعالیٰ کو اسکی کیا پرواہ ہے۔ ایسا شخص کسی جگہ سہارا نہیں پا سکتا جبکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم اور عدل ٹھیرایا ہے اور تم لوگوں نے اسبات کو قبول کر لیا ہے پھر ایسی باتوں پر اعراض کرنا ضعف ایمان کا نشان ہے حکم مان کر سب باتیں بند ہو جانی چاہئیں اور اگر مخالفین کے اعتراضات کنکھجھی کا خیال ہوتو انہوں نے اس سے پہلے ہم سے کیا کچھ سلوک نہیں کیا۔ دجال۔ بے ایمان۔ کافر۔ الکفر

تک ٹھیرایا - اور کوئی گالی باقی نہیں رہی - جو اُنہوں نے ہمیں نہیں دی - اور کوئی منصوبہ شرارت اور تکلیف دہی کا نہیں رہا - جو اُنہوں نے نہیں سوچا - پھر اب باقی کیا رہ گیا - ان باتوں کے ہوتے ہوئے جو شخص غیروں کی پرواہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑتا ہے اللہ تعالیٰ اسکی پرواہ نہیں کرتا - جبتک اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حکم کی بات کے سامنے اپنی زبانوں بند نہ کروگے - وہ ایمان تم میں پیدا نہیں ہو سکتا - جو خدا چاہتا ہے اور جس غرض کیلئے اُس نے مجھے بھیجا ہے - پھر میں کہتا ہوں کہ یہ بالکل سچ ہے - کہ میرا یہ عمل اپنی تجویز اور خیال سے نہیں - بلکہ اللہ تعالیٰ کی تفہیم سے ہے اور رسول اللہ کی پیشگوئی کی سچائی کیلئے ہے - میں کسی اور حکم کی ضرورت نہیں سمجھتا - جو شخص چاہتا ہے اُسے قبول کرے - اور جس کا دل مریض ہے - وہ مجھ سے الگ ہو جائے - میں ایسے لوگوں کو جن کے دلوں میں ایسے وساوس اُٹھتے ہیں یہ صلاح دیتا ہوں - کہ وہ کثرت سے استغفار کریں اور خدا سے ڈریں - ایسا نہ ہو - کہ خدا اُن کی جگہ اور قوم لے آوے اور وہ جملہ برکات سے محروم رہ جاویں - ایک دفعہ مجھے الہام ہوا تھا - کہ کوئی شخص میری طرف اشارہ کرکے کہتا ہے - ھٰذا الرجل یحیی الدین - (یہ شخص دین کی جڑ اُکھاڑتا ہے) میں اس الہام سے خوش ہوا - کیونکہ آثار میں ایسا ہی لکھا ہے - کہ مسیح اور مہدی کی نسبت ایسے ہی فتوے دیئے جائیں گے - حجج الکرامہ میں ایسا ہی لکھا ہے اور ابن عربی نے لکھا ہے - کہ جب مسیح نازل ہوگا تو ایک شخص کھڑا ہو کر کہیگا - انّ ھٰذا الرجل غیر دیننا - یعنی یہ شخص ہمارے دین کو بدلتا ہے - حضرت مجدد الف ثانی صاحب کے مکتوب دوم میں صاف طور پر لکھا ہے - کہ مسیح موعود جو کچھ بیان کریگا وہ اسرار غامضہ ہونگے اور لوگوں کی سمجھ میں نہ آئینگے - حالانکہ وہ قرآن سے استنباط کریگا - پھر بھی لوگ اس کی مخالفت کرینگے - اصل بات یہ ہے - کہ جیسے مسیح موعود کے ساتھ جمع کا ایک نشان ہے - عوام کے خیال کے مطابق ایک تغیر بھی اس کے ساتھ ضروری ہے - کیونکہ وہ بحیثیت حکم ہونے کے تمام بدعات اور خرابیوں کو جو مسیح اعوج کے زمانہ میں پیدا ہوتی ہیں - دور کریگا - اور لوگ ان کو تغیر دین کے نام سے یاد کرینگے - میں پوچھتا ہوں کہ اگر تم مخالفوں سے ڈرتے ہو - تو پھر مجھے قبول کرنے کا کیا فائدہ ہوا - میری مخالفت میں ان لوگوں نے تمہیں بھی کافر اور دجّال ٹھیرایا اس سے بڑھکر وہ تمہارا کیا کر سکتے ہیں - اور پھر اگر یہ بات سچ ہے کہ ان کی بدعات و بدرسومات کی اصلاح کرنا تغیر دین ہے تو بتاؤ کہ میں نے تو جہاد کی حرمت کا فتویٰ دے رکھا ہے - کہ دین کیلئے تلوار اُٹھانا حرام ہے - پھر اس بارہ میں مخالفین کے اعتراضات کی تم لوگ کیوں پرواہ نہیں کرتے - ہمارے مخالف تو لفیع الخبر یہ کہتے ہیں لیکن میں یضع الحرب کو درست سمجھتا ہوں - حاصل مطلب یہ ہے - کہ اگر تم لوگ یہ چاہو کہ مخالفین کے

اعتراضات سے بچ جاؤ۔ تو یہ مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ جب تک کہ مجھ سے بالکل برگشتہ نہ ہو جاؤ۔ پس اب یک طرفہ محکم گیر پر عمل کرو۔ (الحکم جلد ۶ صفحہ ۳۴)

جو شخص ایمان لاتا ہے۔ اُسے اپنے ایمان سے یقین اور عرفان تک ترقی کرنی چاہیئے۔ نہ یہ کہ وہ بدظنی میں گرفتار ہو جائے۔ یاد رکھو۔ کہ ظن مفید نہیں ہو سکتا۔ خدا تعالیٰ خود فرماتا ہے۔ ان الظن لا یغنی من الحق شیئا۔ یقین ہی ایک ایسی چیز ہے۔ جو انسان کو بامراد کر سکتی ہے۔ اور یقین کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ اگر انسان بات بات پر بدظنی کرنے لگے۔ تو دنیا میں ایک دم بھی گذارہ ہونا مشکل ہے۔ انسان پانی پینا چھوڑ دے اس ظن سے کہ شاید اس میں کوئی زہریلا مادہ ملا ہوا ہو۔ بازار کی اشیاء نہ کھا سکے۔ کہ ان میں کوئی خطرناک مضر شے نہ ہو۔ پھر ظن کر کے دنیا میں کس طرح گذارہ ہو سکتا ہے۔ یہ تو ایک سوئی مثال ہے۔ اسی مثال سے انسان روحانی امور میں فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔ اب تم خود سوچ لو۔ اور اپنے دلوں میں فیصلہ کر لو۔ کہ ایسے اعتراضات دل میں رکھ کر تم نے مجھے کس طرح مسیح موعود اور حکم و عدل ماننا ہے۔ اور میری بیعت کی ہے۔ اگر یہ ماننے کے بعد میرے کسی فیصلہ یا قول یا فعل پر تمہارے دلوں میں کوئی کدورت یا رنج آتا ہے۔ تو اپنے ایمان کی فکر کرو۔ یاد رکھو اور خوب یاد رکھو کہ وہ ایمان جو خدشات اور توہمات سے بھرا ہوا ہو وہ کوئی نیک نتیجہ پیدا کرنے والا نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر تم نے مجھے سچے دل سے تسلیم کر لیا ہے۔ کہ میں فی الواقع مسیح موعود حکم اور عدل ہوں تو میرے حکم اور فعل کے سامنے اپنے سارے ہتھیار ڈال دو اور میرے فیصلوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھو۔ تا تم حضرت رسول کریمؐ کی پاک باتوں کی عظمت کرنے والے ٹھہرو۔ تم لوگوں کیلئے رسول اللہ کی شہادت کافی ہے۔ کیونکہ آپؐ تسلی دیتے ہیں۔ کہ مسیح موعود تمہارا امام ہوگا۔ اور وہ حکم اور عدل ہوگا۔ اگر اس پر بھی تمہاری تسلی نہیں ہوتی۔ تو پھر کیسے ہوگی؟ یہ طریقہ ہرگز اچھا اور مبارک نہیں ہو سکتا۔ کہ انسان ایمان کا بھی مدعی ہو۔ اور پھر اس کے دل کے بعض گوشوں میں بدظنیاں بھی ہوں۔ میں اگر صادق نہیں ہوں۔ تو پھر جاؤ اور صادق تلاش کرو۔ اور یقیناً سمجھو کہ اس وقت کوئی اور صادق تمہیں نہیں مل سکتا۔ اور پھر اگر دوسرا کوئی صادق نہ ملے اور ہرگز نہیں ملیگا۔ تو پھر میں اتنا حق مانگتا ہوں۔ جو آنحضرتؐ نے مجھے دیا ہے۔ جن لوگوں نے میرا انکار کیا ہے اور جو مجھ پر اعتراض کرتے ہیں۔ اُنہوں نے مجھے ہرگز شناخت نہیں کیا۔ اور جس شخص نے مجھے تسلیم کیا۔ اور پھر مجھ پر اعتراض بھی رکھتا ہے۔ وہ بہت ہی بدقسمت ہے کہ دیکھ کر بھی اندھا ہو گیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ معاصرت بھی رتبہ کو کھا دیتی ہے

اسی لئے حضرت مسیحؑ کہتے ہیں۔ کہ نبیؑ بے حرمت نہیں ہوتا مگر اپنے وطن میں۔ جس سے معلوم ہوسکتا ہے۔ کہ اُن کو اپنے اہل وطن سے کیا کیا تکلیفیں اور صدمے اُٹھانے پڑے ہونگے۔ انہیں پر منحصر نہیں بلکہ انبیاء کے ساتھ یہ ایک سنت چلی آتی ہے۔ ہم اس سے کیونکر الگ ہوسکتے ہیں۔ اسلئے ہم کو جو کچھ اپنے مخالفوں سے سُننا پڑا۔ یہ اُسی سنت انبیاء کے موافق ہے۔ مایاتیھم من رسول الا کانوا بہ یستھزؤن۔ افسوس اگر یہ لوگ صاف نیت کے ساتھ میرے پاس آتے۔ تو میں ان کو وہ کچھ دکھاتا۔ جو خدا تعالیٰ نے مجھے دیا ہے۔ اور وہ خدا خود ان پر اپنا فضل کرتا۔ اور اُنہیں سمجھا دیتا۔ لیکن اُنہوں نے بُخل اور حسد سے کام لیا۔ اس لئے اب میں کس طرح اُن کو سمجھاؤں۔ جب انسان سچے دل سے حق طلبی کیلئے آتا ہے۔ تو سب امور کے فیصلے ہوجاتے ہیں۔ لیکن جب بدگوئی اور شرارت مقصود ہو تو کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ میں کبتک اُن کے فیصلے کرتا رہونگا۔

حجج الکرامہ میں ابن عربی کے حوالہ سے لکھا ہے۔ کہ جب مسیح موعود آئیگا۔ تو اُسے مفتری اور جاہل ٹھیرایا جائیگا اور یہاں تک بھی کہا جائیگا۔ کہ وہ دین کو تغیر کرتا ہے۔ اس وقت ہمارے ساتھ بھی یہی ہو رہا ہے۔ اور اسی قسم کے الزامات مجھ پر لگائے جارہے ہیں۔ اس قسم کے شبہات سے انسان تب ہی نجات پاسکتا ہے۔ جب وہ اپنے اجتہاد کی کتاب ڈھانپ لے۔ اور اسکی بجائے وہ اس بات کی فکر کرے۔ کہ کیا میرا دعویٰ سچا ہے یا نہیں۔ اس میں شک نہیں۔ کہ بعض امور انسان کی سمجھ سے بالاتر ہوتے ہیں۔ لیکن جو لوگ انبیاء پر ایمان لاتے ہیں۔ وہ حُسن ظن۔ صبر اور استقلال سے ایک وقت کا انتظار کرتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ اُن پر اصل حقیقت کو کھول دیتا ہے۔ حضرت نبی کریمؐ کے وقت صحابہؓ سوال نہ کرتے تھے۔ بلکہ منتظر رہتے تھے۔ کہ کوئی اور شخص آکر سوال کرے تو وہ فائدہ اُٹھاتے تھے۔ ورنہ خود خاموش سر تسلیم خم کئے ہوئے بیٹھے رہتے تھے۔ اور سوال کرنے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ میرے نزدیک اصل اور اسلم طریق یہی ہے۔ کہ ادب کرے۔ جو شخص اداب النبی کو نہیں سمجھتا۔ اور اسے اختیار نہیں کرتا۔ اندیشہ ہوتا ہے۔ کہ وہ ہلاک نہ کیا جائے۔ وہ لوگ بڑی غلطی پر ہیں۔ جو ایک ہی دن میں حق الیقین کے درجہ پر پہنچنا چاہتے ہیں۔ یاد رکھو۔ کہ ایک ظن ہوتا ہے اور ایک یقین۔ ظن صرف خیالی بات ہوتی ہے۔ اور اُسکی صحت اور سچائی پر کوئی حکم نہیں ہوتا۔ بلکہ اس میں احتمال کذب کا ہوتا ہے۔ لیکن یقین میں ایک سچائی کی روشنی ہوتی ہے۔ اور یہ ایک سچی بات ہے۔ کہ یقین کے

بھی مدارج ہیں۔ ایک علم الیقین ہوتا ہے۔ پھر عین الیقین اور تیسرا حق الیقین۔ جیسے دور سے ایک انسان دھواں دیکھتا ہے۔ تو اُسے آگ کا یقین ہو جاتا ہے۔ اس کا نام علم الیقین ہے۔ پھر جب جا کر آگ کو دیکھ لیتا ہے تو وہ عین الیقین کا درجہ ہے۔ لیکن جب ہاتھ ڈال کر اُسے معلوم کر لیتا ہے۔ کہ وہ جلاتی ہے۔ تو اُسے حق الیقین ہو جاتا ہے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں۔ جن کی ابھی ظن سے مخلصی نہیں ہوئی۔ جب کہ سنت اللہ اسی طرح پر ہے۔ کہ مامور جو خدا تعالیٰ کی طرف سے آتے ہیں اُن کے ساتھ ابتلا ضرور ہوتے ہیں۔ پھر میں کیونکر بغیر ابتلاؤں کے آسکتا تھا۔ اگر ابتلا نہ ہوتے۔ تو آنحضرتؐ بنی اسرائیل میں سے آجاتے۔ تاکہ اہل کتاب کو یہ کہنے کا موقع ہی نہ ملتا۔ کہ آنے والے کیلئے لکھا ہے۔ کہ وہ تیرے بھائیوں میں سے ہوگا۔ اور اسی طرح پر حضرت مسیحؑ کے وقت ایلیا آسمان سے آجاتا۔ تاکہ اُن کو ٹھوکر نہ لگتی۔ اس بارہ میں ایک یہودی فاضل نے ایک کتاب بھی لکھی ہے جس میں وہ لکھتا ہے۔ کہ ہمارے بچاؤ کیلئے یہی کافی ہے کہ ایلیا آسمان سے نہیں آیا۔ اگر خدا ابھی قیامت کے دن ہم سے پوچھیگا۔ کہ ہم نے کیوں مسیح کو قبول نہ کیا۔ تو ہم ملاکی نبی کی کتاب پیش کر دینگے جس میں لکھا ہے۔ کہ مسیحؑ کے آنے سے پہلے ایلیا آسمان سے نازل ہوگا۔ حالانکہ مسیحؑ سے اس قدر معجزات صادر ہوئے بیان کئے جاتے ہیں۔ کہ وہ مردوں تک کو زندہ کر دیا کرتے تھے۔ پھر اپنی صداقت کے ثبوت میں ایلیا کو بھی زندہ کر کے پیش کر دیتے تم لوگ ایمان سے بتاؤ۔ کہ اُن لوگوں کیلئے ایلیا کا ابتلا بڑا تھا۔ جس نے حضرت مسیحؑ کو صلیب پر چڑھا دیا۔ یا نمازوں کے جمع کرنے کا ابتلا۔ اب اس قدر لوگ جو حضرت مسیحؑ اور حضرت نبی کریمؐ سے ایلیا کی آمد کے ابتلا کے باعث منکر رہے۔ یہ بڑا بھاری ابتلا تھا۔ اس لئے مومن کو ان امور پر غور کرنا چاہیئے۔ کہ ابتلاؤں کا آنا ضروری ہے۔ لیکن سچے مومن ایسے ابتلاؤں سے ضائع نہیں کئے جاتے۔ بلکہ ان سے وہ ایمان میں ترقی کرتے ہیں۔ معمولی معمولی ابتلاؤں پر ٹھوکر کھا جانے والے لوگوں نے کسی نبی کے زمانہ میں بھی فائدہ نہیں اُٹھایا۔ نہ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں اور نہ آنحضرتؐ کے زمانہ میں۔

میں نے عام طور پر شائع کیا۔ کہ مجھے خدا تعالیٰ کی طرف سے استجابت دعا کا نشان دیا گیا ہے۔ جو مخالف چاہے میرے مقابلہ پر آئے۔ لیکن آجتک کوئی شخص میرے مقابل پر نہیں آیا۔ پھر میں نے اعلان کیا کہ جو شخص مجھے حق پر نہیں سمجھتا وہ میرے ساتھ مباہلہ کرلے۔ اسکے علاوہ میں نے یہ بھی شائع کیا۔ کہ قرآن کریم کے حقائق و معارف کا نشان مجھے دیا گیا ہے۔ اس میں

کوئی مخالف میرا مقابلہ کرکے دیکھ لے۔ لیکن ان مخالفین میں سے ایک شخص کو بھی میرے سامنے آنیکی جرأت نہ ہوئی۔ کہ وہ میری دعوت کو قبول کرتا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے بشارت دی ہے۔ کہ ینصرک اللہ فی مواطن۔ جس کی سچائی کے ثبوت میں مجھے ہر میدان میں اُس نے کامیاب کیا۔ پس اگر ان کھلے کھلے نشانات سے کوئی شخص فائدہ نہیں حاصل کرتا۔ اور ان سے اس کی تسلی نہیں ہوتی۔ تو پھر اُسے چاہیئے۔ کہ کسی اور کے پاس جائے۔ یا مثلاً کسی عیسائی کے پاس جاکر اپنی تسلی کرلے۔ اگر کرسکتا ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے۔ کہ سچائی کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ تسلی حاصل کرنا مشکل ہے۔ فماذا بعد الحق الا الضلال ایسے لوگ لا من الاحیاء ولا من الاموات کے مصداق ہوتے ہیں۔ غرض نمازوں کے جمع کرلینے میں یہی راز اور سر تھا اور انسان کی نیتوں کا حال تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ انما الاعمال بالنیات۔ کہ آیا نمازوں کا جمع کرنا سستی اور کاہلی کی وجہ سے تھا۔ یا کسی معقول اور مبارک وجہ سے۔ خوب یاد رکھو۔ کہ نشانات دیکھ لینے کے بعد بھی اگر کسی شخص کو شک و شبہ گذر سکتا ہے۔ تو اُسے بہت ڈرنا چاہیئے۔ کیونکہ شیطان عدو مبین ہے۔ جس راہ کی طرف میں بُلانا چاہتا ہوں۔ یہ وہ راہ ہے۔ جس پر چل کر مومن غوثیت اور قطبیت کا مقام حاصل کرسکتا ہے۔ اور ان لوگوں پر جو میرے کہنے پر عمل کرینگے اور مجھے قبول کرینگے۔ اُن کیلئے دین و دنیا کے بڑے بڑے انعامات کا وعدہ ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرما چکا ہے۔ وجاعل الذین اتبعوک فوق الذین کفروا الی یوم القیامۃ اور فی الحقیقت وہ زمانہ قریب ہے۔ جبکہ میرے پیروؤں کو اُمیت سے نکال کر اللہ تعالیٰ قوتِ بیان عطا کریگا۔ اور وہ منکروں پر ہر میدان میں غالب آجائینگے۔ لیکن جو شخص دلائل اور نشانات کو دیکھتا ہے۔ مگر پھر دیانت۔ امانت اور انصاف کو ہاتھ سے چھوڑتا ہے۔ تو اُسے قرآن کا حکم یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ من اظلم ممن افتری علی اللہ کذبا او کذب بآیاتہ تم لوگ میرے بہت سے نشانات دیکھ چکے ہو۔ اور حروف تہجی کے طور پر اگر ایک نقشہ طیار کیا جائے۔ تو نشانات سے کوئی حرف بھی باقی نہیں رہیگا۔ بلکہ ایک ایک حرف میں کئی کئی نشانات آجائینگے۔ تریاق القلوب میں بہت سے نشانات جمع کردیئے گئے ہیں۔ جن کو تم نے اپنی آنکھوں سے پورے ہوتے دیکھ لیا ہے۔ اب وقت ہے کہ تمہارے ایمان خوب مضبوط ہوں۔ اور کوئی زلزلہ اور آندھی تمہیں اپنی جگہ سے ہلا نہ سکے۔ تم میں سے بعض لوگ ایسے صادق ہیں۔ کہ اُنہوں نے اپنے لئے کسی نشان کی ضرورت نہیں سمجھی۔ گو خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے ان کو

بہت سے نشانات دکھا دیئے۔ لیکن اگر ایک بھی میرے ساتھ نہ ہوتا۔ تب بھی وہ مجھے صادق یقین کرتے۔ اور میرے ساتھ تھے۔ چنانچہ مولوی نورالدین صاحب کبھی کسی نشان کے طالب نہیں ہوئے۔ اُنہوں نے میرا دعویٰ سنتے ہی آمنّا کہدیا۔ اور فاروقی ہو کر صدیقی عمل کر لیا آثار میں لکھا ہے۔ کہ جب نبی کریمؐ نے رسالت کا دعویٰ کیا تو ابوبکرؓ شام کی طرف تجارت کیلئے گئے ہوئے تھے۔ واپسی پر راستہ میں ہی اُنہیں آنحضرتؐ کے دعوے نبوت کی خبر ملی۔ تو آپ نے اُسی وقت اُسے قبول کر لیا۔

(حضرت مسیح موعودؑ نے اتنی تقریر فرمائی تھی۔ کہ مولانا مولوی نورالدین صاحب جوش اور صدق کے نشہ میں سرشار ہو کر اُٹھے اور عرض کیا کہ میں اس وقت حاضر ہوا ہوں۔ کہ چونکہ حضرت عمرؓ نے بھی حضرت نبی کریمؐ کے حضور رضیت باللہ ربا وبمحمد نبیا کہہ کر اقرار کیا تھا۔ میں بھی اس وقت آپ کے روبرو وہی اقرار کرتا ہوں۔ کہ مجھے کبھی حضورؑ کے متعلق ذرا سا شک و وہم بھی نہیں گذرا۔ اور یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ مجھے یہ بخوبی معلوم ہے۔ کہ بہت سے مصالح ایسے ہوتے ہیں۔ جن کا ہمیں علم نہیں دیا جاتا۔ اس لئے میں نے ہمیشہ اسے آداب نبوت کے خلاف سمجھا ہے کہ کبھی کوئی سوال اس قسم کا کروں۔ میں آپ کے حضور اقرار کرتا ہوں۔ رضیتُ باللہ ربا وبک مسیحًا ومھدیًا) (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۴۴)

۴ ردسمبر ۱۹۰۶ء ۔ بعد نماز مغرب حضرت مسیح موعودؑ نے حسب ذیل تقریر فرمائی۔ ایک بہت ہی ضروری امر ہے۔ جو میں آپ لوگوں کے سامنے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ میری طبیعت ابھی اچھی نہیں ہے۔ لیکن چونکہ کل نواب محمد علی صاحب جانے والے ہیں۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا۔ کہ میں چند امور بیان کر دوں۔ تاکہ وہ بھی سُن لیں۔ اور جماعت کے دوسرے لوگ جو یہاں حاضر ہیں۔ وہ بھی سُن لیں۔ اور وہ امور یہ ہیں۔ کہ تمام انبیاءؑ جو دنیا میں آتے رہے ہیں۔ وہ خدا کے تمام احکامات مبسوط اور مطول طور پر دنیا کو پہنچاتے رہے۔ اور ساتھ ہی اس کے اُنہوں نے بہت سی جزئیات بھی بیان کر دیں۔ اور تمام قسم کی ہدایات دربارہ توحید۔ تہذیب معاملات و معاد نہایت تفصیل سے بیان کر گئے۔ یا بالفاظ دیگر جسقدر امور انسانوں کی دینی دنیاوی بہتری کے تھے۔ ان کے متعلق ہر قسم کی ہدایات و تعلیمات دنیا میں چھوڑ گئے۔ زمانہ اور واقعات کے لحاظ سے ان کی تعلیمات میں قدرے جزئی اختلاف رہا ہے۔ لیکن باوجود ان جزئی اختلافات کے ہر ایک نبی کی اصلی غرض اور مقصد یہ رہا ہے۔ کہ لوگ گناہوں سے نجات پا کر اور ہر قسم کی بدیوں اور بدکاریوں سے نفرت کر کے خدا ہی کیلئے

ہو جائیں۔ اگر نظرِ غور سے دیکھا جائے۔ تو معلوم ہو جائیگا۔ کہ انسانی پیدائش کی بھی اصل غرض اور مقصد یہی ہے۔ کہ جملہ انسان خدا کے ہی ہو جائیں۔ انہی وجوہات سے انبیاء کی بعثت کی غرض انسانوں کو اسی مقصد کی طرف رہبری کرنا ہوتی ہے۔ تاکہ وہ اپنے گم شدہ متاع اور مقصد کو پھر حاصل کر لیں۔ اگرچہ گناہ کی بہت سی اقسام ہیں اور اس کے بہت سے شعبے اور شاخیں ہیں۔ یہاں تک کہ ادنیٰ قسم کی غفلت بھی گناہ میں داخل ہے۔ لیکن سب گناہوں سے بڑا گناہ جو انبیاء کے اس مقصد عظیم کے مقابل انسانوں کو اصل مقصد سے ہٹانے کیلئے راستہ میں پڑا ہوا ہے۔ وہ شرک کا گناہ ہے۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ انسانوں کی پیدائش کی اصل غرض و مقصد یہ ہے۔ کہ وہ خدا کیلئے ہی ہو جائیں۔ اور ہر قسم کے گناہوں اور اُن کے محرکات سے بالکل دور رہیں۔ لیکن بد قسمت انسان اپنی غفلت سے گناہ میں گرفتار ہو جاتا ہے اور جوں جوں وہ اس میں ترقی کرتا جاتا ہے۔ اسی قدر اپنے اصلی مدعا یعنی خدا تعالیٰ کے قرب سے دور ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ آخر کار اس سفلی جگہ میں جا گرتا ہے۔ جو جملہ مصائب۔ تکالیف۔ مشکلات اور ہر قسم کے دُکھوں کا گھر ہے۔ جسے جہنم کہا جاتا ہے۔ دیکھو اگر ایک انسان کا کوئی عضو مثلاً بازو یا انگلی یا انگوٹھا اپنی اصلی جگہ سے ہٹ جائے۔ تو کس قدر کرب و دُکھ پیدا ہوتا ہے۔ یہ جسمانی نظارہ روحانی اور آخری عالم پر ایک زبردست دلیل ہے۔ گناہ کی تعریف یہی ہے۔ کہ انسان اس مقصد سے جو فطرتاً اس میں رکھ دیا گیا ہے۔ دور ہٹ جائے۔ اور دور ہٹنے کا نتیجہ لازمی طور پر دردیں مبتلا ہونا ہے۔ دیگر گناہوں سے بڑھکر شرک ایک ایسی چیز ہے۔ جو انسان کو اس کے اصل مقصد سے ہٹا کر جہنم کا وارث بنا دیتا ہے۔ شرک کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ موٹا اور ظاہری شرک ہے جس میں ہندو۔ عیسائی یہود و دیگر بُت پرست لوگ گرفتار ہیں۔ جنہوں نے کسی انسان۔ پتھر یا کسی بے جان چیز یا قوت و خیالی دیووں اور دیوتاؤں کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔ گو اس قسم کا شرک ابھی تک دنیا میں موجود ہے۔ لیکن موجودہ روشنی اور تعلیم کے زمانہ میں عقلمند لوگ اس قسم کے شرک کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے جا رہے ہیں۔ یہ جدا امر ہے۔ کہ ایسے لوگ صرف اپنے قومی مذہب کی حیثیت کو مدِ نظر رکھ کر ایسی بیہودگیوں کا بظاہر اقرار کریں اور ان کی رکیک تاویلات سے اپنے دلوں کو طفل تسلیاں دینے کی کوشش کریں۔ لیکن دراصل بالطبع آجکل لوگ ایسے شرکوں سے متنفر ہوتے جاتے ہیں۔

اس ظاہری اور موٹے شرک کے علاوہ آجکل ایک قسم کا مخفی شرک ترقی کر رہا ہے

جو اندر ہی اندر لوگوں میں زہر کی طرح اثر کر رہا ہے۔ اور روز افزوں ترقی پر ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ بجائے اللہ تعالیٰ پر کامل اعتماد اور بھروسہ کرنے کے دنیاوی اسباب پر اعتماد و بھروسہ رکھا جاتا ہے۔ ہم یہ ہرگز نہیں کہتے۔ اور نہ یہ ہمارا مذہب ہے۔ کہ اسباب کی رعایت بالکل نہ کی جائے نہیں بلکہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے رعایت اسباب کی انسان کو ترغیب دی ہے۔ اور اس حد تک جہاں تک کہ یہ رعایت ضروری ہے۔ اگر رعایت اسباب نہ کی جائے۔ تو یہ اللہ تعالیٰ کے ایک عظیم الشان فعل کی توہین اور قوائے انسانی کی بے حرمتی کرنا ہے۔ کیونکہ اگر ان قوائے جسمانی و ذہنی سے بالکل کام نہ لیا جائے۔ جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا کئے ہیں۔ اور ان کو بالکل ردی اور بیکار چھوڑ دیا جائے۔ تو اس کے یہ معنی ہونگے۔ کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے فعل کو لغو اور عبث قرار دیا ہے۔ جو اس نے ہمیں قوا عطا فرمائے۔ اور ہمارے نزدیک یہ ایک بڑا گناہ ہے۔ پس ہمارا یہ منشا اور مذہب ہرگز نہیں۔ کہ اسباب کی رعایت بالکل نہ کی جائے۔ بلکہ ہمارا مذہب یہ ہے۔ کہ جائز حد تک اسباب سے کام لینا نہایت ضروری ہے۔ آخرت کے سکھ کے حصول کے لئے بھی اسباب سے ہی کام لینا پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری۔ بدیوں سے بچنا۔ اور نیکیوں کو اختیار کرنا اسی لئے ہے۔ کہ اس جہان اور دوسرے جہان میں انسان کو آرام نصیب ہو۔ گویا یہ نیکیاں اسباب کے قائمقام ہیں۔ اسی طرح پر اللہ تعالیٰ نے دنیاوی ضروریات کے پورا کرنے کے لئے اسباب کو اختیار کرنے سے منع نہیں فرمایا۔ نوکری کرنے والا نوکری کرے۔ زمیندار زمینداری کرے۔ مزدور مزدوری کرے۔ تاکہ وہ اپنے اہل و عیال و اطفال و دیگر متعلقین اور خود اپنے نفس کے حقوق کو ادا کر سکے۔ پس ایک جائز حد تک اسباب سے کام لینا درست ہے۔ اور اس سے ممانعت نہیں لیکن حد سے تجاوز کر کے صرف اسباب پر ہی بھروسہ کر لینا اور سارے امور کا دارومدار اسباب پر ہی رکھ لینا شرک ہے۔ جو انسان کو اس کے اصل مقصد سے دور پھینک دیتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اگر فلاں بیٹا ہوتا تو وہ بھوکا مر جاتا۔ یا اگر فلاں جائداد یا فلاں کام نہ ہوتا تو اسکا برا حال ہو جاتا اور فلاں دوست نہ ہوتا تو اسے بہت تکلیف ہوتی یہ باتیں اس قسم کی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہرگز پسند نہیں کرتا اور یہ نہیں چاہتا کہ انسان جائداد و دیگر اسباب پر اسقدر بھروسہ کرے۔ کہ خدا تعالیٰ سے بکلی دور جا پڑے۔ یہ خطرناک قسم کا شرک ہے۔ اور قرآن شریف کی تعلیم کے صریح خلاف ہے۔ جہاں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ وفی السماء رزقکم وما توعدون۔ پھر فرمایا۔ ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ اور پھر فرمایا من یتق اللہ یجعل لہ مخرجا ویرزقہ من حیث لا یحتسب اور پھر

وَھُوَ یَتَوَلَّی الصّٰلِحِیْنَ۔ غرض کہ قرآن شریف اس قسم کی تعلیم سے بھرا پڑا ہے کہ وہ متقیوں کا متولی اور متکفل ہوتا ہے۔ پھر ایسی صورت میں اگر ایک انسان دنیاوی اسباب پر ہی تکیہ اور توکل کرے تو اس کے یہ معنی ہوئے۔ کہ وہ خدا تعالیٰ کی ان صفات کا انکار کرتا ہے۔ اور ان اسبابوں کو ان صفات سے حصّہ دیتا ہے۔ اور اپنے لئے ایک اور خدا ان اسباب کا تجویز کرتا ہے۔ چونکہ اس طرح سے انسان خدا تعالیٰ کے خلاف ایک دوسرے پہلو کی طرف جھکتا ہے۔ تو گویا وہ شرک کی طرف قدم اُٹھاتا ہے۔ دنیا میں جو لوگ حکّام وقت کی طرف زیادہ جھکے ہوئے ہوتے ہیں اور اُن سے انعام وخطابات حاصل کر لیتے ہیں۔ اُن کے دلوں میں حکام کی ایک خاص عظمت پیدا ہو جاتی ہے جو خدا تعالیٰ کی سی ہوتی ہے۔ اور وہ ان احکام کے پرستار بن جاتے ہیں۔ جو امر کہ توحید کا استیصال کنندہ اور انسان کو اس کے اصلی مرکز سے ہٹا کر دور پھینک دینے والا ہے۔ اسلئے جملہ انبیاءؑ ہمیشہ یہی تعلیم دیتے ہیں۔ کہ دنیاوی اسباب اور توحید میں تناقض نہ ہونے پائے۔ بلکہ ہر ایک اپنے اپنے مقام پر رہے۔ اور مآل کار انسان توحید پر جا ٹھیرے۔ وہ انسان کو یہ سکھانا چاہتے ہیں کہ دنیا کے سارے آراموں اور حاجات براری کا متکفل صرف خدا ہی ہے۔ لیکن اگر خدا کے مقابلہ میں کسی اور چیز کو بھی قائم کیا جائے اور اس پر اتنا بھروسہ کر لیا جاوے۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دو ضدوں کے تقابل سے ایک اُن میں سے ہلاک ہو جائیگی۔ اس لئے ہر امر میں مقدم خدا تعالیٰ کی توحید ہونی چاہیئے رعایت اسباب میشک کی جائے۔ لیکن اسباب کو خدا نہ بنایا جائے۔ توحید پر قائم ہونے سے انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ سے ایک خاص محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ جب کہ انسان یہ سمجھتا ہے۔ کہ ہر قسم کا نفع اور نقصان اُسی ذات کے اختیار میں ہے اور وہی محسن حقیقی ہے اور دنیا کا ذرہ ذرہ اسی کا ہے۔ اور کوئی چیز اس کے اور انسان کے درمیان حائل نہیں۔ تو ایسی پاک حالت کے حاصل کر لینے پر انسان موحد کہلاتا ہے۔ حاصل مطلب یہ کہ توحید کی ایک حالت تو یہ ہے۔ کہ انسان پتھروں۔ انسانوں یا کسی دوسری چیز کو خدا نہ بنائے۔ بلکہ ان کو خدا کا شریک ٹھہرانے سے بیزاری اور نفرت کا اظہار کرے۔ اور دوسری حالت توحید کی یہ ہے۔ کہ رعایت اسباب سے نہ گذرے۔ پھر تیسری قسم کی توحید یہ ہے۔ کہ اپنے نفس اور وجود کے اغراض کو بھی درمیان سے اُٹھا دیا جائے۔ اور اسکی نفی کی جائے۔ ایسا اوقات انسان کے زیر نظر اپنی خوبی اور طاقت بھی ہوتی ہے۔ یعنی وہ یہ سمجھتا ہے۔ کہ فلانی کی اس نے اپنی طاقت سے حاصل کی ہے۔ اور اپنی طاقت پر ایسا بھروسہ کرتا ہے۔ اور پھر ہر کام کو اپنی ہی طاقت اور زور بازو کا نتیجہ سمجھتا

اور اسی کی طرف اسے منسوب کرتا ہے۔ لیکن انسان سچا موحد اسی وقت کہلا سکتا ہے۔ جب کہ وہ اپنی ان طاقتوں کی بھی نفی کر دے۔

لیکن اس جگہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جیسا کہ تجربہ دلالت کرتا ہے۔ انسان عموماً کوئی نہ کوئی حصہ گناہ کا اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ بعض لوگ موٹے اور جلی گناہوں میں مبتلا ہوتے ہیں اور بعض اوسط درجہ کے گناہوں میں اور پھر بعض باریک در باریک گناہوں کا شکار ہوتے ہیں۔ جیسے بخل۔ ریاکاری وغیرہ۔ اور جبتک انسان اُن سے رہائی حاصل نہ کرلے اپنے گم شدہ انوار کو حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لئے کونسا طریق اختیار کیا جائے۔ کہ انسان پورا پورا موحد کہلا سکے؟ سو اسبارہ میں یہ بات قابل غور ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بہت اقسام کے احکام دیئے ہیں۔ جنکی بجا آوری ہم پر لازم ہے۔ لیکن بعض اُن میں سے ایسے بھی ہیں۔ کہ انکی بجا آوری ہر ایک انسان کو میسّر نہیں ہوتی۔ مثلاً حج کی ادائیگی جو صرف اُس آدمی پر فرض ہے۔ کہ جسے استطاعت ہو۔ اور اس کیلئے راستہ کا امن ہو۔ اور اپنے پیچھے جو متعلقین چھوڑ جائے ان کے گذارہ کا بھی معقول انتظام ہو۔ جب اس قسم کی ضروری شرائط پوری ہو جائیں تب انسان حج کیلئے جا سکتا ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ ہے۔ اسے وہی شخص ادا کر سکتا ہے۔ جو صاحب نصاب ہو۔ اسی طرح نمازیں بھی شرائط ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ ایک بات ہے۔ جس میں کوئی تغیّر نہیں۔ اور وہ یہ ہے۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ جو سب باتوں کی جڑ اور اصل ہے۔ اور باقی جتنے امور ہیں۔ وہ اس کے مکمّلات ہیں۔ توحید کی تکمیل نہیں ہوتی۔ جب تک کہ عبادات کی بجا آوری نہ ہو۔ یعنی اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کہنے والا اپنے اس اقرار میں اسی وقت سچّا سمجھا جاتا ہے جبکہ وہ حقیقی طور پر عملاً ثابت کر دکھائے۔ کہ فی الحقیقت اس کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا محبوب مطلوب و مقصود نہیں۔ پھر جب اسکی یہ حالت ہو جائے۔ اور فی الواقع اسکا ایمانی اور عملی رنگ اس اقرار کو ظاہر کرنے والا ہو۔ تو اس وقت وہ خدا تعالیٰ کے حضور اپنے اس اقرار میں جھوٹا نہیں۔ کیونکہ اس کی ساری مادی خواہشات جل گئی ہیں۔ اور ایک فنا اُن پر طاری ہو کر سچّے دل سے اُس کے مُنہ سے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ نکلنے لگا ہے۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ جو کلمہ طیّب کا دوسرا جزو ہے۔ وہ صرف نمونہ بتانے کے لئے ہے۔ کیونکہ نمونہ اور نظیر بتا دینے سے ہر ایک بات نہایت سہل ہو جاتی ہے۔ انبیاء صرف نمونہ دکھاتے

. . . . . کیلئے آتے ہیں آنحضرتؐ جمیع کمالات کے نمونوں کے جامع تھے۔ کیونکہ جملہ انبیاء کے نمونے آپ میں جمع تھے۔ اسی لئے آپکا اسم مبارک محمدؐ تھا۔ جس کے معنے ہیں نہایت تعریف کیا گیا۔ محمدؐ وہ ہوتا ہے۔ جسکی تعریف زمین و آسمان پر ہوتی ہو۔ دنیا میں بہت سے ایسے نیک لوگ ہو گذرے ہیں۔ جن کو دنیا کے لوگوں نے نہایت حقارت کی نگاہ سے دیکھا۔ اور ذلیل سمجھا۔ اور بخیالِ خوبش اُنہیں ذلیل کیا۔ لیکن آسمان پر اُنکی عزت اور تعریف ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کے حضور راستباز ہوتے ہیں۔ اس کے خلاف بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ کہ دنیا ان کی تعریف کرتی ہے اور ہر طرف سے اُن کیلئے واہ واہ ہوتی ہے۔ لیکن آسمان اُن پر لعنت بھیجتا ہے۔ خدا۔ اس کے فرشتے اور مقرّب اُن پر لعنت بھیجتے ہیں اور اُن کی تعریف نہیں کرتے مگر ہمارے نبیؐ کریم زمین و آسمان پر ہر دو جگہ میں تعریف کئے گئے ہیں۔ اور یہ فخر صرف آپ کو ہی ملا ہے۔ پھر جسقدر پاک گروہ صحابہؓ کا حضرت نبی کریمؐ کو ملا وہ کسی دوسرے نبی کو نصیب نہیں ہوا۔ یوں تو حضرت موسیٰؑ کو بھی کئی لاکھ آدمیوں کی قوم مل گئی تھی۔ لیکن وہ ایسی مستقل مزاج۔ پاکباز اور عالی ہمت نہ تھی۔ جیسا کہ صحابہ کا گروہ تھا۔ حضرت موسیٰؑ کی قوم کا یہ حال تھا۔ کہ رات کو مومن ہیں تو دن کو مرتد۔ آنحضرتؐ اور حضرت موسیٰؑ کی اقوام کا مقابلہ کر لینے سے گویا کُل دنیا کی اقوام کا صحابہؓ سے مقابلہ ہو گیا۔ رسول کریمؐ کو جو قوم صحابہؓ کی ملی۔ وہ ایسی پاکباز خدا پرست اور مخلص تھی۔ کہ اسکی نظیر دنیا کی کسی قوم اور کسی دوسرے نبی کی اُمت میں سر گز نہیں ملتی۔ احادیث میں اُن کی بڑی بڑی تعریفیں آئی ہیں۔ آنحضرتؐ نے یہاں تک فرمایا کہ اَللّٰہُ اَللّٰہُ فِیْ اَصْحَابِیْ۔ اسی طرح قرآن شریف میں ان کی تعریف ہے یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا سِیْمَاھُمْ فِیْ وُجُوْھِھِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ تَرٰھُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا۔ حضرت موسیٰ کی جماعت اپنی خود پیدا کردہ جن جن مشکلات اور مصائب طاعون وغیرہ میں مبتلا ہوئی۔ حضرت نبیؐ کریم کی تیار کردہ جماعت ان سے ممتاز و محفوظ رہی اسی سے حضرت نبیؐ کریم کی قوت قدسی اور انفاس طیبہ اور جذب الی اللہ کی قوت کا پتہ لگتا ہے۔ کہ کیسی زبردست روحانی قوتیں آپ کو عطا کی گئی تھیں۔ جنہوں نے ایسا پاک اور جان نثار گروہ اکٹھا کر لیا۔ جہلا کا یہ خیال بالکل غلط ہے۔ کہ یونہی لوگ کسی کے ساتھ ہو جایا کرتے ہیں۔ لیکن سچی بات یہی ہے۔ کہ جب تک کسی انسان میں خاص قوت۔ جذب اور کششِ روحانی نہ ہو۔ ایسے جان نثار لوگ کبھی اس کے ہمراہ نہیں ہو سکتے۔ میرا مذہب یہی ہے

کہ آنحضرت کی قوت قدسی ایسی زبردست تھی۔ کہ جو دنیا میں کسی دوسرے نبی کو ہرگز نہیں دی گئی
اسلام کی ترقی کا راز یہی ہے کہ حضرت نبی کریم کی قوت جاذبہ نہایت زبردست تھی۔ اور آپکے
کلام میں وہ تاثیر تھی۔ کہ جو شخص سنتا تھا وہ آپ کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ جن لوگوں کو آپ نے اپنی
طرف کھینچا۔ ان کو ہر قسم کی الائشوں سے پاک وصاف کر دیا۔ اور ساتھ ہی اس کے آپ کی تعلیم ایسی
سیدھی سادی اور صاف تھی کہ اس میں مسئلہ تثلیث کی طرح کسی قسم کا گورکھ دھندا اور معمہ نہیں
چنانچہ نپولین کے بارے میں لکھا ہے۔ کہ وہ مسلمان تھا اور کہا کرتا تھا۔ کہ اسلام ایک نہایت ہی
سیدھا سادہ مذہب ہے۔ اور وہ تثلیث کی تکذیب کیا کرتا تھا۔ غرض آنحضرتؐ ایسا سیدھا سادہ
اور مدلل مذہب لائے۔ کہ جسے قبول کر کے انسان نہ تو خدا تعالیٰ کے روبرو شرمندہ ہو سکتا ہے اور نہ
کسی دوسرے انسان کے روبرو نیچا ہو سکتا ہے۔ یہ دین قانون قدرت اور فطرت انسانی کے
ساتھ ایسا وابستہ ہے۔ کہ ایک معمولی سے معمولی جنگلی آدمی بھی آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا
ہے۔ تثلیث کی طرح اس میں کوئی عقدہ لاینحل نہیں ہے۔ کہ جسے نہ تو خدا سمجھ سکے اور نہ اُسکے
ماننے والے۔ جیسا کہ پادری صاحبان کہتے ہیں۔ تثلیث پرستی کے قبول کرنے کیلئے ضروری ہے
کہ پہلے انسان بُت پرستی اور اوہام پرستی کرے اور عقل وفکر کی قوتوں کو بالکل بیکار اور معطل
چھوڑ دے۔ اس کے خلاف اسلام کی تعلیم توحید ایسی سیدھی سادی ہے۔ کہ دنیا سے الگ تھلگ
کسی جزیرہ میں بھی رہنے والوں کی سمجھ میں آسکتی ہے۔ یہ دین جو پادری صاحبان دنیا کے روبرو پیش
کر رہے ہیں۔ یہ کبھی عالمگیر اور کامل دین نہیں کہلا سکتا۔ اور نہ کوئی انسان اسے قبول کر کے اس سے
تسلی اور اطمینان پا سکتا ہے۔ مگر اسلام ایک ایسا دین ہے۔ جو کیا باعتبار توحید اور اعمال حسنہ کے
اور کیا بہ حیثیت تکمیل مسائل کے سب ادیان سے اعلیٰ وبرتر ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے ہمراہی یہودیوں
میں ہزارہا قسم کی بدکاریاں پائی جاتی تھیں۔ اور مسیحؑ کے حواریوں کا تو ذکر بھی نہ کرنا چاہیئے۔ کہ جن
میں سے ایک نے چند کھوٹے درہم لیکر اپنے آقا کو پکڑوا دیا۔ اور دوسرے نے لعنت بھیجی۔ اور کسی
نے بھی وفاداری کا نمونہ نہ دکھایا۔ ان کے مقابلہ میں جب ہم صحابہؓ کے حالات کو دیکھتے ہیں۔ تو ہمیں
اُن میں سے کوئی بھی جھوٹ بولنے والا نظر نہیں آتا۔ اور ان کے تصور میں بھی بجز روشنی اور نور کے
کچھ نظر نہیں آتا۔ حالانکہ اہل عرب کی ابتدائی حالت ایسی تاریک نظر آتی ہے۔ کہ گویا وہ تحت الثریٰ
میں پڑے ہوئے تھے۔ بت پرستی میں منہمک۔ یتامیٰ کا مال کھانے والے اور ہر قسم کی بدکاریوں
اور بداعمالیوں میں دلیر اور بیباک تھے۔ ڈاکہ زنی اور لوٹ مار پر گذارہ کرتے تھے۔ یعنی سر سے لیکر

پاؤں تک نجاست میں غرق تھے۔ اسلئے میں دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ کہ وہ کونسا اسم اعظم تھا۔ جس نے آناً فاناً ان کی کایا پلٹ دی۔ اور وہ نیکی کا ایسا اعلیٰ نمونہ بن گئے۔ کہ جن کی نظیر دنیا کی دوسری قوموں میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ اور ہرگز نہیں مل سکتی۔ حضرت نبی کریمؐ کا گروہ سوا کوئی بھی معجزہ پیش نہ کیا جائے۔ تو اس حیرت انگیز پاک تبدیلی کے مقابلہ میں کسی خود ساختہ خدا کا ہی ہمیں معجزہ دکھا دیا جائے۔ ایک انسان کی اصلاح کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ لیکن حضرت نبی کریمؐ نے تو ایک قوم کی قوم ایسی طیار کر دی۔ کہ جس نے اپنے ایمان اور اخلاص کا وہ نمونہ دکھایا کہ سچائی کی خاطر بھیڑ بکری کی طرح ذبح ہو گئے۔ حقیقت یہی ہے کہ وہ لوگ زمینی نہ رہے تھے۔ بلکہ حضرت نبی کریمؐ کی پاک تعلیم اور ہدایت اور صحبت نے ان کو آسمانی بنا دیا تھا اور ان میں قدسی صفات پیدا کر دی تھیں۔ دنیا کی خباثتوں اور ریاکاری سے وہ ایسے سُبک اور ہلکے پھلکے کر دیئے گئے۔ کہ اُن میں پرواز کی طاقت پیدا ہو گئی تھی۔ یہ وہ اسلام کا نمونہ ہے۔ جو ہم دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اسی اصلاح اور ہدایت کے سبب سے اللہ تعالیٰ نے حضرت نبی کریمؐ کا نام محمدؐ رکھا۔ جس سے زمین پر بھی آپ کی ستائش ہوئی۔ کیونکہ آپ نے زمین کو امن۔ صلحکاری۔ اخلاق فاضلہ اور نیکوکاری سے بھر دیا تھا۔ ×

میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں۔ کہ آنحضرتؐ کے جسقدر اخلاق دنیا پر ظاہر ہوئے۔ ایسے کسی دوسرے نبی کے ہرگز نہیں ہوئے۔ کیونکہ جب تک اخلاق کے اظہار کا موقع نہ ملے۔ کوئی اخلاق اخلاق نہیں کہلا سکتا۔ مثلاً سخاوت کو لیجئے۔ اگر ایک شخص کے پاس دولت ہی نہ ہو تو اس کی صفت سخاوت کا ظہور کیسے ہو سکتا ہے؟ اسی طرح اگر ایک شخص کو کبھی لڑائی کرنے کا موقعہ ہی نہ ملے۔ تو وہ اپنی صفت شجاعت کا اظہار کس طرح کر سکتا ہے۔ ایسا ہی جس شخص کو اقتدار ہی حاصل نہ ہو۔ وہ عفو کی صفت کا کس طرح سے اظہار کر سکتا ہے غرض جملہ اخلاق انسانی موقع اور محل سے وابستہ ہیں۔ حضرت نبی کریمؐ پر اللہ تعالیٰ کا کیسا خاص فضل تھا۔ کہ آپ کو اپنے جملہ اخلاق کے اظہار کے مواقع حاصل ہو گئے۔ حالانکہ حضرت عیسیٰؑ کو ایسے مواقع کبھی ملے ہی نہ تھے۔ آنحضرتؐ کی صفت سخاوت کا ظہور اس طرح پر ہوا۔ کہ ایک موقعہ پر آپؐ کے پاس بہت سی بھیڑ بکریاں تھیں۔ اسوقت ایک کافر نے کہا۔ کہ آپ کے پاس اسقدر بھیڑ بکریاں ہیں۔ کہ قیصر و کسریٰ کے پاس بھی اسقدر جمع نہیں ہیں۔ یہ بات سنتے ہی آپؐ نے وہ سب گلہ بھیڑوں اور بکریوں کا اس شخص کو دیدیا جسے دیکھکر وہ شخص فوراً مسلمان ہو گیا۔ بلکہ اس نے سمجھ لیا کہ ایسی بے عدیل سخاوت سوائے نبی کے اور دوسرا شخص

کبھی نہیں کرسکتا۔ پھر آپؐ کے عفو کا نمونہ اس وقت نظر آتا ہے۔ جبکہ فتح مکّہ کے وقت اپنے مخالفین پر پورا پورا اقتدار حاصل کرکے آپ نے سب کو کہدیا۔ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ اور سب پر رحم کرکے معاف کردیا۔ جسے دیکھ کر سب مخالفین اسلام میں داخل ہوگئے۔ کیا اس قسم کے اخلاق فاضلہ کا نمونہ ہمیں کسی دوسرے نبی میں بھی نظر آتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ مکّہ کے وہ لوگ جنہوں نے آپؐ کو اور آپؐ کے عزیزوں اور صحابہؓ کو سخت سے سخت تکالیف دی تھیں۔ اور ناقابل عفو شرارتیں کی تھیں۔ اُن کو آپؐ نے اقتدار اور قبضہ حاصل کرکے فوراً معاف کردیا۔ حالانکہ اگر اُن کو سخت سے سخت سزا دیجاتی۔ تو بھی بالکل انصاف اور عدل کا تقاضا تھا۔ لیکن آپؐ نے اپنے کمال عفو اور کرم کا نمونہ دکھایا۔ یہ وہ امور تھے۔ جن سے علاوہ معجزات کے صحابہؓ موثر ہوئے اور آپ کی تعریف میں رطب اللسان ہوگئے۔ اسلئے آپ اسم محمدؐ سے منسوب ہوگئے اور جس طرح زمین پر آپ کی حمد ہوتی تھی۔ اسی طرح آسمان پر بھی آپ کی تعریف ہوئی۔ اور آپ کا آسمانی نام محمدؐ رکھا گیا۔ یہ ایک نمونہ تھا۔ جو اللہ تعالیٰ نے دنیا کو عطا فرمایا۔ اس لئے جبتک انسان اپنے اندر اعلیٰ درجہ کے اخلاق فاضلہ پیدا نہ کرے۔ کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ اور اللہ تعالیٰ کی پاک محبت انسان اپنے اندر پیدا نہیں کرسکتا۔ جب تک کہ حضرت نبی کریمؐ کے اخلاق فاضلہ اور طرز عمل کو اپنا ہادی و رہبر نہ بنالے۔ چنانچہ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا: قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ یعنی محبوب الٰہی بننے کیلئے ضروری ہے۔ کہ حضرت رسول کریمؐ کی کامل اتباع کی جائے۔ اور کامل اتباع وہی کہلا سکتی ہے۔ جس میں اخلاق فاضلہ کا رنگ اپنے اندر پیدا کیا جائے۔ لیکن افسوس کہ آجکل کے مسلمانوں نے آپؐ کی اتباع سے مراد صرف رفع یدین۔ آمین بالجہر اور رفع سبابہ ہی لے لیا ہے۔ باقی جو امور اخلاق فاضلہ تھے ان کو چھوڑ دیا کرتے ہیں۔ ایک سچے مومن اور مخلص مسلمان کی روحانی ترقیات اور ایمانی مدارج کا آخری نقطہ یہی ہوتا ہے کہ وہ سچا متبع ہوجائے۔ اور آنحضرت کے جملہ اخلاق کو پورے طور پر حاصل کرلے۔ جو شخص سچائی کو قبول نہیں کرتا ہے وہ اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے۔ دنیا میں کروڑہا مسلمان موجود ہیں۔ اور اُن سے مساجد بھی بھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ لیکن کیا اتنی کثیر تعداد یا مساجد کے بھرا ہونے کے باوجود کوئی برکت اور غلبہ مسلمانوں میں نظر آتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ جو کچھ عبادت وغیرہ کی جاتی ہے وہ محض رسوم اور عادات کے طور پر بجالائی جاتی ہے وہ سچا اخلاص اور وفا جو ایمان کے حقیقی لوازم ہیں۔ ان لوگوں میں ہرگز نہیں پائے جاتے۔

بلکہ جملہ اعمالی ریاکاری اور نفاق کے پردوں کے اندر مخفی ہو گئے ہیں۔ جوں جوں ایک انسان ان لوگوں کے اندرونی حالات سے واقف ہوتا جاتا ہے۔ اتنا ہی ان کے اندر سے گند اور خبث نکلتا نظر آتا ہے۔ مساجد کو چھوڑ کر ان لوگوں کے گھروں میں جا کر دیکھو تو یہ سراسر ننگ اسلام نظر آئینگے۔ مثنوی مولانا روم میں ایک حکایت لکھی ہے۔ کہ ایک کوٹھا جس میں ہزار من گندم بھری ہوئی تھی بالکل خالی ہو گیا۔ اب غور کرنا چاہیئے۔ کہ اگر اسے چوہے نہیں کھا گئے۔ تو اتنی گندم کہاں گئی۔ پس مقام غور ہے۔ کہ پچاس پچاس سال نمازیں پڑھنے کے بعد بھی ان میں کسی قسم کی برکت نظر نہیں آتی۔ تو سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ کہ اگر ریا اور نفاق نے ان کے اعمال کو حبط اور باطل نہیں کر دیا۔ تو آخر وہ برکات کہاں گئیں۔ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں جیسے آثار ان سے مفقود ہیں۔ اور ان کے اعمال و عبادات میں کوئی نشانی برکت سماوی کی نہیں پائی جاتی۔ ایک طبیب جب ایک مریض کا علاج کرنا شروع کرتا ہے۔ اور اُسے نسخہ لکھکر دیتا ہے۔ تو اگر وہ نسخہ چند یوم کے تجربہ کے بعد اُس کی مرض کیلئے کارگر اور مفید نہ ہو۔ تو وہ اُسے بدل دیا کرتا ہے۔ اور پھر از سر نو تشخیص مرض کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن افسوس ہے۔ کہ ان مسلمانوں پر تو وہ نسخہ استعمال کیا گیا ہے۔ جو ہمیشہ سے زود اثر اور مفید ثابت ہوتا رہا ہے اس لئے سوائے اسکے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ کہ ان لوگوں نے اس کے استعمال میں غلطی اور بد پرہیزی کی ہو گی۔ کہ اس کا اثر ظاہر نہیں ہوا۔ اسی طرح ہم یہ تو ہرگز نہیں کہہ سکتے۔ کہ ارکانِ اسلام میں کسی قسم کی غلطی تھی۔ اور نماز۔ روزہ۔ حج زکوٰۃ روحانی امراض کا مؤثر علاج نہ تھے۔ کیونکہ اسی ایک نسخہ نے ایسے ایسے لاعلاج مریضوں کو کامل طور پر شفا دی ہے۔ جنکی نسبت لاعلاج ہونے کا فتویٰ دیا جا چکا تھا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ کہ جن لوگوں نے ارکانِ اسلام چھوڑ کر نئی نئی بدعتیں تراش لی ہوئی ہیں۔ یہ ان کی اپنی شامتِ اعمال ہے۔ ورنہ قرآن شریف تو فرما چکا تھا۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ یعنی اکمال دین تو ہو چکا تھا۔ اور اتمام نعمت بھی ہو گیا تھا اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ دین اسلام ٹھہر چکا تھا۔ لیکن ان نام نہاد پیروں اور مسلمانوں نے حضرت نبی کریم کا اسوہ حسنہ چھوڑ کر اپنے نئے طریقے ایجاد کر لئے۔ اور قرآن شریف کو تلاوت کرنے اور اس پر عمل کرنے کی بجائے دیگر وظائف اور کافیوں کا رواج شروع کر دیا اعمال صالحہ

اور اخلاق فاضلہ کی بجائے ذکر و اذکار کر لینا کافی ٹھیرا دیا۔ یہ جملہ امور لذت روح کے لئے نہیں بلکہ لذتِ نفس کی خاطر ہیں۔ کیونکہ لذتِ روح تو اُنہیں اعمال و افعال کے بجالانے سے مل سکتی ہے۔ جن کی تعلیم اور تلقین حضرت نبی کریم نے فرمائی۔ لوگوں نے لذتِ نفس اور لذتِ روح میں فرق نہیں سمجھا۔ اور غلطی سے دونوں کو ایک ہی سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ یہ دو مختلف چیزیں ہیں۔ اگر لذت نفس اور لذتِ روح ایک ہی چیز ہے۔ تو میں پوچھتا ہوں کہ جن بدمعاش اور بدچال چلن لوگوں کو ایک بدکار کنچنی کے گانے سے بہت لذت حاصل ہوتی ہے۔ کیا اس لذت کی وجہ سے اُنہیں عارف باللہ اور کامل انسان کہا جا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ جن لوگوں نے خلاف شرع اور خلاف پیغمبر نئی نئی راہیں نکالی ہیں۔ اُن کو یہی دھوکا لگا ہے کہ وہ نفس اور روح کی لذت میں فرق نہیں کر سکے۔ ورنہ وہ ان خلاف شرع بیہودگیوں میں روح کی لذت اور اطمینان پانے کی کوشش نہ کرتے۔ اُن لوگوں کو نفس مطمئنہ ہرگز نہیں مل سکتا۔ جو قرآن شریف کو چھوڑ کر بلھے شاہ کی کافیوں میں روحانی لذت کے جویاں ہیں۔ یاد رکھو اور خوب یاد رکھو کہ روحانی لذت صرف قرآن شریف سے ہی حاصل ہو سکتی ہے (الحکم جلد ۶ ۲۷)

یہ لوگ اپنی شامت اعمال کو نہیں سوچتے۔ اور جملہ نیک اعمال جو حضرت نبی کریم سے ان کو ملے تھے ترک کر دیا۔ اور ان کی بجائے خود تراشیدہ درود و وظائف داخل کر لئے اور چند کافیوں کا حفظ کر لینا کافی سمجھ لیا۔ بلھے شاہ کی کافیوں پر وجد میں آجاتے ہیں۔ لیکن جہاں قرآن شریف پڑھا جا رہا ہو۔ یا اس کا وعظ ہو رہا ہو وہاں یہ لوگ بہت کم جاتے ہیں اور ایسی مجالس میں جہاں کافیاں پڑھی جاتی ہوں وہاں بڑی کثرت سے جمع ہو جاتے ہیں۔ نیکیوں کی طرف سے ایسی نیم رغبتی اور بے اعتنائی لیکن نفسانی اور شہوانی امور کی طرف ایسی توجہ صاف ظاہر کرتی ہے۔ کہ ان لوگوں نے لذت روح اور لذتِ نفس میں کوئی فرق نہیں سمجھا ہے عام طور پر دیکھا گیا ہے۔ کہ بعض لوگ مجالس رقص و سرود میں دیدہ دانستہ اپنی پگڑیاں اُتار کر سر ہلانا شروع کر دیتے ہیں۔ اور جہلا کے سامنے بڑے فخر سے اس بات کا اظہار کرتے ہیں۔ کہ فلاں میاں صاحب یا پیر صاحب کی مجلس میں بیٹھتے ہی وجد طاری ہو جاتا ہے۔ ان مسلمان پیروں اور گدی نشینوں میں اس قسم کی بدعتیں اور اختراعی مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ جن کا اسلام اور اسوۂ حضرت نبی کریم میں کوئی نام و نشان نہیں ملتا۔

اصل بات یہ ہے۔ کہ جن لوگوں نے نماز سے لذت و ذوق حاصل نہیں کیا۔ وہ

روحانی لذت اور اس کے ذوق سے بالکل محروم ہیں۔ اور وہ روح کی تسلی اور اطمینان کی حالت کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اور نہیں جانتے۔ کہ وہ سرور کیا ہوتا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر ہمیشہ تعجب ہوتا ہے کہ یہ لوگ مسلمان کہلا کر اس قسم کی بدعات جاری کرتے رہتے ہیں۔ اگر روح کی خوشی اور لذت کا سامان انہیں باتوں میں تھا۔ تو چاہیئے تھا۔ کہ حضرت نبی کریمؐ جو عارف تر بن اور اکمل ترین انسان دنیا میں تھے وہ بھی اس قسم کی کوئی تعلیم دیتے یا اپنے اعمال سے کچھ کر کے دکھا جاتے ہیں ان مخالفوں سے جن میں بڑے بڑے مشائخ۔ گدی نشین اور صاحب سلسلہ لوگ ہیں۔ یہ پوچھتا ہوں۔ کہ کیا حضرت رسولؐ خدا تمہارے ان درود و وظایف۔ چلہ کشیوں اور الٹے سیدھے لٹکنے کو بھول گئے تھے۔ اگر معرفت اور حقیقت شناسی یہی اصل ذرائع تھے۔ میں تعجب کرتا ہوں۔ کہ ایک طرف تو یہ لوگ قرآن شریف میں پڑھتے ہیں۔ کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ اور دوسری طرف اپنی نئی نئی ایجادوں اور بدعتوں سے اس تکمیل دین کو توڑ کر ناقص ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ ایک طرف تو یہ ظالم طبع لوگ مجھ پر افترا کرتے ہیں۔ کہ گویا میں ایسی مستقل نبوت کا دعویٰ کرتا ہوں۔ جو صاحب شریعت نبی حضرت محمدؐ کے سوا الگ نبوت ہے۔ مگر دوسری طرف یہ اپنے اعمال کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں کرتے۔ کہ ایسی نئی نئی ایجادات و بدعات کو دین میں داخل کر کے یہ لوگ خود جھوٹی نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ جبکہ شریعت اسلام کے ساتھ خلاف خدا و رسولؐ نئی نئی باتیں شامل کرنے سے خوف نہیں کرتے۔ اور اپنی طرف سے ایک نئی شریعت بنا رہے ہیں۔ اگر کسی شخص کے دل میں ذرا بھی انصاف اور خدا کا خوف ہو۔ تو وہ انصاف سے بتائے۔ کہ کیا ہم رسولؐ اللہ کی پاک تعلیم اور اعمال پر کچھ کمی بیشی کرتے ہیں؟ جبکہ اُسی قرآن شریف کے عین مطابق ہم تعلیم دیتے اور حضرت نبی کریمؐ کو ہی اپنا سچا امام اور حکم مانتے ہیں۔ کیا ارّہ کا ذکر میں نے کسی کو بتایا ہے اور پاس انفاس و نفی و اثبات کے ذکر اور اس کے علاوہ اور قسم قسم کے اذکار و وظائف میں کسی کو سکھاتا ہوں۔ جب یہ بات نہیں اور ہرگز نہیں تو ہماری طرف کیوں دعویٰ نبوت منسوب کرتے ہیں۔ حالانکہ جھوٹی اور مستقل نبوت کا دعویٰ تو خود یہ لوگ کرتے ہیں۔ لیکن الزام ہم پر دیتے ہیں۔

یقیناً یاد رکھو اور خوب اچھی طرح سمجھ لو کہ کوئی شخص سچا مسلمان نہیں ہو سکتا اور آنحضرتؐ کا حقیقی متبع نہیں کہلا سکتا۔ جب تک کہ آنحضرتؐ کو خاتم النبیینؐ یقین نہ کرے اور جب تک ان محدثات و بدعات سے الگ نہ ہو جائے۔ جو لوگوں نے اپنی اپنی ہوائے نفسانی سے ایجاد کر رکھی

ہیں۔ اور اپنے قول اور فعل سے حضرت نبی کریم کو خاتم النبیین نہ مان لے۔ شیخ سعدیؒ نے کیا اچھا کہا ہے ؎

بر بد و دین ہزار کوشش و صدق و صفا ولیکن میفزائے بر مصطفےٰ ۴

ہمارا اصل مدعا جس کیلئے اللہ تعالیٰ نے ہمارے دل میں جوش ڈالا ہے یہی ہے کہ صرف اور صرف حضرت رسول کریم کی ہی نبوت قائم کی جائے۔ جو ابدالاباد کیلئے خدا تعالیٰ نے قائم کی ہے اور اس کے علاوہ تمام جھوٹی نبوتوں کو پاش پاش کر دیا جائے۔ جو ان لوگوں نے اپنی بدعتوں کے ذریعہ سے قائم کی ہیں۔ ان ساری گدیوں کو جا کر دیکھ لو۔ اور عملی طور پر مشاہدہ کر لو کہ کیا آنحضرتؐ کی ختم نبوت پر حقیقی طور پر ہم ایمان لائے ہیں یا یہ لوگ؟ یہ نہایت ظلم اور شرارت کی بات ہے۔ کہ ختم نبوت سے خدا تعالیٰ کا صرف اتنا ہی منشاء قرار دیا جائے۔ کہ منہ سے ہی خاتم النبیین مانو۔ اور کرتوتیں وہی کرو۔ جو تم خود پسند کرو۔ اور اپنی ایک الگ شریعت بنا لو۔ بغدادی نماز معکوس نماز وغیرہ ایجاد کر رکھی ہیں۔ کیا حضرت نبی کریم یا قرآن شریف میں ان نمازوں و بدعات کا کہیں پتہ لگتا ہے۔ اسی طرح یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ کہنا۔ کیا اس کا ثبوت کہیں قرآن میں ملتا ہے؟ آنحضرتؐ کے وقت تو شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا وجود بھی نہ تھا۔ پھر یہ وظیفہ کس نے بتایا تھا۔ شرم کرو کیا شریعت اسلام کی پابندی اور التزام اسی کا نام ہے؟ اب تم خود ہی فیصلہ کرو۔ کہ کیا ان باتوں کو مان کر اور ایسے اعمال رکھ کر تم لوگ اس قابل ہو۔ کہ مجھے الزام دو کہ میں نے خاتم النبیین کی مُہر کو توڑا ہے۔ اصل اور سچی بات یہی ہے کہ اگر تم اپنی مساجد اور اپنے اعمال میں ایسی ایسی بدعات کو داخل نہ کرتے اور حضرت خاتم النبیین کی سچی نبوت پر ایمان لا کر آپؐ کے طرز عمل اور نقش قدم کو اپنا امام و رہبر بنا کر چلتے۔ تو پھر میرے آنے ہی کی کیا ضرورت ہوتی؟ تمہاری ان بدعتوں اور نئی نبوتوں نے ہی خدا تعالیٰ کی غیرت کو تحریک دی۔ کہ رسول اللہؐ کی چادر میں ایک شخص کو مبعوث کرے۔ جو ان جھوٹی نبوتوں کے بُت کو توڑ کر نیست و نابود کرے۔ پس اسی کام کیلئے خدا تعالیٰ نے مجھے مامور کر کے بھیجا ہے۔ میں نے سُنا ہے۔ کہ غوث علی پانی پتی کے ہاں شاکت مت کا ایک منتر رکھا ہوا ہے۔ جس کا وظیفہ کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں آجکل کے گدی نشینوں اور پیروں کو سجدہ کرنا یا اُن کے مکانات کا طواف کرنا یہ تو بالکل معمولی اور عام باتیں ہیں۔ غرض اللہ تعالیٰ نے اس جماعت کو اس لئے قائم کیا ہے۔ کہ آنحضرتؐ کی نبوت اور عزت کو دوبارہ قائم کریں۔ ایک شخص جو کسی کا عاشق کہلاتا

ہے۔ اگر اس جیسے ہزاروں اور بھی ہوں۔ تو اس شخص کے عشق و محبت کی خصوصیت کیا رہے
اسی طرح اگر یہ لوگ حضرت رسول کریم کی محبت اور عشق میں فنا ہیں۔ جیسا کہ یہ دعویٰ کرتے
ہیں تو پھر یہ کیا بات ہے کہ ہزاروں قبروں اور مزاروں کی پرستش کرتے ہیں۔ مدینہ طیبہ تو
جاتے نہیں۔ مگر اجمیر اور دوسری خانقاہوں پر ننگے سر اور ننگے پاؤں جاتے ہیں۔ اور
پاک پٹن کی کھڑکی میں سے گذر جانا ہی نجات کیلئے کافی سمجھتے ہیں۔ کسی نے کوئی جھنڈا
کھڑا کر رکھا ہے۔ اور کسی نے کوئی اور صورت اختیار کر رکھی ہے ان لوگوں کے عرسوں
اور میلوں کو دیکھ کر ایک سچے مسلمان کا دل کانپ جاتا ہے کہ ان لوگوں نے اسلام کو کیا بنا
رکھا ہے۔ اگر خدا تعالیٰ کو اسلام کیلئے غیرت نہ ہوتی اور اِنَّ الَّذِیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ
اس کا کلام نہ ہوتا۔ اور پھر یہ نہ فرمایا ہوتا اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ
تو بیشک اسلام کی آج وہ حالت ہو گئی تھی۔ کہ اس کے مٹنے میں کوئی بھی شبہ نہیں ہو سکتا
تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی غیرت نے جوش مارا اور اسکی رحمت اور وعدہ حفاظت نے تقاضا
کیا۔ کہ رسول اللہ کے سر و کو پھر نازل کرے۔ اور اس زمانہ میں آپ کی نبوت کو نئے سرے
سے زندہ کر کے دکھائے۔ چنانچہ اس نے اس سلسلہ کو قائم کیا۔ اور مجھے مامور اور مہدی بنا کر
بھیجا۔ اس زمانہ میں دو قسم کے مشرک پیدا ہو گئے ہیں۔ جنہوں نے اسلام کو نابود کرنے کی بے حد
سعی کی ہے۔ اور اگر خدا تعالیٰ کا مفصل شامل حال نہ ہوتا تو قریب تھا۔ کہ خدا تعالیٰ کے برگزیدہ اور پسندیدہ
دین کا نام و نشان مٹ جاتا۔ مگر چونکہ اس نے وعدہ کیا ہوا تھا۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَہٗ
لَحٰفِظُوْنَ اور یہ وعدہ حفاظت چاہتا تھا۔ کہ جب اسلام پر غارتگری کا موقع آئے۔ تو وہ اس کی
خبر لے۔ چوکیدار کا کام ہے۔ کہ وہ نقب لگانیوالوں کو پوچھتے ہیں۔ اور جرائم پیشہ لوگوں کو جرم کرتے ہوئے
دیکھکر اپنا فرض منصبی بجا لاتے ہیں۔ اسی طرح پر چونکہ اس زمانہ میں فتن جمع ہو گئے تھے۔ اور اسلام
کے قلعہ پر ہر قسم کے مخالف اپنے اپنے ہتھیار باندھکر ہر طرف سے حملہ کرنے کو تیار ہو گئے تھے
اس لئے اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ منہاج نبوت قائم کرے۔ اسلام کی مخالفت کے یہ مواد
ایک عرصہ دراز سے پک رہے تھے۔ آخر کار اب پھوٹ نکلے۔ جیسے ابتداء میں نطفہ ہوتا ہے
اور پھر ایک عرصہ مقررہ کے بعد بچہ بن کر نکلتا ہے۔ اسی طرح پر اسلام کی مخالفت کے
بچے کا خروج ہو چکا ہے۔ جو اب بالغ ہو کر پورے جوش اور قوت میں ہے۔ اس لئے
اس کو تباہ کرنے کیلئے خدا تعالیٰ نے آسمان سے ایک حربہ نازل کیا اور اس مکروہ شرک کو

جو اندرونی اور بیرونی طور پر پیدا ہو گیا تھا۔ دور کرنے کیلئے اور پھر خدا تعالیٰ کی توحید اور جلال قائم کرنے کیلئے اس سلسلہ کو قائم کیا ہے۔ یہ سلسلہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اور میں بڑے دعویٰ اور بصیرت سے کہتا ہوں۔ کہ بیشک یہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اور اُسی نے اپنے ہاتھ سے اس کو قائم کیا ہے۔ جیسا کہ اُس نے اپنی تائیدوں اور نصرتوں سے جو اس سلسلہ کیلئے اُس نے ظاہر کی ہیں۔ دکھا دیا ہے۔ عادتہ اللہ اسی طرح پر جاری ہے۔ کہ جب بگاڑ حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اسکی اصلاح کیلئے کسی مصلح کو پیدا کر دیتا ہے۔ ظاہر نشان تو اس کے صاف نظر آ رہے ہیں۔ کہ صدی سے ۱۹ برس گذر گئے۔ اس لئے ایسا ایک دانشمند کیلئے مقام غور ہے۔ کہ اندرونی اور بیرونی فسادات حد سے بڑھ گئے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا ہر صدی کے سر پر مجدد کے مبعوث کرنے کا وعدہ الگ ہے۔ اور قرآن شریف اور اسلام کی حفاظت اور نصرت کا وعدہ الگ۔ زمانہ بھی حضرت نبی کریمؐ کے بعد حضرت مسیح کی آمد کے زمانہ سے پوری مشابہت رکھتا ہے۔ اور جو نشانات حضرت نبی کریمؐ نے اس موعود کے آنے کے مقرر کئے تھے۔ وہ پورے ہو چکے ہیں۔ تو پھر کیا اب تک بھی کوئی مصلح آسمان سے نہیں آیا؟ آیا اور ضرور آیا۔ اور خدا تعالیٰ کے وعدے کے موافق عین وقت پر آیا۔ لیکن اس کی شناخت کرنے کیلئے ایمان کی آنکھ کی ضرورت ہے (الحکم جلد ۶ ۲۸)۔

پھر ایک عقلمند کو اس کے ماننے میں کیا تامل ہو سکتا ہے۔ جب وہ ان تمام بیان کردہ امور کو بیجائی نظر سے دیکھیگا۔ اس وقت اس بات کے بیان کرنے سے میرا مدعا اور منشا یہ ہے۔ کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ سلسلہ قائم کیا ہے۔ اور اسکی تائید میں صدہا نشانات اُس نے ظاہر کئے ہیں۔ تو اس سے اسکی غرض یہ ہے۔ کہ یہ جماعت صحابہؓ کی جماعت ہو اور پھر خیر القرون کا زمانہ آ جاوے۔ جو لوگ اس سلسلہ میں داخل ہوں۔ چونکہ وہ آخرین منھم کی جماعت میں داخل ہوتے ہیں۔ اس لئے اُن کیلئے لازم اور نہایت ضروری ہے کہ وہ جھوٹے مشاغل کے کپڑے اُتار دیں اور اپنی ساری کی ساری توجہ خدا تعالیٰ طرف کریں۔ فیج اعوج (ٹیڑھی فوج) کے دشمن ہوں۔ اسلام پر تین زمانے گذرے ہیں۔ اوّل زمانہ خیر القرون ثلثہ۔ دوسرا اُس کے بعد فیج اعوج کا زمانہ جس کے بارے میں حضرت رسول کریمؐ نے فرمایا کہ لَیْسُوْا مِنِّیْ وَلَسْتُ مِنْھُمْ یعنی نہ وہ مجھ سے ہیں اور نہ میں اُن سے ہوں۔ پھر تیسرا زمانہ مسیح موعودؑ کا زمانہ ہے۔ جو رسول کریمؐ کے زمانہ سے ملحق ہے

بلکہ حقیقت میں یہ رسول اللہ کا ہی زمانہ ہے۔ فیج اعوج کا ذکر اگر رسول کریم نہ بھی فرماتے تو بھی قرآن شریف ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اور آیت واخرین منھم لما یلحقوا بھم صاف ظاہر کرتی ہے۔ کہ کوئی زمانہ ایسا بھی ہے۔ جو صحابہؓ کے مشرب کے خلاف ہے۔ اور واقعات بتا رہے ہیں۔ کہ اس درمیانی عرصہ ایک ہزار سال کے درمیان اسلام بہت سی مشکلات اور مصائب کا نشانہ بنا رہا ہے۔ اور معدودے چند کے سوا سب نے اسلام کو چھوڑ دیا اور بہت سے فرقے معتزلہ و اباحتی وغیرہ اس میں پیدا ہو گئے۔

اس بات کا ہمیں اعتراف ہے۔ کہ کوئی زمانہ اسلام پر ایسا نہیں گذرا۔ جس میں اسلام کی برکات کا نمونہ موجود نہ رہا ہو۔ لیکن وہ ابدال و اقطاب اور اولیاء اللہ جو اس درمیانی زمانہ میں ہو گذرے ہیں۔ ان کی تعداد اسقدر قلیل تھی۔ کہ ان کروڑوں انسانوں کے مقابلہ میں جو صراط مستقیم سے بھٹک کر اسلام سے دور جا پڑے تھے کچھ بھی چیز نہ تھے۔ اس لئے رسول کریمؐ نے نبوت کی آنکھ سے اس زمانہ کو دیکھا۔ تو اس کا نام آپ نے فیج اعوج رکھدیا۔ لیکن اب اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا ہے۔ کہ ایک اور گروہ کثیر کو پیدا کرے۔ جو صحابہؓ کا گروہ کہلائے مگر چونکہ قانون قدرت یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کے قائم کردہ سلسلہ میں تدریجی ترقی ہوا کرتی ہے اس لئے ہماری جماعت کی ترقی بھی تدریجی اور کزرع یعنی کھیتی کی طرح ہوگی۔ اور وہ مقاصد اور مطالب اس بیج کی طرح ہیں جو زمین میں بویا جاتا ہے۔ لیکن وہ مراتب اور مقاصد عالیہ جن پر اللہ تعالیٰ ہماری جماعت کو پہنچانا چاہتا ہے۔ ابھی بہت دور ہیں۔ اور وہ حاصل نہیں ہو سکتے۔ جبتک کہ ہماری جماعت میں وہ خصوصیت پیدا نہ ہو۔ جو اس سلسلہ کے قیام سے اللہ تعالیٰ کا منشا ہے۔ یعنی توحید کے اقرار میں بھی خاص رنگ ہو۔ تبتل الی اللہ ایک خاص رنگ کا ہو۔ ذکر الٰہی میں خاص رنگ ہو۔ اور حقوق اخوان بھی ایک خاص رنگ رکھتا ہو۔ تمام انبیاؑ کی بعثت کی غرض مشترک یہی ہوتی ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کی سچی اور حقیقی محبت لوگوں کے دلوں میں قائم کی جائے۔ اور بنی نوع انسان اور اخوان کے حقوق اور محبت میں ایک خاص امتیازی رنگ پیدا کیا جائے۔ اور جب تک یہ امور کامل طور پر ایک انسان میں نہ ہوں۔ وہ سب رسمی باتیں ہونگی۔ اللہ تعالیٰ کی محبت کے بارے میں تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن بعض اشیاء کا علم ہمیں بعض دیگر اشیاء سے بھی حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً ایک درخت کے نیچے اگر پھل گرے پڑے نظر آئیں تو کہہ سکتے ہیں۔ کہ اس درخت پر بھی پھل لگے ہوئے ہونگے۔

لیکن اگر اس کے نیچے کوئی پھل نظر نہ آئے تو اوپر کے پھلوں کے بارے میں بھی کوئی یقین نہیں ہو سکتا اسی طرح پر بنی نوع انسان اور اپنے بھائیوں کے ساتھ جو یگانگت اور محبت کا رنگ ہو۔ اور وہ اس اعتدال پر ہو۔ جو خدا تعالیٰ نے قائم کیا ہے۔ تو اس سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ بھی ضرور محبت ہونی چاہیئے۔ پس بنی نوع انسان کے حقوق کی نگہداشت اور بھائیوں کے ساتھ اچھے تعلقات اس بات کی بشارت دیتے ہیں۔ کہ خدا تعالیٰ کی محبت کا رنگ بھی اس میں ضرور ہے۔ دیکھو دنیا چند روزہ ہے اور آگے پیچھے سب لوگ مرنے والے ہیں۔ قبریں منہ کھولے ہوئے آوازیں مار رہی ہیں۔ اور ہر شخص اپنی اپنی نوبت پر اُن میں جا داخل ہوتا ہے عمر ایسی بے اعتبار اور زندگی ایسی ناپائیدار ہے۔ کہ چھ ماہ اور نو ماہ تک زندہ رہنے کی امید کیسی اتنی بھی امید اور یقین نہیں۔ کہ ایک قدم کے بعد دوسرا قدم اُٹھانے تک زندہ رہینگے یا نہیں۔ پھر جب یہ حال ہے کہ موت کی گھڑی کا علم نہیں۔ اور یہ پکی بات ہے کہ موت یقینی ہے۔ اور ٹلنے والی نہیں۔ تو دانشمند انسان کا فرض ہے۔ کہ ہر وقت اس کیلئے تیار رہے۔ اسی لئے قرآن شریف میں فرمایا گیا ہے۔ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ہر وقت جبتک انسان خدا تعالیٰ سے اپنا معاملہ صاف نہ رکھے اور ہر دو حقوق یعنی حق اللہ وحقوق العباد کی پوری تکمیل نہ کرے بات نہیں بنتی۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے۔ حقوق العباد بھی دو قسم کے ہیں۔ ایک ان لوگوں کے جو دینی بھائی ہو گئے ہیں۔ خواہ وہ اپنا حقیقی بھائی ہے یا باپ ہے یا بیٹا۔ لیکن اُن سب میں ایک دینی اخوت ہے اور دوسرے اُن لوگوں کے جو عام بنی نوع انسان ہیں۔ جن کے ساتھ سچی ہمدردی کرنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حقوق میں سب سے بڑا حق یہی ہے۔ کہ صرف اُسی کی عبادت کی جائے۔ اور یہ عبادت کسی ذاتی غرض پر مبنی نہ ہو۔ بلکہ اگر دوزخ اور بہشت نہ بھی ہوں۔ تب بھی اس کی عبادت کی جائے۔ اور اس ذاتی محبت میں جو مخلوق کو اپنے خالق سے ہونی چاہیئے کوئی فرق نہ آئے۔ اس لئے ان حقوق کی ادائگی میں دوزخ اور بہشت کا سوال نہیں ہونا چاہیئے۔ بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی کرنے میں میرا یہ مذہب ہے۔ کہ جبتک ایک دشمن کیلئے بھی دعا نہ کی جائے پورے طور پر سینہ صاف نہیں ہوتا ہے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ میں اللہ تعالیٰ نے کوئی قید نہیں لگائی۔ کہ دشمن کیلئے دعا کرو تو قبول نہیں کروں گا۔ بلکہ میرا تو یہ مذہب ہے کہ دشمن کیلئے بھی دعا کرنا سنت نبوی ہے۔ حضرت عمرؓ انہیں دعاؤں کے ذریعہ سے

مسلمان ہوئے۔ کیونکہ آنحضرتؐ آپ کیلئے اکثر دعائیں فرمایا کرتے تھے۔ اس لئے بخل کو کام میں لاکر کسی شخص کے ساتھ ذاتی دشمنی نہیں کرنی چاہیئے۔ اور فی الحقیقت موذی نہیں بن جانا چاہیئے۔ شکر کی بات ہے۔ کہ ہمیں اپنا کوئی دشمن نظر نہیں آتا۔ جس کیلئے دو تین مرتبہ دعا نہ کی ہو۔ مجھے تو ایک بھی یاد نہیں۔ اور یہی تعلیم میں تم کو بھی دیتا ہوں۔ کہ اللہ تعالیٰ اس بات سے کہ کسی شخص کو سخت ایذا پہنچائی جائے اور ناحق بخل کی راہ سے دشمنی کی جائے ایسا ہی بیزار ہے جیسا کہ وہ نہیں چاہتا۔ کہ کوئی اس کے ساتھ شریک ٹھیرایا جائے۔ ایک جگہ وہ فصل نہیں چاہتا اور ایک جگہ وصل نہیں چاہتا۔ یعنی بنی نوع انسان کا فصل اور اپنا کسی غیر کے ساتھ وصل۔ اور یہ سچی راہ ہے۔ کہ منکروں کیلئے بھی دعا کی جائے۔ کیونکہ اس سے سینہ صاف اور انشراح پیدا ہوتا ہے۔ اور ہمت بلند ہوتی ہے۔ اس لئے جبتک ہماری جماعت یہ رنگ اختیار نہیں کرتی۔ اس میں اور اس کے غیر میں پھر کوئی امتیاز نہیں ہے۔ میرے نزدیک یہ ضروری امر ہے کہ جو شخص ایک دوسرے شخص کیساتھ محض دین کیلئے دوستی کرتا ہے اور اس دوست کے عزیزوں میں کوئی ادنیٰ درجہ کا آدمی ہو تو اسکے ساتھ بھی نہایت رفق اور ملائمت کیساتھ پیش آنا چاہیئے اور اس سے بھی محبت کرنی چاہیئے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی یہ شان ہے ع بداں را بہ نیکاں بہ بخشند کرم۔ پس تم لوگ جو میرے ساتھ تعلق رکھتے ہو۔ تمہیں ایسی قوم بنجانا چاہیئے جس کے بارہ میں فرمایا گیا ہے فَاِنَّھُمْ قَوْمٌ لَا یَشْقٰی جَلِیْسُھُمْ یعنی وہ ایسی ہے کہ ان کا ہم جلیس بدبخت نہیں ہوتا۔ یہ خلاصہ ہے اس الٰہی تعلیم کا جو تخلقوا باخلاق اللہ میں پیش کی گئی ہے۔ (الحکم جلد ۶ ۲۹)۔

۹ دسمبر ۱۹۰۱ء۔ صبح کی سیر کے وقت حضرت مسیح موعودؑ نے فرمایا:۔ میں جو کام کرتا ہوں آسمانی اشارہ اور ربانی القاء سے کرتا ہوں۔ خدا تعالیٰ نے مجھ پر تجمع لہ الصلوٰۃ والی حدیث کی صحت کھول دی ہے۔ اور اب میں ہرگز کسی کی پرواہ نہیں کرسکتا۔ یہ آنحضرتؐ کی پیشگوئی ہے۔ جس کے پورا کرنے اور پورا کرانے سے ہمیں دوہرا ثواب ملتا ہے انما الاعمال بالنیات میں سچ سچ کہتا ہوں۔ کہ ان دو نمازوں کی بجائے حقیقت میں میں چار نمازیں پڑھتا ہوں اور اگر مخالفین کا خوف ہو۔ کہ وہ کیا کہینگے سو میں اس کی ہرگز پرواہ نہیں کرسکتا۔ مجھے ان سے کیا غرض۔ میں تو خدا تعالیٰ کی باتوں پر اور خدا تعالیٰ کے حکم پر چلتا ہوں۔ اور خدا تعالیٰ کی باتوں کو چھوڑ دینے سے میں اپنے لئے یہ بہتر سمجھتا ہوں۔ کہ میں قتل کردیا جاؤں۔ اور میرے ٹکڑے ٹکڑے کردیئے جائیں۔ میری زندگی کس کام کی ہوسکتی ہے۔ جب وہ خدا تعالیٰ کی کسی بات کو چھوڑ دے۔ پس میں ہرگز پرواہ نہیں کرتا۔ خواہ میرے پاس ایک آدمی بھی نہ رہے۔ لیکن میں خدا تعالیٰ کی

اُن باتوں کو جو خود اس نے مجھے فرمائی ہیں کبھی چھوڑ نہیں سکتا۔ اور میں اپنی جماعت کو کہتا ہوں۔ کہ یہ امر طریق ادب سے دور ہے۔ کہ مجھے حَکَم اور عَدَل مان کر پھر کوئی قبض دل میں ہو۔ اور یہ بھی یاد رکھو کہ میں کسی کی تعریف کرنے سے خوش یا مذمت کرنے سے ناراض نہیں ہوتا۔ دنیا کیا اور اُسکی تعریف و مذمت کیا۔ خدا تعالیٰ جب کہتا ہے ان اللہ یحمدک من العرش پھر مجھے کسی اور کی تعریف یا مذمت کی کب پرواہ ہو سکتی ہے۔ ہاں میں یہ بھی یقین رکھتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کا تعریف کرنا یہ بھی اسکا فضل اور احسان ہے۔ ورنہ وہ خدمت جو اسلام کی ہم کو کرنی پڑی ہے یہ سب تعریفیں رسول کریمؐ کیلئے ہی ہیں۔ نمازوں کا جمع کرنا ایک وقت تک کیلئے ہے۔ جب یہ عربی رسائل جو لکھے جارہے ہیں۔ ختم ہو جائینگے۔ پھر انشاء اللہ اپنے اوقات مقررہ پر ادا ہونے لگینگی۔ اور اس وقت بھی ہم شرح قلب اور انشراح صدر کے ساتھ ایسا کرتے ہیں۔ اور محض خدا تعالیٰ کے ایما کے مطابق (الحکم جلد ۵ ۴۵)۔

۲۲ دسمبر ۱۹۰۱ء منشی عبدالحق صاحب قصوری طالب علم بی۔ اے کلاس مشن کالج لاہور نے جو عرصہ تین سال سے عیسائی ہو چکے تھے۔ حضرت مسیح موعودؑ کی بعض تحریروں کو پڑھ کر آپ کی خدمت میں لکھا کہ وہ اسلام کی حقانیت اور صداقت کا ثبوت عملی رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ جس پر آپ نے ان کو لکھا تھا کہ اس مقصد کیلئے وہ کم از کم دو ماہ آکر آپ کے پاس رہیں چنانچہ اسی ارادہ سے وہ آج ظہر کے وقت قادیان میں پہنچے۔ **۲۳ دسمبر ۱۹۰۱ء** صبح اُن کی ملاقات حضرت مسیح موعودؑ سے ہوئی اور آپ باوجود ناسازیٔ طبع ۹ بجے باہر سیر کو تشریف لے گئے۔ اور ذیل کی گفتگو راستہ میں منشی عبدالحق صاحب سے ہوئی:۔

حضرت مسیح موعودؑ۔ آپ کو عیسائی ہوئے کتنا عرصہ گذرا۔ اور کیا اسباب پیش آئے تھے کہ آپ عیسائی ہو گئے؟۔

منشی عبدالحق صاحب۔ مجھے عیسائی ہوئے اس دسمبر میں پورے تین سال ہونگے۔ بعض عیسائی دوستوں سے میل ملاقات کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ مجھے عیسویت سے رغبت ہو گئی۔ پھر پادری ٹوٹن صاحب جو فیروزپور میں رہتے تھے وہ بڑی مہربانی سے پیش آتے تھے۔ ان کے اثر سے میں عیسائی ہو گیا۔

حضرت مسیح موعودؑ۔ یہ آپ نے بہت اچھا کیا کہ دو مہینے کیلئے یہاں آگئے۔ بظاہر یہ بات آپکی حق جوئی کی نشانی ہے؟

منشی عبدالحق صاحب۔ جناب میں کالج سے نام کٹوا کر آیا ہوں۔ کیونکہ رخصت نہ ملتی تھی۔

حضرت مسیح موعودؑ۔ یہ تو اور بھی ہمت کا کام ہے۔ میرے نزدیک بہتر اور مناسب طریق جو آپ کے لئے مفید ہو سکتا ہے یہ ہے۔ کہ آپ اُن اعتراضات کو جو آپ اسلام پر رکھتے ہیں اور آپ کے نزدیک نہایت اہم ہیں۔ سلسلہ وار لکھ لیں اور ایک ایک کر کے پیش کرتے رہیں۔ ہم انشاء اللہ تعالیٰ جواب دیتے رہیں گے۔ اس میں سے جس جواب سے آپ کی تسلی نہ ہو۔ اُسے آپ دوبارہ سہ بارہ پوچھ سکتے ہیں۔ اور جس بات میں تسلی نہ ہو۔ اس کے بارے میں صاف صاف کہدیں۔ کہ اس سے آپکا اطمینان نہیں ہوا۔ لیکن اس بات کا لحاظ رکھیں۔ کہ اعتراضات ایسے ہوں۔ جن کا کتب سابقہ میں نام و نشان نہ ہو۔ ورنہ تضیع اوقات ہوگا۔ جب آپ کے اعتراضات ختم ہو چکینگے۔ تو پھر ہم آپ کو اسلام کی خوبیاں بتائیں گے۔ کیونکہ تسلی کیلئے انہیں دو امور کی ضرورت ہے۔ ان میں سے ایک آپ کریں اور اس میں ہمیں مدد دیں۔ اور دوسرا ہم خود کر لینگے:۔

تبدیل مذہب کے عموماً دو باعث ہوتے ہیں۔ ان میں سے سب سے بڑا سبب وہ خبریات ہوتی ہیں۔ جن کو غلط فہمی اور غلط بیانی سے کچھ کا کچھ بنا دیا جاتا ہے اور اصول مذہب کو اس کے مقابلہ میں بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً اسلام کے بارے میں جب عیسائی لوگ کسی شخص سے گفتگو کرتے ہیں تو اسلامی جنگوں پر اعتراض شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ ایسے جنگوں کی نظیریں خود اُن کے اپنے گھر میں حضرت یوشع اور حضرت موسیٰؑ کی موجود ہیں۔ اور اگر ان کا مقابلہ اسلامی جنگوں سے کیا جائے۔ تو وہ زیادہ موردِ اعتراض ٹھیرتی ہیں۔ کیونکہ ہم اس بات کو ثابت کرنے کیلئے تیار ہیں۔ کہ اسلامی جنگ محض دفاعی تھے اور ان میں وہ شدت اور سخت گیری ہرگز نہ تھی۔ جو حضرت موسیٰؑ اور حضرت یوشعؑ کی جنگوں میں پائی جاتی ہے۔ اگر ہمارے معترضین یہ کہیں۔ کہ اُن کے جنگ عذاب الٰہی کے رنگ میں تھے۔ تو ہم کہتے ہیں۔ کہ پھر اسلامی جنگوں کو بھی کیوں عذاب الٰہی تسلیم نہیں کرتے موسوی جنگوں کی کیا فضیلت اور خصوصیت ہے؟ حالانکہ اسلامی جنگوں میں موسوی لڑائیوں کی نسبت بڑی بڑی رعایات دی گئی تھیں۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے۔ کہ چونکہ عرب لوگ نوامیس الٰہیہ سے بالکل ناواقف تھے۔ اسلئے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کے مخالفین کی نسبت اُن پر بڑا رحم فرمایا۔ کیونکہ وہ بڑا غفور رحیم ہے۔ پھر اسلامی جنگوں اور موسوی

جنگوں کا مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ اور آپ کے صحابہؓ کو اہل مکہ نے تیرہ ۱۳ سال تک برابر سخت سے سخت ایذائیں اور تکالیف دیں۔ طرح طرح کے دُکھ اُنہوں نے دیئے۔ کسی صحابہ کو قتل کیا گیا۔ اور بعض کو بڑے بڑے عذابوں کے ذریعہ سے مار ڈالا گیا جیسا کہ تواریخ سے ثابت ہے۔ یہاں تک کہ بچاری عورتوں تک کو نہایت شرمناک طریقوں سے عذاب دے دیکر مار ڈالا گیا۔ ایک صحابیہ کی دونوں ٹانگوں کو دو اونٹوں سے باندھ کر مختلف سمتوں کی طرف اُن کو دوڑا کر اُسے چیر ڈالا گیا۔ اس قسم کی ایذاؤں اور تکلیفوں کو حضرت نبی کریم اور آپ کے صحابہؓ نے برابر تیرہ سال تک نہایت صبر اور حوصلہ کے ساتھ برداشت کیا۔ لیکن مخالفین اپنی ایذا رسانیوں سے باز نہ آئے۔ آخر کار اُنہوں نے آپ کے قتل کا منصوبہ کیا۔ جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطلاع پاکر آپؐ مکہ سے مدینہ کو ہجرت کر گئے۔ لیکن مخالفین نے مدینہ تک آپکا تعاقب نہ چھوڑا۔ اور ایک بڑا لشکر لیکر مدینہ منورہ پر چڑھ آئے۔ جس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اُن کے حملوں کے روکنے کا حکم دیا۔ کیونکہ صبر کا پیالہ لبریز ہو چکا تھا۔ اور وقت آگیا تھا۔ کہ اہل مکہ کو ان کی شرارتوں اور شوخیوں کی پاداش میں عذاب الٰہی کا مزا چکھایا جائے۔ اور جس ذریعہ سے وہ مسلمانوں کو دُکھ دیتے ہیں۔ اُسی ذریعہ سے اُن کو سزا دی جائے۔ چنانچہ جیسا کہ خدا تعالیٰ نے آنحضرتؐ کے ذریعہ سے پہلے وعدہ کیا تھا۔ کہ اگر یہ لوگ اپنی شرارتوں سے باز نہ آئیں گے۔ تو عذاب الٰہی کے ذریعہ سے ہلاک کئے جائینگے۔ وہ وعدہ پورا کیا گیا۔ اسلامی جنگوں کی یہ وجوہات قرآن شریف میں صاف طور پر لکھی ہوئی ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ الخ یعنی ان لوگوں کو مقابلے کی اجازت دی گئی۔ جن کے قتل کیلئے مخالفوں نے چڑھائی کی۔ (اجازت اس لئے دی گئی) کہ اُن پر ظلم ہوا۔ اور خدا تعالیٰ مظلوم کی حمایت کرنے پر قادر ہے۔ یہ وہ مظلوم ہیں جو ناحق اپنے وطنوں سے نکالے گئے۔ ان کا گناہ بجز اس کے اور کوئی نہ تھا۔ کہ اُنہوں نے کہا۔ کہ ہمارا رب اللہ ہے یہ وہ آیت ہے جس کی بنا پر اسلامی جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ پھر ان جنگوں میں جسقدر رعائتیں دیکھو گے اُن کا شائبہ تک موسوی جنگوں میں نظر نہیں آتا۔ بلکہ موسوی اور یوشعی جنگوں میں لاکھوں بیگناہ بچوں کا مارا جانا۔ بوڑھے مردوں اور عورتوں کا قتل کیا جانا۔ باغات

اور درختوں کا جلا کر خاک سیاہ کر دیا جانا توراۃ سے ثابت ہے۔ اس کے خلاف اہل مکہ نے باوجود اس کے کہ مسلمانوں سے وہ سختیاں اور شرارتیں کی تھیں جن کی نظیر نہیں ملتی۔ لیکن آنحضرتؐ نے ان دماغی جنگوں میں بھی بچوں کو قتل نہ کرنے۔ عورتوں۔ بوڑھوں۔ راہبوں۔ کھیتوں اور باردار درختوں اور عبادت گاہوں کو برباد نہ کرنے کا سخت حکم دے رکھا تھا۔ اب ہر دو جنگوں کا مقابلہ کر کے دیکھ لو۔ کہ کونسی جنگیں انصاف پر مبنی تھیں۔ غرض اسلامی جنگوں پر اعتراض کرنا ایک بیہودگی ہے۔ اگر انسان فطرت سلیمہ رکھتا ہو تو وہ خود ہی ان کا مقابلہ کر کے حق و حقیقت کو پا سکتا ہے۔ کیا حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں اور خدا تھا۔ اور حضرت نبی کریمؐ کے زمانہ میں دوسرا جس طرح اسرائیلی انبیاؑ کے زمانہ میں شریر مخالف اپنی شرارتوں سے باز نہ آتے تھے۔ اُسی طرح آنحضرتؐ کے زمانہ کے مخالف بھی اپنی شرارتوں میں حد سے زیادہ دور نکل گئے تھے۔ پس اُسی خدا نے جو رؤف الرحیم بھی ہے۔ لیکن شریروں کو سزا دینے پر بھی قادر ہے ان جنگوں کے ذریعہ سے جو اُنہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے پیدا کی تھیں اُن کو سزا دی۔ حضرت لوطؑ کی قوم سے کیا سلوک ہوا۔ اور حضرت نوحؑ کے مخالفوں کا کیا انجام ہوا۔ پھر اگر اہل مکہ کو خدا تعالیٰ نے اس رنگ میں سزا دی تو اعتراض کی کونسی بات ہوئی۔ کیا انبیاؑ کے مخالفین کیلئے کوئی خاص عذاب مقرر ہے۔ کہ طاعون ہی ہو۔ یا اُن پر پتھر ہی برسائے جائیں۔ نہیں بلکہ جس قسم کا عذاب اللہ تعالیٰ چاہے دے سکتا ہے۔ اسی طرح قدیم سے سنۃ اللہ جاری ہے۔ پھر باوجود اس کے اگر کوئی ناعاقبت اندیش اعتراض کرے تو اُسے حضرت موسیٰ کے زمانہ اور ان کی جنگوں پر بہت سا اعتراض کا موقعہ مل سکتا ہے۔ جہاں اسلامی جنگوں کی رعایتوں کے مقابلہ پر کسی قسم کی کوئی رعایت روا نہ رکھی گئی تھی۔ اگر انسان انصاف کی نظر سے دیکھے۔ تو حضرت نبی کریمؐ کی جنگوں پر کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ آجکل لوگ معقولیت پسند کرتے ہیں اس لئے واقعات پر گہری نظر ڈال کر اس قسم کے لغو اعتراض کوئی وقعت نہیں رکھ سکتے۔ اگر کوئی شخص مذہب کی پابندی سے الگ ہو کر ان جنگوں کی اصلیت کو غور سے دیکھیگا۔ تو اس کو صاف طور پر نظر آ جائیگا۔ کہ اسلامی جنگیں شروع سے لیکر اخیر تک محض دماغی نہیں۔ جن میں ہر ایک قسم کی رعایت ملحوظ تھی۔ جن کا حضرت موسیٰؑ اور حضرت یوشعؑ کی لڑائیوں میں نام تک نہیں ایک غیر مذہب کے آدمی آریہ کی ایک کتاب میری نظر سے گذری ہے۔ جس نے موسوی جنگوں پر بڑے بڑے اعتراضات کئے ہیں۔ لیکن اسلامی جنگوں پر اُسے اعتراض کا کوئی موقعہ نہیں مل سکا۔

مجھ سے جب کبھی کوئی آریہ یا ہندو اسلامی جنگوں کے وجوہات کے بارے میں دریافت کرتا ہے تو میں اُسے ہمیشہ نرمی اور ملاطفت سے یہی سمجھاتا ہوں۔ کہ جو لوگ ان جنگوں کے ذریعہ سے مارے گئے۔ وہ اپنی ہی تلوار سے مارے گئے۔ کیونکہ جب اُن کے مظالم کی انتہا ہوگئی۔ تو آخر ان کو سزا دی گئی۔ اور اُن کے حملوں کو روکا گیا۔ مجھے پادریوں کی غلط بیانیوں اور ایسے غلط بیانی کرنے والوں سے سمجھنے والوں پر سخت افسوس آتا ہے۔ کہ وہ اپنے گھر کی موسوی جنگوں پر تو غور نہیں کرتے لیکن اسلامی جنگوں پر اعتراض شروع کر دیتے ہیں اور اُن سے سمجھنے والے اپنی سادہ لوحی سے ان کی باتوں کو مان لیتے ہیں۔ اگر بنظرِ غور سے دیکھا جائے تو موسوی جنگوں کی سختی کا اعتراض حضرت مسیحؑ پر بھی عاید ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ توریت کو مانتے اور حضرت موسیٰؑ کو خدا کا سچا نبی تسلیم کرتے تھے۔ اگر وہ ان جنگوں اور ان میں بچوں اور عورتوں تک کے قتل کو اچھا نہ سمجھتے تھے۔ تو اُنہوں نے اسے مان کیوں لیا۔ گویا ان جنگوں اور ان کے واقعات کو صحیح مان کر حضرت مسیحؑ نے بھی اس پر اپنی رضامندی کی مہر کر دی۔ یعنی ان میں ایک طرح کی شمولیت اختیار کر لی۔ اصل بات یہ ہے کہ خود حضرت مسیحؑ کو لڑائیاں کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ ورنہ وہ کسی طرح کمی نہ کرتے۔ اُنہوں نے تو اپنے شاگردوں کو حکم دے بھی دیا تھا۔ کہ کپڑے بیچ بیچ کر تلواریں خرید کر لیں۔ اس بات میں ذرا بھی شک نہیں۔ کہ اگر قرآن شریف ہماری رہنمائی نہ کرتا۔ تو ان نبیوں کی سچائی پر سے بالکل اعتماد اُٹھ جاتا۔ اور یہ قرآن شریف کا اور حضرت محمدؐ کا خاص احسان تمام انبیاء پر ہے کہ جنہوں نے دنیا میں آکر تمام انبیاء کو اس قسم کے ناپاک الزامات سے بری کر دکھایا۔

قرآن شریف کو خوب غور سے پڑھو۔ تو صاف طور پر معلوم ہو جائیگا۔ کہ اس کی تعلیم کا مقصد یہی ہے۔ کہ ہر ایک مذہب کو پورے طور پر مذہبی آزادی دو اور کسی سے تعرض نہ کرو۔ جن لوگوں نے سبقت کر کے مسلمانوں پر حملہ نہیں کیا۔ اُن سے ہر طرح کا احسان کرو۔ اور ابتدا کرنے والوں اور ظالموں کے مقابلہ میں بھی صرف دماغ کا لحاظ رکھو۔ حد سے مت بڑھو۔ یہ بات تو سب لوگوں کو معلوم ہے۔ کہ ابتدائے اسلام میں مسلمانوں کو سخت مشکلات درپیش تھیں جنکی دنیا میں نظیر نہیں ملتی۔ ایک شخص کے مسلمان ہو جانے پر مخالفین اسلام مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے تھے۔ اور ہزاروں فتنے بپا ہوتے تھے اور دنیا میں فتنہ پھیلانا قتل سے بھی بڑھکر ہے۔ اس لئے امن عامہ کے قیام کیلئے ایسے مخالفین کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اگر ہندو لوگ اس قسم کے اعتراضات کرتے۔ تو کچھ تعجب اور افسوس کا مقام نہ تھا۔ لیکن افسوس ان لوگوں کے

اعتراضات پر آتا ہے جن کے اپنے گھر پر اس سے زیادہ وزنی اعتراضات پڑتے ہیں۔ افسوس کہ عیسائیوں نے اس قسم کے لغو اور بے بنیاد اعتراضات اسلام پر کرنے میں بڑا ظلم کیا ہے کہ ان کا یہی ایمان ہے؟

منجملہ دیگر جزئیات کے اسلام کے غلامی کے مسئلہ پر بھی اعتراضات کرتے ہیں حالانکہ قرآن شریف نے جگہ بجگہ غلاموں کے آزاد کرنے کی تعلیم دی ہے اور اس بارے میں اتنی زبردست تاکید کی ہے کہ دوسری کسی الہامی کتاب میں نہیں پائی جاتی۔ اس قسم کے جزئیات کو پادری صاحبان محل اعتراض ٹھیرا کر ناواقف لوگوں اور آزاد طبع نوجوانوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ پس آپ کیلئے مناسب ہے کہ آپ ان امور پر اعتراضات پیش کرتے وقت اس بات کا بڑا لحاظ رکھیں کہ صرف اُن باتوں کو گناہ اور محل اعتراض ٹھیرائیں۔ جنہیں خدا تعالیٰ نے گناہ قرار دیا ہو۔ نہ وہ جو کر پادری صاحبان اپنی طرف سے تجویز کریں میں سولہ سترہ سال کی عمر سے ان پادری صاحبان سے ملتا جلتا رہا ہوں۔ لیکن اس نور کی وجہ سے جو اللہ تعالیٰ نے مجھے دیا تھا۔ میں ہمیشہ ان کی دھوکہ دہی کو سمجھ لیا کرتا تھا۔ (الحکم جلد ۶ ۲)۔

اسی طرح پر تعداد ازدواج کے مسئلہ پر یہ لوگ اعتراض کر دیتے ہیں۔ پھر مجھے سخت افسوس سے کہنا پڑتا ہے۔ کہ یہ اعتراض کرتے وقت ان دانوں نے اس بات کا ذرا خیال نہیں کیا۔ کہ اس کا اثر خود اُن کے خداوند پر کیا پڑتا ہے؟ یعنی ان کے اس لغو اعتراض سے خود حضرت مسیح پر حملہ ہوتا ہے۔ کیونکہ جس شخص کے گھر میں حضرت مریمؑ گئی تھیں۔ اس کی پہلی بیوی بھی موجود تھی۔ پھر ایسی اولاد کیا قرار دیجائیگی؟ علاوہ ازیں جب کہ حضرت مریمؑ اور اُنکی والدہ نے خدا کے حضور یہ عہد کیا ہوا تھا۔ کہ حضرت مریمؑ کا نکاح نہ کیا جائیگا۔ پھر وہ کیا آفت اور مشکل پیش آئی تھی۔ کہ ایسے شخص کے ساتھ نکاح کرنا پڑا۔ جس کی پہلی بیوی موجود تھی۔ اس قسم کے نکاح سے تو یہ بات بہتر ہوتی۔ کہ روح القدس کا بچہ مقدس ہیکل ہی میں پیدا ہوتا۔ سخت افسوس ہے کہ ان معترضین نے اسلام پر ایسے اعتراض کرتے وقت اپنے گھر میں نگاہ نہیں ڈالی۔ اور نہ اگر وہ ان باتوں پر غور کر کے صحیح نتیجہ نکالنے والے ہوتے۔ تو سب سے پہلے انہی لوگوں کا فرض تھا۔ کہ حضرت نبی کریمؐ کو قبول کرتے۔ کیونکہ ان کے ہاں نظائر موجود تھے۔ مگر جس طرح

ان کے بزرگوں نے حضرت نبی کریم کا وقت ہاتھ سے کھو دیا۔ اسی طرح آج بھی یہ لوگ مسیح موعودؑ کو قبول نہیں کرتے۔ حالانکہ ایلیا نبی کے آسمان سے آنے کا قصہ اور اسکی حقیقت خود ان کی کتابوں میں موجود ہے۔ جس کے ماننے پر حضرت مسیح کی صداقت کا سارا دارومدار ہے۔ اگر یہ سچ تھا۔ کہ حضرت مسیح مُردوں کو زندہ کیا کرتے تھے۔ تو کیوں پھونک مار کر انہوں نے ایلیا کو زندہ نہ کر دیا۔ تاکہ یہودی لوگ ابتلا سے بچ جاتے۔ اور خود حضرت مسیحؑ کو بھی ان مشکلات اور تکالیف کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ جو ایلیا کے دوبارہ نزول کی تاویل کرنے سے پیش آئیں۔ ایک یہودی عالم کی ایک کتاب میرے پاس موجود ہے۔ جس میں وہ لکھتا ہے۔ کہ اگر خدا تعالیٰ ہم سے مسیحؑ کے انکار کے بارے میں سوال کریگا۔ تو ہم ملاکی نبی کی کتاب سامنے رکھ دینگے۔ کہ کیا اس میں یہ نہیں لکھا کہ مسیح کے آنے سے پہلے ایلیا آسمان سے نازل ہوگا۔ اس میں کہاں لکھا ہے۔ کہ یوحنا آئیگا۔ اس امر پر اس نے بڑی بحث کی ہے۔ اور پھر لوگوں کے سامنے اپیل کرتا ہے۔ کہ بتاؤ ہم سچے ہیں یا نہیں۔ الغرض اس قسم کے جزئیات کو پادری صاحبان بدنما صورت میں پیش کر کے دنیا کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لئے آپ اپنے اعتراضات کے انتخاب کے وقت ان امور کا لحاظ رکھیں۔ جو میں نے آپ کو بتا دیئے ہیں۔ دین کا معاملہ بڑا اہم اور نازک ہے۔ اسمیں بہت بڑی فکر اور غور کی ضرورت ہے۔ اسمیں ہمیشہ وہ پہلو اختیار کرنا چاہیئے۔ جو تمام امم کا مشترک پہلو ہے۔ نیز اس بات کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ کبھی کوئی ایسی بات تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ جس کے نظائر پہلے موجود نہ ہوں۔ مثلاً اگر ایک شخص ہمیں کہے۔ کہ ایک صندوق میں ہزار روپیہ رکھا ہوا تھا۔ جو جادو کے ذریعہ سے ہوا میں کہیں اُڑ گیا۔ تو اس بات کو کون شخص قبول کریگا۔ بعینہٖ یہی حال عیسائی معتقدات کا ہے۔ اس لئے آپ غور سے اعتراضات کو مرتب کر کے پیش کریں۔ انشاء اللہ ہم جواب دیں گے۔

منشی عبدالحق صاحب۔ اگر آپ تثلیث اور کفارہ کو توڑ کر دکھا دینگے تو میں شاید اور کچھ نہ پوچھوں گا؟

حضرت مسیح موعودؑ۔ تثلیث اور کفارہ کی تردید کے دلائل تو ہم انشاء اللہ تعالیٰ اتنے بیان کرینگے۔ کہ جو ان کے ابطال کیلئے کافی سے بڑھکر ہونگے۔ لیکن میری رائے

میں جو ترتیب میں نے آپ کو اشارۃً بتادی ہے۔ اس پر عمل کرنے سے بہت فائدہ ہوگا۔ اس وقت میں غلط مبحث نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن مختصراً اور اشارۃً اتنا کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ اس وقت تین بڑی بڑی اقوام دنیا میں موجود ہیں۔ یعنی یہود۔ عیسائی اور مسلمان۔ ان میں سے یہودی اور مسلمان تو بالاتفاق توحید کو مانتے ہیں۔ لیکن ان کے خلاف عیسائی تثلیث کے قائل ہیں۔ اسلئے ہم عیسائیوں سے دریافت کرتے ہیں۔ کہ اگر واقعی تثلیث کی تعلیم حق ہے اور نجات کا اصل ذریعہ یہی ہے تو پھر کیسے اندھیر کی بات ہے۔ کہ توریت میں اس تعلیم کا کوئی نشان نہیں ملتا خود پیروانِ توریت سے پوچھ کر دیکھ لو۔ علاوہ ازیں ایک اور امر قابلِ غور ہے کہ یہودیوں کے بہت سے فرقے ہیں۔ جن میں باہمی اختلافات موجود ہیں۔ لیکن جملہ فرقہ جات میں توحید باری تعالیٰ کے بارہ میں ذرا بھی اختلاف موجود نہیں اگر تثلیث کا ماننا ہی واقعی مدارِ نجات تھا۔ تو کیا یہود کے سارے فرقے ہی اسے فراموش کر دیتے۔ اور ایک آدھ فرقہ بھی اس پر قائم نہ رہتا۔ کیا یہ تعجب خیز امر نہیں کہ ایک عظیم الشان قوم جس میں ہزاروں فاضل ہر زمانے میں موجود رہے اور حضرت مسیحؑ کے زمانہ تک متواتر اس میں نبی آتے رہے اسے ایک ایسی تعلیم سے بالکل بے خبری ہو جائے جو اُسے حضرت موسیٰؑ کی معرفت ملی ہو۔ اور پھر مدارِ نجات بھی وہی ہو۔ یہ بالکل خلاف قیاس اور بیہودہ بات ہے اور اسی سے معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ تثلیث کا عقیدہ خود تراشیدہ اور من گھڑت ہے۔ انبیاءؑ کے صحیفوں میں اس کا کوئی پتہ نہیں ملتا اور ملنا بھی نہ چاہیئے۔ کیونکہ یہ حق کے خلاف ہے۔ پس یہودیوں کا توحید پر اتفاق اور تثلیث پر کسی ایک یہود کا بھی قائم نہ ہونا اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ یہ عقیدہ ہی باطل ہے خود عیسائیت کے مختلف فرقوں میں تثلیث کے متعلق ہمیشہ سے اختلاف چلا آیا ہے۔ یونیٹیرین یعنی موحد فرقہ آجتک عیسائیوں میں موجود ہے میں نے خود ایک یہودی سے دریافت کیا تھا۔ کہ توریت میں کہیں بھی تثلیث کا ذکر ہے اور یا تمہارے تعامل میں کہیں اس کا پتہ لگتا ہے تو اس نے صاف طور پر یہ کہا۔ کہ ہرگز نہیں۔ بلکہ ہماری توحید وہی ہے جو قرآن میں بیان شدہ ہے اور ہمارا کوئی بھی فرقہ تثلیث کا قائل نہیں پھر اُس نے کہا کہ اگر تثلیث پر مدارِ نجات ہوتا۔ تو ہمیں جو توریت کے احکام کو چھوٹوں اور آستینوں پر لکھنے کا حکم تھا۔ کہیں تثلیث کے لکھنے کا بھی حکم ہوتا۔ اس کے علاوہ دوسری دلیل تثلیث کے ابطال پر یہ ہے کہ باطنی شریعت میں اس کیلئے کوئی نمونہ نہیں ہے۔ باطنی شریعت بجائے خود توحید چاہتی ہے۔ پادری فنڈر صاحب نے اپنی کتابوں میں اس بات کا اعتراف کر لیا ہے

کہ اگر کوئی شخص کسی ایسے جزیرے میں رہتا ہو۔ جہاں تثلیث نہیں پہنچی۔ تو اس سے توحید ہی کا مطالبہ کیا جائیگا نہ تثلیث کا۔ اسی سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے۔ کہ باطنی شریعت توحید کو چاہتی ہے نہ تثلیث کو۔ کیونکہ اگر انسانی فطرت میں تثلیث مرکوز ہوتی۔ تو قیامت کو اُسی کا سوال ہونا چاہیئے تھا۔ پھر تیسری دلیل تثلیث کے ابطال پر یہ ہے کہ جس قدر عناصر خدا تعالیٰ نے بنائے ہیں۔ وہ سب کروی ہیں؟ یہ اسلئے کہ کرویت میں ایک وحدت ہوتی ہے۔ پس اگر خدا میں تثلیث تھی تو چاہیئے تھا۔ کہ یہ جملہ اشیاء مثلث نما ہوتیں۔ علاوہ ازیں تثلیث کے قائل پر ان امور کا بار ثبوت ہے اور اس کا فرض ہے کہ اسکی سچائی پر قدرت کے نظائر بیان کرے۔ اور اسکی سچائی پر دلائل پیش کرے۔ ہم توحید کے متعلق یہود کے جملہ فرقوں کا اتفاق۔ باطنی شریعت میں توحید کا اثر اور قانونِ قدرت میں اُس کے نظائر پیش کرتے ہیں۔ جن پر غور کرنے کے بعد اگر کوئی شخص تقوے سے کام لیگا تو وہ بخوبی سمجھ لیگا۔ کہ تثلیث پر جسقدر زور دیا گیا ہے۔ وہ محض بے دلیل اور بود اخیال ہے۔ یہ بات انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ کہ وہ کبھی ٹیڑھی اور بے امنی کی راہ اختیار نہیں کرتا۔ اسلئے تم دیکھو گے۔ کہ پگڈنڈیوں پر چلنے والوں کی نسبت شاہراہ پر چلنے والے سب سے زیادہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ سیدھے راستہ پر چلنے سے کسی قسم کے خوف اور خطرہ کا امکان نہیں ہوتا۔ جب دنیا کا عام مشاہدہ یہ ہے۔ تو پھر انسان امورِ آخرت کیلئے کیوں ایسی راہ اختیار کرے۔ جو ٹیڑھی اور بدامنی والی ہو۔ اور جسکی سچائی اور حفاظت پر کافی اور معتبر اور زندہ شہادت موجود نہ ہو۔ اس وقت دنیا میں ہزاروں راہیں ہیں۔ لیکن سعید اور مبارک وہی لوگ ہیں۔ جو دنیا کی لالچ کو چھوڑ کر محض خدا کیلئے فقر و فاقہ اختیار کر کے خدائی راہ پر چلنے کی تلاش میں نکلیں۔ پھر جو شخص خلوص نیت سے خدائی راہ کی تلاش کرتا ہے وہ اُسے ضرور پا بھی لیتا ہے۔

عیسائی مذہب کے ابطال اور استیصال کیلئے ہمارے پاس تو ایک دریا ہے اور اب وقت آگیا ہے۔ کہ یہ طلسم ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاوے اور وہ بُت جو صلیب کا بنایا گیا ہے وہ ٹوٹ کر گر پڑے اور اصلی بات تو یہ ہے۔ کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے مبعوث نہ بھی فرماتا۔ تب بھی زمانہ نے ایسے حالات اور اسباب پیدا کر دیئے تھے کہ عیسائیت کا پول کھل جاتا۔ کیونکہ یہ امر اللہ تعالیٰ کی غیرت اور جلال کے صریح خلاف ہے۔ کہ ایک عورت کا بچہ خدا بنایا جائے۔ جو انسانی حوائج اور لوازم بشریہ سے کچھ بھی استثنا اپنے اندر نہیں رکھتا۔ میں نے ایک کتاب لکھی ہے۔ جس میں میں نے پوری پوری تحقیقات کے ساتھ یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ بات بالکل جھوٹ ہے کہ حضرت مسیحؑ

صلیب پر مر گئے۔ اور اصل حقیقت یہ ہے۔ کہ وہ صلیب پر سے غشی کی حالت میں زندہ اُتار لئے گئے تھے۔ پھر تندرست ہو کر ملک شام سے ہجرت کر کے کشمیر میں چلے آئے جہاں ایکسو بیس برس کی عمر پا کر آپ نے وفات پائی۔ اور ابتک اسکی قبر شہر سرینگر محلہ خانیار میں یوز آسف یا شہزادہ نبی کے نام سے مشہور ہے۔ اور یہ بات ایسی نہیں۔ کہ جس کی بنیاد محکم اور مضبوط دلائل پر نہ ہو۔ بلکہ خود صلیبی واقعات جیسا کہ انجیل میں لکھے ہیں۔ اُن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضرت مسیح صلیب پر نہیں مرے۔ اس پر مختصر دلائل یہ ہیں۔ کہ سب سے پہلے خود حضرت مسیح نے اپنی مثال یونسؑ نبی سے دی ہے۔ کیا یونسؑ مچھلی کے پیٹ میں زندہ داخل ہوئے تھے یا مُردہ؟ پھر پیلاطوس کی بیوی نے ایک ہولناک خواب دیکھا۔ جس کی اطلاع اُس نے پیلاطوس کو بھی کر دی۔ جو حضرت مسیح کے بچا لینے کی فکر میں لگ گیا۔ اور اس نے مختلف طریقوں سے حضرت مسیح کے بچانے کی کوشش کی۔ اور آخر کار اپنے ہاتھ دھو کر بتا دیا۔ کہ وہ اس بیگناہ کے خون سے بری ہے۔ آخر جب یہودی کسی طرح ماننے پر نہ آئے۔ تو یہ کوشش کی گئی۔ کہ جمعہ کے دن بوقت عصر حضرت مسیحؑ کو صلیب پر لٹکایا گیا۔ مگر چونکہ صلیب پر بھوک پیاس اور دھوپ وغیرہ کی شدت سے کئی دن رہ کر مصلوب انسان مرجایا کرتا تھا۔ وہ موقع حضرت مسیح کو پیش نہ آیا۔ کیونکہ جمعہ کے دن غروب آفتاب سے پہلے ہی اُسے صلیب پر سے اُتار دیا جانا لازمی تھا۔ وجہ یہ کہ یہودیوں کی شریعت کے رو سے یہ سخت گناہ تھا۔ کہ کوئی شخص سبت یا سبت سے پہلی رات صلیب پر رہے۔ حضرت مسیحؑ کو چونکہ جمعہ کے دن کی آخری گھڑی میں صلیب پر چڑھایا گیا تھا۔ اس لئے بعض قدرتی واقعات مثلاً آندھی وغیرہ کے آجانے کے باعث اُسے دو تین گھنٹوں کے اندر ہی اندر اُتار لیا گیا حضرت مسیح کیساتھ جو دو چور صلیب پر لٹکائے گئے تھے ان کی ہڈیاں توڑ کر انکو مار دیا گیا لیکن حضرت مسیحؑ کی ہڈیاں توڑی نہ گئیں۔ پھر حضرت مسیحؑ کی لاش ایسے آدمی کے سپرد کی گئی جو آپکا شاگرد تھا اور اصل بات تو یہ ہے کہ خود پیلاطوس اور اسکی بیوی بھی حضرت مسیحؑ کے مرید تھے چنانچہ عیسائیوں نے پیلاطوس کو عیسائی شہیدوں میں شمار کیا ہے اور اسکی بیوی کو ولیہ قرار دیا ہے اور ان سب شہادات کے علاوہ بیرونی شہادت مرہم عیسیٰ کا نسخہ ہے۔ جس کو مسلمان۔ یہود۔ عیسوی۔ مجوسی۔ رومی سب حکماء اور طبیبوں نے اپنی کتب میں لکھا ہے۔ اور بالاتفاق مانا ہے کہ یہ مرہم حضرت مسیحؑ کے زخموں کیلئے تیار کی گئی تھی۔ اس کے دوسرے نام مرہم رسل مرہم حواریین اور مرہم شلیخا بھی ہیں۔ کم از کم ایک ہزار قدیم کتب میں اس کا نسخہ موجود ہے۔ اور اس بات کو کوئی عیسائی بھی ثابت نہیں کر سکتا۔ کہ سوائے صلیبی زخموں کے حضرت مسیحؑ کو

کوئی اور بھی زخم کبھی لگے تھے۔ اور اس وقت ان کے حواری بھی موجود تھے۔ اب غور کرو۔ کہ کیا یہ ساری شہادتیں اگر یک جا جمع کی جائیں۔ تو اس بات پر دلالت نہیں کرتیں۔ کہ فی الحقیقت حضرت مسیح صلیب پر سے زندہ اُتار لئے گئے تھے۔ اس پر کسی لمبی بحث کی ضرورت نہیں رہتی۔ چونکہ وہ خود کہتے ہیں کہ وہ بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی طرف بھیجے گئے تھے۔ اسلئے وہ صلیب سے بچ کر یہود کے اُن دس فرقوں کی طرف ایران افغانستان اور کشمیر کی سمت چلے گئے۔ جو ملک شام سے جلاوطن ہو چکے ہوئے تھے۔ اور پھر آخر کار اُنہیں کے درمیان اپنی نبوت کا کام کرکے کشمیر میں وفات پائی۔ اس بات کو انگریز و دیگر محققین نے تسلیم کر لیا ہے۔ کہ کشمیری اور افغان بنی اسرائیل کی نسل سے ہیں۔ برنیئر صاحب فرانسیسی سیاح نے اپنے سفرنامہ میں اس امر کو تسلیم کیا ہے۔ اب جب کہ واقعات کی بنا پر یہ ثابت ہو گیا۔ کہ حضرت مسیح صلیب پر نہیں مرے بلکہ زندہ اُتر آئے تو کفارہ کے مسئلہ کا کیا باقی رہ گیا۔ پھر ان سب سے عجیب بات یہ ہے۔ کہ جس عورت کی شہادت پر عیسائی لوگ حضرت مسیح کو آسمان پر چڑھاتے ہیں۔ وہ خود کوئی اچھے اور نیک چال چلن کی عورت نہ تھی۔ سب سے بڑھکر یہ بات ہے۔ کہ موجودہ تحقیقات نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے۔ کہ آسمان پر جانے کی آیات الحاقی ہیں۔ اصل کتاب جس سے موجودہ اناجیل ترجمہ کیگئی ہیں۔ اُس میں آسمان پر جانے کی آیات درج نہیں ہیں۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۳۱)

خوب یاد رکھو کہ اوّلاً ایک فعل انسان کی طرف سے سرزد ہوتا ہے۔ پھر اُس فعل میں جو تاثیر یا خاصیت مخفی ہو۔ اُس پر خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک فعل مترتب ہو کر اس کے نتیجہ کو ظاہر کر دیتا ہے۔ مثلاً جب ہم اپنے گھر کی کوٹھڑی کے دروازے اور کھڑکیاں بند کر لیتے ہیں۔ جو کہ ہمارا اپنا فعل ہے۔ تو اس پر خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ فعل سرزد ہوتا ہے۔ کہ اس کوٹھڑی میں روشنی اور ہوا کی آمد و رفت بند ہو کر اُس میں ایک تاریکی پھیل جائیگی۔ پس یہ عادۃ اللہ ہمیشہ اور قدیم سے اسی طرح پر چلی آتی ہے۔ جس میں کوئی تغیر نہیں ہو سکتا۔ یعنی انسان کے ہر فعل پر خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک دوسرا فعل بطور اُس کے نتیجہ کے مترتب ہوتا رہتا ہے۔ جس طرح پر کہ یہ سنت اللہ ظاہری نظام میں جاری ہے۔ اسی طرح وہ اندرونی یعنی روحانی نظام میں کام کر رہی ہے۔ جو شخص دل کو ہر قسم کی غلاظتوں اور گندگیوں سے صاف کر کے تلاش حق کرتا ہے۔ اگر زیادہ نہ سہی تو کم از کم سلیم عقائد ہی کی حالت میں آتا ہے۔ تو وہ اپنا مقصد یعنی سچائی کو ضرور پا لیتا ہے۔ لیکن اگر وہ پہلے سے اپنے دل میں ایک پختہ فیصلہ کر کے

ضد اور تعصب میں گرفتار دل لیکر آتا ہے۔ تو اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے۔ کہ اس کا معاندانہ جوش ترقی کرتا کرتا اُس کے فطرتی انوار کو دبا لیتا ہے۔ جس سے اس کا دل سیاہ ہو جاتا ہے اور پھر وہ حق و باطل میں امتیاز کرنے کی توفیق نہیں پا سکتا۔ اسلئے یہ بات ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ سے پاکیزگی اور ہدایت پانے کیلئے انسان اپنے اندر بھی پاکیزگی اور صلاحیت پیدا کرے۔ یعنی ضد۔ تعصب اور بخل کو چھوڑ دے۔ اور اپنے نفس کو ہرگز دھوکا نہ دے۔ یہ سچی بات ہے کہ جو شخص دل میں پہلے ہی کسی امر کا پختہ فیصلہ کر کے پھر تلاش حق کا دعویٰ کرے۔ تو وہ حق کا طالب نہیں کہلا سکتا۔ بلکہ ایسا شخص دنیا کا طالب ہوتا ہے۔ جو دنیا کی فتح و شکست پر جان دیتا ہے۔ میں ہرگز نہیں مان سکتا۔ کہ ایسا شخص خدا تعالیٰ کو بھی مانتا ہے۔ نہیں بلکہ میرے نزدیک وہ دہریہ ہے۔ پاک دل انسان کسی شخص کی زجر و توبیخ سے نہیں ڈرتا۔ اور حق پا کر اس کی فضیلت کے اقرار میں کبھی ندامت اور شرمساری نہیں پاتا۔ یقیناً ایسا ہی شخص حق کو پا لیتا ہے۔ اور اُسی کے دل پر انوار الٰہی نازل ہوتے ہیں۔ اس بات کو خوب یاد رکھو کہ اللہ تعالےٰ ایسے شخص کو ہرگز ضائع نہیں کرتا۔ جو اس کی جستجو میں اپنا قدم رکھتا ہے کیونکہ وہ یقیناً موجود ہے اور ہمیشہ سے اُس نے اپنے اَنَا الْمَوْجُوْد ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ وہ اب بھی کہتا ہے۔ کہ جس طرح حضرت مسیحؑ پر وحی نازل ہوتی تھی۔ اسی طرح اب بھی ہوتی ہے۔ میں سچ کہتا ہوں اور یہ میرا نرا دعوےٰ نہیں۔ بلکہ اُس کے ساتھ روشن دلائل موجود ہیں۔ پہلے کیا تھا جواب نہیں؟ اب بھی وہی خدا ہے۔ جو ہمیشہ سے کلام کرتا چلا آیا ہے اور اس نے اب بھی دنیا کو اپنے کلام سے منوّر کیا ہے۔

کفارہ کے متعلق ایک اور بات میں کہنی چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ کفارہ کی اصل غرض تو یہ بتائی جاتی ہے۔ کہ انسانوں کو نجات حاصل ہو۔ اور نجات دوسرے الفاظ میں گناہ کی زندگی اور اُسکی موت سے بچ جانے کا نام ہے۔ لیکن میں آپ سے دریافت کرتا ہوں کہ خدا کیلئے انصاف سے بتائیں کہ گناہ کو کسی شخص کی خودکشی کے ساتھ فلسفیانہ طریقہ پر کیا تعلق ہے؟ اگر حضرت مسیحؑ نے نجات کا مفہوم یہی سمجھا۔ اور لوگوں کو گناہوں سے بچانے کا یہی طریقہ اُن کے دل میں سوجھا۔ تو پھر نعوذ باللہ ہم ایسے شخص کو رسول بھی ماننے کیلئے تیار نہیں۔ کیونکہ اس طریق سے گناہ رُک نہیں سکتے۔ آپ کو یورپین شہروں یعنی لنڈن۔ پیرس وغیرہ کے حالات سے خوب واقفیت ہوگی۔ آپ انصاف سے

بتائیں کہ گناہ کا کونسا پہلو ہے۔ جو وہاں نہیں ہوتا توریت میں سب گناہوں سے بڑھ کر گناہ زنا لکھا ہے۔ جس کی کثرت یورپین ممالک میں روز افزوں ترقی پر ہے۔ اور یہ سیلاب گناہ کا اُن اقوام میں نہایت زور سے آیا ہے۔ جو یقین رکھتی ہیں۔ کہ مسیح اُن کے گناہوں کے بدلے میں مرا۔ اس خودکشی کے طریق سے تو یہ بہتر تھا۔ کہ حضرت مسیح دعا کرتے۔ کہ اُنہیں لمبی عمر عطا کی جائے۔ تاکہ پند و نصائح و وعظ کے ذریعہ سے ہی لوگوں کو فائدہ پہنچایا جائے۔ لیکن سوجھا تو اُنہیں کیا سوجھا۔ علاوہ ازیں ایک اور بات بھی ہے۔ جو میں نے پیش کی تھی۔ اور جس کا ابھی تک کسی عیسائی نے جواب نہیں دیا۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ کہا جاتا ہے۔ کہ مسیح ہمارے لئے لعنتی ہوا۔ اس لئے اب لعنت کے معنوں کیلئے عبرانی اور عربی زبانوں کی لغت دیکھنی چاہیئے جن کا یہ لفظ ہے۔ کہ ان زبانوں میں اس کا مفہوم کیا ہے۔ کہ ملعون کس کو کہا جاتا ہے۔ عربی اور عبرانی لغت کی کتابوں میں صاف طور پر لکھا ہوا ہے۔ کہ لعین شیطان کا نام ہے۔ اور ملعون وہ شخص ہوتا ہے۔ جس کا خدا سے کوئی تعلق نہ ہو اور وہ خدا سے دُور ہو۔ اور خدا اُس سے دور ہو اب غور کرو کہ تمام عیسائیوں نے اس امر کو بالاتفاق اپنے عقیدہ میں داخل کر لیا ہے۔ کہ مسیح اُن کیلئے لعنتی ہوا۔ چنانچہ اسی لئے تین دن کے واسطے اس کو ہاویہ میں بھی رکھتے ہیں۔ اس لئے سوچو کہ یہ لعنتی قربانی جو اُن کے عقاید کے مطابق ہوئی۔ اس کا نجات سے کیا تعلق ہوا؟ غرض جس قدر کفارہ پر غور کرتے جائیں اسی قدر اس عقیدہ کی کمزوری کھلتی جاتی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ حضرت مسیح کے بارے میں عیسائی اور یہودی ہر دو اقوام نے افراط اور تفریط سے کام لیا ہے عیسائیوں نے تو یہاں تک افراط پر قدم مارا ہے کہ ایک عاجز انسان کو جو ایک ضعیفہ عورت کے پیٹ سے عام آدمیوں کی طرح پیدا ہوا۔ خدا بنا لیا۔ اور پھر اُسے گرایا بھی تو یہاں تک کہ اُسے ملعون بنا دیا۔ اور ہاویہ میں گرا دیا۔ دوسری طرف یہودیوں نے یہاں تک تفریط کی۔ کہ معاذ اللہ اُسے ولد الزنا قرار دیا۔ جسے بعض انگریزوں نے بھی تسلیم کیا ہے۔ اور اس کا سارا الزام حضرت مریمؑ پر لگایا ہے۔ لیکن قرآن شریف نے آکر ان ہر دو اقوام کی غلطیوں کی اصلاح کی۔ عیسائیوں کو بتایا۔ کہ مسیح خدا کا رسول تھا۔ خدا نہ تھا۔ اور نہ ہی یہ ملعون تھا۔ بلکہ مرفوع تھا۔ اور یہودیوں کو بتایا۔ کہ وہ ولد الزنا نہ تھا۔ بلکہ اسکی ماں مریمؑ صدیقہ ایک پاکباز عورت تھی احصنت فرجہا کی وجہ سے اُس میں نفخ روح ہوا تھا۔ یہی افراط اور تفریط اس زمانہ میں بھی ہو رہی ہے اسی لئے خدا نے مجھے بھیجا ہے۔ کہ میں ان کی اصل عزت کو قائم کروں۔ مسلمان اپنی غلطی

اور ناواقفی سے حضرت مسیحؑ کی صفات انسانی صفات سے بڑھکر قرار دیتے ہیں۔ اور ان کی موت کے اصل راز کی حقیقت سے ناواقف ہیں۔ اور عیسائی اُن کو مصلوب قرار دیکر لعنتی قرار دیتے ہیں۔ اسلئے اب وقت آگیا ہے۔ کہ مسیح کا اصل درجہ دنیا پر ظاہر ہو۔ اور ان کے ذمے سے سارے الزامات دور کر دیئے جائیں۔ جو پہلے بھی ایک وقعہ حضرت رسول کریمؐ دور کر چکے تھے۔ پس اسلام کا کس قدر احسان حضرت مسیحؑ پر ہے۔ اور میں امید کرتا ہوں۔ کہ آپ ان باتوں پر خوب غور کرینگے۔ میں پھر آپ سے کہتا ہوں۔ کہ جبتک آپ کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئے۔ آپ مجھ سے بار بار دریافت کریں۔ ورنہ یہ طریق اچھا نہیں۔ کہ انسان کو کوئی بات سمجھ میں نہ آئے اور کہدے کہ اسے سمجھ لیا ہے۔ اس کا نتیجہ بُرا ہوتا ہے۔ سراج الدین جو یہاں آیا تھا۔ اُس نے ایسا ہی کیا۔ اس لئے اُس نے کوئی فائدہ نہ اُٹھایا۔ کیا اُس نے آپ کو بھی کچھ کہا تھا؟

منشی عبدالحق صاحب۔ ہاں وہ مجھے منع کرتے تھے۔ کہ وہاں مت جاؤ۔ کچھ ضرورت نہیں ہے۔ جب ہم نے ایک سچائی کو پالیا۔ پھر کیا ضرورت ہے کہ اور تلاش کرتے پھریں۔ اور یہ بھی اُنہوں نے کہا تھا۔ کہ جب میں آیا تھا۔ تو وہ مجھے تین میل تک چھوڑنے آئے تھے اور پسینہ آیا ہوا تھا۔

حضرت مسیح موعودؑ۔ اس پسینہ آنے سے اُس نے یہ مراد لی۔ کہ گویا ہمیں اُس کے اعتراضات کا جواب نہیں آیا۔ افسوس! آپ اس سے پوچھتے تو سہی۔ کہ پھر وہ یہاں رہ کر نمازیں کیوں پڑھتا تھا۔ اور کیا اُس نے مجھے نہیں کہا تھا۔ کہ اُس کی تسلی ہو گئی ہے۔ اگر وہ میرے روبرو ہو۔ تو میں اُسے حلف دیکر دریافت کروں۔ کہ اصل معاملہ کیا تھا۔ کیونکہ سامنے ہو کر غلط بیانی کرنے سے انسان کو کچھ تو شرم آجاتی ہے۔

منشی عبدالحق صاحب۔ میں نے نمازوں کا حال پوچھا تھا تو اُنہوں نے کہا۔ کہ ہاں میں پڑھا کرتا تھا۔ آخر میں نے اُسے کہدیا تھا۔ کہ میں کسی سرد مقام پر جاکر اس کا فیصلہ کروں گا۔ مسٹر سراج الدین نے یہ بھی کہا تھا۔ کہ مرزا صاحب شہرت پسند ہیں۔ میں نے چار سوال پوچھے تھے۔ اُن کے جوابات چھاپ دیئے۔

حضرت مسیح موعودؑ۔ اس میں شہرت پسندی کی تو کوئی بات نہیں ہے۔ ہم کیوں حق کو چھپاتے۔ اگر اسے چھپاتے تو گنہگار ٹھیرتے اور معصیت ہوتی۔ خدا تعالیٰ نے جب مجھے مامور کر کے بھیجا ہے۔ تو پھر میں حق کا اظہار کروں گا۔ اور جو کام میرے سپرد ہوا ہے

اُسے خلق تک پہنچاؤں گا۔ اور اس بات کی مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ کہ کوئی شخص مجھے شہرت پسند کہے یا کچھ اور۔ آپ ان کو پھر ایک خط لکھ دیں۔ کہ وہ یہاں آکر کچھ دن اور رہ جائیں۔ ان باتوں میں آپ واپس اپنے مکان کے قریب پہنچ گئے۔ جہاں پر آپ نے پھر منشی عبدالحق صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ کہ "آپ ہمارے مہمان ہیں اور مہمان وہی آرام پاسکتا ہے۔ جو بے تکلف ہو۔ پس آپ کو جس چیز کی ضرورت ہو مجھے بلا تکلف کہدیں"۔ اور پھر ساری جماعتِ موجودہ کو مخاطب کر کے حضرت مسیح موعودؑ نے فرمایا۔ "کہ دیکھو۔ یہ ہمارے مہمان ہیں اور تم میں سے ہر ایک کو مناسب ہے۔ کہ ان سے پورے اخلاق سے پیش آوے اور کوشش کرتا رہے۔ کہ ان کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو"۔ یہ کہہ کر آپ اندرونِ خانہ تشریف لیگئے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۴)۔

تصنیفات حضرت مولانا محمد علی صاحب ایم اے ایل ایل بی

حمائل شریف مترجم مع حواشی ہدیہ مجلد قسم اوّل ۸ر ہے۔ مجلد قسم دوم (پانچ روپیہ آٹھ آنہ) صر

سیرت خیر البشر اس بے نظیر تصنیف میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق فاضلہ پر محققانہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ شروع کتاب میں عرب کا نقشہ دیا گیا ہے۔ ملک کی جغرافی حالت اور اس کا تعلق دوسرے ممالک اقوام سے بتایا گیا ہے۔ بعد میں تمام حصص دنیا میں مذہبی تاریکی اور روحانی فیض کا مفقود ہونا اور آپ کی بعثت کے پہلے اور بعثت کے موقعہ پر کے چند بڑے بڑے نشانات کا جو ظہور پذیر ہوئے ذکر کیا گیا ہے اور پھر بچپن سے لیکر اخیر عمر تک کے حالات درج ہیں۔ قیمت مجلد ایک روپیہ آٹھ آنہ (عہ) بجلد۔ عہ

تاریخ خلافت راشدہ ۔ چار علیحدہ علیحدہ حصوں میں۔

حضرت ابوبکرؓ ... ۵ر

حضرت عمرؓ ... ۶ر

حضرت عثمانؓ ... ۴ر

حضرت علیؓ ... ۴ر

جمع قرآن ۔ قرآن کریم کی جمع و ترتیب کے متعلق تمام تاریخی واقعات کو نہایت تحقیقات سے لکھا گیا ہے اور جو اعتراضات غیر مذاہب والے کیا کرتے ہیں انکی تردید کی گئی ہے۔ مجلد عہ بجلد ۱۲ر

مقام حدیث ۔ یہ تصنیف نہایت ہی قابل قدر ہے اہل قرآن کا مدلل اور فیصلہ کن جواب ہے۔ اس میں علاوہ ضرورت حدیث کے تنقید حدیث اور جمع حدیث پر مفصل بحث کیگئی ہے ہر وہ شخص جسے آنحضرتؐ کے قول کیساتھ تفتیش منظور ہو اس کتاب کو ضرور پڑھے مجلد عہ بجلد ۱۲ر

تمام درخواستیں بنام منیجر دار الکتب اسلامیہ احمدیہ بلڈنگس لاہور آنی چاہئیں

مؤلف کتاب ہذا کی دیگر تالیفات

البشریٰ حصہ اوّل یعنی الہامات حضرت مجدد اعظمؒ قبل از دعوی مسیحیت قیمت ۴؍
البشریٰ حصہ دوم " " " بعد دعوی مسیحیت " ۸؍
مکاشفات یعنی رویا و کشوف حضرت مجدد اعظمؒ " ۴؍
منظور الٰہی یعنی ملفوظات حضرت مجدد اعظمؒ " ۲؍
المہدی یعنی سہ ماہی رسالہ مشتمل بر ملفوظات حضرت مجدد اعظم۔ فی نمبر سالانہ " ۲؍
مسیح قرآن میں یعنی حضرت مسیحؑ کا صحیح درجہ جو آیات قرآنی سے نکلتا ہے۔ " ۱؍
نماز مترجم اُردو ترجمہ اُردو معہ عربی " ۰؍
واقعات صلیب عربی۔ حضرت مسیح کے صلیب پر چڑھائے جانیکے واقعات از اناجیل " ۲؍
واقعات صلیب اُردو۔ " " " " " " " ۱؍
نماز انگریزی یعنی وضو۔ نماز۔ نکاح کے مسائل انگریزی و عربی میں " ۲؍
قرآنی دعائیں انگریزی یعنی قرآن کریم کی جملہ دعائیں معہ ترجمہ انگریزی " ۲؍
اصول اسلام بذریعہ سوال و جواب انگریزی (اردو) یعنی اسلام کے جملہ اصولوں کو عام فہم سوالات و جوابات کی صورت میں حل کیا گیا ہے " ۲؍

ملنے کا پتہ

منیجر دار الکتب اسلامیہ۔ احمدیہ بلڈنگس لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ملفوظاتِ احمدیہ

(سلسلہ کیلئے دیکھو صفحہ ۸۰ المہدیؑ حصہ اوّل)

۲۴ دسمبر ۱۹۰۱ء۔ گذشتہ یوم کی گفتگو سنائے جانے کے بعد آج صبح پھر سلسلہ گفتگو منشی عبدالحق صاحب سے شروع ہوا:۔

حضرت مسیح موعودؑ۔ مامور اگر ان امور کی جو اس پر کھولے جاتے ہیں اشاعت نہ کرے تو میں سچ سچ کہتا ہوں۔ کہ وہ مخلوق خدا پر ظلم کرتا ہے۔ اور خود خدا تعالیٰ کے سپرد کردہ فرائض کو انجام نہیں دیتا۔ مامور کا ایک یہ بھی نشان ہے۔ کہ وہ اشاعتِ حق سے نہیں رکتا۔ ہمیں یہ دیکھکر افسوس ہوتا ہے۔ جب ہم انجیل میں ایسے فقرات پڑھتے ہیں۔ جن میں مسیح اپنے آپ کو چھپانے اور کسی پر ظاہر نہ کرنے کی تعلیم اپنے شاگردوں کو دیتا ہے۔ مامور من اللہ میں ایک شجاعت ہوتی ہے۔ اسلئے وہ کبھی بھی اپنا پیغام پہنچانے اور اشاعت حق سے نہیں ڈرتا۔ شہادت حقہ کا چھپانا سخت گناہ ہے۔ پس میں کیونکر اس حقیقت کو چھپا سکتا ہوں۔ جو خدا تعالیٰ نے مجھ پر کھولی ہے۔ میرے نزدیک یہ طریق بہت ہی مناسب ہے۔ کہ ہماری گفتگو اس طرح پر مرتب ہو جایا کرے آپ نے کل کی گفتگو دوبارہ سن لی ہے۔ اب اس پر غور کریں اور جو کچھ شک آپ کو باقی ہو۔ بے شک پوچھ لیں؟

منشی عبدالحق صاحب۔ میں اس پر مزید غور کرونگا۔

حضرت مسیح موعودؑ۔ میں آپ کی اس بات کو بہت پسند کرتا ہوں۔ کہ آپ نے جلدی نہیں کی۔ آپ بے شک چار پانچ روز تک اس پر کافی غور کرلیں۔

منشی عبدالحق صاحب۔ میں نے آج ایک سوال قرآن شریف کی ضرورت پر سوچا تھا

مگر وہ گذشتہ یوم کی تقریر میں آچکا ہے۔ اب میں یہ سوال پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ جو کہا جاتا ہے۔ کہ انجیل میں تحریف ہوگئی ہے۔ اگر کوئی دریافت کرے۔ کہ پھر اصل کہاں ہے۔ تو اس کا جواب کیا ہے؟

حضرت مسیح موعودؑ۔ آپ کا یہ سوال ایک نیا سوال ہے۔ جو پہلے سوالات سے بالکل الگ ہے۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ تداخل نہ ہو۔ اس سوال کا جواب میں بیان کرونگا۔ لیکن پہلے یہی مناسب ہے۔ کہ آپ اپنے سابقہ سوالات کے جوابات پر کافی غور کرکے جو کچھ انکے متعلق پوچھنا ہو وہ پوچھ لیں۔ جب وہ طے ہو لینگے تو میں آپ کے اس سوال کا جواب دوں گا۔ مگر میں تداخل کو پسند نہیں کرتا۔ کیونکہ یہ مناسب اور درست معلوم نہیں ہوتا۔ جیسے تداخل اگر کھانے میں کیا جائے۔ یعنی بہت سے کھانے یکبارگی ایک کے اوپر دوسرا کھا جائیں۔ تو اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ سوء ہضم ہوکر ہیضہ قے یا کسی اور بیماری میں مبتلا ہو جائیگا۔ اسی طرح کلام میں تداخل منع ہے۔ تداخل کلام سے کوئی بات محفوظ نہیں رہ سکتی۔ اور انسان اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔ بلکہ وقت ضائع ہوتا ہے۔ میری یہ عین مراد ہے کہ آپ کے جملہ سوالات ایک ترتیب کے ساتھ ہوں۔ اور ہر ایک سوال کی ایک مدّ رکھی جائے۔ اور پھر ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ حل کیا جائے۔ اس وقت میرا مقصد یہ نہیں ہے۔ کہ میں خلط مبحث کرکے وقت ضائع کروں۔ اور آپ کو فائدہ سے محروم رکھوں۔ بلکہ میں چاہتا ہوں کہ وہ طریقہ اختیار کیا جائے۔ جس سے آپ کو میں پورا پورا فائدہ پہنچا سکوں جو میری طاقت اور امکان میں ہے اور میری رائے میں اس کیلئے یہی طریق مناسب ہے۔ جو اختیار کیا گیا ہے۔ میں آپکے اس موجودہ سوال کا جواب دیتے وقت آپ کو بتاؤں گا۔ کہ تحریف کے خیالات مسلمانوں میں شروع سے پیدا نہیں ہوئے۔ بلکہ اناجیل کے ماننے والوں ہی کی طرف سے ان خیالات کی ابتدا ہوئی ہے۔ اور جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے۔ اسے میں دوسرے وقت پر رکھتا ہوں۔ جب آپ سابقہ سوالات کے جوابات پر غور کر لینگے۔ جو لوگ صرف بحث مباحثہ کیلئے گفتگو کیا کرتے ہیں۔ اور تلاش حق اُن کا مقصد نہیں ہوتا۔ وہ ایک ہی جلسہ میں سب کچھ طے کر لینا چاہتے ہیں۔ میں ایسے مباحثوں کا نام مذہبی قمار بازی رکھتا ہوں۔ جیسے ایک قمار باز اپنی چابکدستی اور چالاکی سے ہاتھ مارنا چاہتا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح ایسے مذہبی مباحثہ کرنے والے کیا کرتے ہیں۔ اور ہم نے تجربہ کرکے دیکھ لیا ہے۔ کہ ایسے لوگ ہمیشہ اصلی بات کو پوشیدہ رکھتے اور فرضی خیالی باتوں کو پیش کیا کرتے ہیں۔ میں ایسی مذہبی قمار بازی کو بہت ہی بُرا سمجھتا ہوں۔ کہ

انسان مذہبی تحقیقات میں چالاکی اور چابک دستی سے کام لے اور دل میں ذرا بھی خوفِ خدا اور حیا نہ کرے۔ اس مذہبی قمار بازی میں ہمیشہ ہار جیت اور خیالی فتح و نصرت مدّ نظر ہوتی ہے اور دوستوں اور ہمعصروں کی نگاہ میں فتحیاب کہلانے اور واہ واہ سُننے کا خیال ہوتا ہے یہ مذہبی قمار بازی دنیا کی قمار بازیوں سے زیادہ نقصان رساں ہوتی ہے۔ کیونکہ مؤخر الذکر میں تو صرف مال کا زیان ہوتا ہے۔ لیکن مذہبی قمار بازی میں دین و دنیا برباد و تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ اور تمام اخلاق و روحانی نعمتیں جو انسان کو اعلیٰ درجہ کے کمالات کا وارث بنا سکتی ہیں ہار دیجاتی ہیں۔ اور ان دینی اور دنیاوی متاع کے ہارا جانے سے جو رنج پیدا ہوتا ہے۔ وہ بڑا سخت ہے۔ اس لئے اس قسم کی مذہبی قمار بازی کے خیال کو کبھی پاس بھی نہ آنے دینا چاہیئے۔ خصوصاً اس صورت میں کہ مذہبی گفتگو سے مقصد اور ارادہ یہ ہو کہ راستبازوں کے نور سے حصّہ ملے۔ خوب یاد رکھو۔ کہ کبھی کوئی شخص اس نور کو نہیں پا سکتا۔ اور اپنی فطرت سلیمہ و متاع روحانی و اخلاقی کو محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ جب تک کہ حق گوئی اور حق جوئی اور پھر قبول حق کیلئے ساری دنیا کو ان کے سامنے ایک مردہ قرار نہ دے لے۔ اور حق کی قبولیت کیلئے اللہ تعالیٰ سے پختہ عہد کر لے۔ لیکن جو شخص ایسا عہد خدا تعالیٰ سے نہیں کرتا وہ خدا تعالیٰ کو زبانی مان کر بھی دہریہ ہے۔ ہماری جماعت کو یاد رکھنا چاہیئے کہ جیسے امراض کا بحران ہوتا ہے۔ اسی طرح پر یہ ایام مختلف ملّتوں اور مذاہب کے بحران ہیں شیطان کی بھی یہ آخری جنگ ہے۔ اسلئے وہ اپنے تمام آلاتِ حرب و ضرب لے کر حق کے مقابلہ کے لئے نکلا ہوا ہے۔ اور اپنے پورے زور اور طاقت سے کوشش کر رہا ہے۔ کہ حق کو کچل ڈالے اور اس پر غلبہ پالے۔ لیکن اس بات کا اُسے خود یقین کامل ہے کہ اس کی یہ ساری کوششیں حق کے مقابلہ میں محض بے فائدہ اور بے سود ہیں۔ اور وہ وقت بہت جلد آنے والا ہے۔ کہ شیطان مارڈالا جائیگا اور ملائکہ کی فتح ہوگی۔ مگر باوجود اس علم کے وہ اپنی پوری طاقت اور زور سے میدان میں نکلا ہوا ہے۔ اور اس کے مقابلہ کیلئے حق بھی میدان میں آگیا ہے۔ جس کی تائید کیلئے ہر قسم کے سامان اور آلات آسمان سے نازل ہو رہے ہیں۔ چونکہ اس وقت حق و باطل کی جنگ شروع ہے۔ اسلئے آپ کو واجب ہے کہ حق کا ساتھ دیں۔

میں نے بارہا اس امر کو بیان کیا ہے۔ اور اب پھر بتاتا ہوں۔ کہ حق کی شناخت کے

تین نشان ہیں۔ اگر ان پر حق کو پرکھو گے تو شیطان کبھی بھی دھوکا نہ دے سکیگا۔ ورنہ اُس نے اپنی طرف سے التباس حق و باطل میں آئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اور وہ نشانات یہ ہیں۔ اوّل نصوص صریحہ یعنی جو اعتقادات ہم رکھتے ہیں۔ ان کے بارہ میں ہمیں اس امر کو دیکھنا چاہیئے کہ کیا ان کا نام و نشان خدا تعالیٰ کی کتب میں بھی پایا جاتا ہے یا نہیں۔ اور اگر اسکی تائید میں نصوص صریحہ یعنی منقولی شہادت قطعیہ موجود نہ ہو۔ تو سوچ لینا چاہیئے۔ کہ کہاں تک ان کو وقعت دی جا سکتی ہے۔ مثلاً اگر ایک کیمیاگر کہے کہ وہ ایک ہزار روپے کا دس ہزار بنا سکتا ہے۔ تو اسکی بات ماننے سے پہلے کیا ہمارے لئے یہ ضروری امر نہیں ہے۔ کہ ہم اسبات کو دیکھ لیں۔ کہ اس سے پہلے کتنے بزرگ ہو گزرے ہیں جنہوں نے ایسی باتیں کر کے دکھائیں۔ پس اگر تحقیقات کرنے اور غور سے معلوم کرنے پر یہ ثابت ہو جائے۔ کہ پہلے بھی ہزاروں لوگ ایسے مدعیوں کے ذریعہ سے بہت سا نقصان اُٹھا چکے ہیں۔ تو ہم اسکے دعوے کو ذرا بھی وقعت دینے کو تیار نہ ہونگے۔ خود ہمارے اس علاقہ میں ایک کیمیاگر اسیطرح پر ایک ہی وقت میں دو آدمیوں کو ٹھگ کر بھاگ گیا۔ غرض حق کی شناخت کا پہلا ذریعہ نصوص صریحہ کا ہے۔ اب اگر ان کے ذریعہ سے ہم عیسائی معتقدات کو پرکھنے لگیں۔ تو صاف طور پر معلوم ہو جائیگا۔ کہ یہ سب نرا ملمع ہیں۔ اور ان میں ذرا بھی حق کی چمک نہیں ہے۔ جیسا کہ میں نے کل بیان کیا تھا۔ کہ تثلیث اور یسوع کی خدائی کے بارے میں اگر یہودیوں سے دریافت کیا جائے۔ اور ان کی کتابوں کی تلاش کی جائے۔ تو معلوم ہو جائیگا۔ کہ ان میں کبھی بھی کوئی تثلیث کا قائل نہ تھا۔ اور نہ کسی جسمانی خدا کے بارہ میں ان کی کتابوں میں کچھ ذکر ہے۔ جو عام بچوں کی طرح کسی عورت کے پیٹ میں خون حیض سے پرورش پاکر نو مہینے کے بعد پیدا ہوگا۔ اور دوسرے انسانوں کی طرح سارے امراض مثل چیچک خسرہ وغیرہ میں مبتلا ہوگا۔ اور آخرکار یہودیوں کے ہاتھ سے مار کھاتا ہوا صلیب پر چڑھایا جائیگا اور پھر ملعون ہو کر تین دن ہاویہ میں رہیگا۔ اور نہ ہی باپ بیٹا روح القدس کے مجموعہ اور مرکب خدا کا ہی ان کی کتابوں میں کہیں ذکر ہے۔ اگر کہیں ہے۔ تو عیسائی صاحبان جن سے ہم اسبارہ میں ایک عرصہ دراز سے مطالبہ کرتے چلے آئے ہیں۔ ہمیں نکال دکھائیں۔ ورنہ اس کے خلاف ہم دیکھتے ہیں۔ کہ منجملہ اور اعتراضات جو یسوع پر

یہودیوں نے کئے سب سے بڑا یہ اعتراض تھا۔ کہ یہ شخص خدا کا بیٹا اور خدا بنتا ہے۔ جو کفر ہے اگر یہودیوں نے توریت اور دیگر انبیائے صحیفوں میں کہیں یہ تعلیم پائی تھی۔ کہ دنیا میں خود خدا اور اسکے بیٹے بھی لوگوں سے مار کھانے کے لئے آیا کرتے ہیں۔ اور ایسے دس پانچ لوگ کسی زمانہ میں گذر بھی چکے تھے۔ تو پھر اُن کے انکار کی کیا وجہ ہو سکتی تھی۔ اصل حقیقت بھی ہے۔ کہ عیسویت کے یہ عقائد اس معیار پر کبھی بھی پورے نہیں اتر سکتے۔ اسلئے ان میں حقانیت کی کوئی روح نہیں ہے۔

دوسرا طریق حق کی شناخت کا یہ ہے۔ کہ عقل سلیم بھی اسکی مدد معاون ہو عقل ایک ایسی چیز ہے۔ کہ اگر اسے استعمال کرنا چھوڑ دیا جائے۔ تو دین و دنیا میں بڑا فتور پیدا ہوتا ہے۔ اسلئے ہر امر کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی ضرورت ہے۔ اسلئے جب ہم ان عیسوی عقائد کو عقل کے ذریعہ سے پرکھتے ہیں۔ تو وہ ان عقائد کو دور سے دھکے دیتی ہے۔ کیا ایک عقلمند کے نزدیک یہ بات قابل قبول ہو سکتی ہے۔ کہ ایک عاجز انسان جس میں انسانیت کے سارے لوازم اور بشریت کی ساری کمزوریوں کے نمونے موجود ہوں خدا بن سکتا ہے۔ بھلا کیا عقل سلیم اس بات کو ایک لمحہ کے لئے بھی روا رکھ سکتی ہے۔ کہ مخلوق اپنے خدا کو جو خالق ہے۔ کوڑے مارے اور اس کے منہ پر تھوکے اور پھر پکڑ کر اسے سولی پر چڑھا دے۔ اور وہ یہ ساری ذلت دیکھکر اور خدا ہو کر اپنی رسوائی کا تماشا دیکھتا رہے۔ پھر کیا عقل اس بات کو مان سکتی ہے۔ کہ ایک عورت کا بچہ جو نو مہینے تک ماں کے پیٹ میں رہے۔ خون حیض کھائے اور آخر دوسرے انسانی بچوں کیطرح چیختا چلاتا پیدا ہو۔ وہ خدا ہو سکتا ہے۔ کیا کسی شخص کا اسپر دل اطمینان ہو سکتا ہے۔ کہ ایک شخص خدا کہلا کر ساری رات موت سے بچنے کے لئے دعائیں کرتا رہے۔ اور اسکی دعائیں قبول نہ ہوں۔ ایسا ہی کیا عقل سلیم تجویز کر سکتی ہے۔ کہ کسی شخص کی خودکشی سے دوسرے لوگوں کے گناہ بخشے جا سکتے ہیں۔ اگر یسوع کے روٹی کھانے سے اسکے حواریوں کے پیٹ بھر جایا کرتے تھے تب تو یہ بات کچھ قابل غور بھی ہو سکتی ہے۔ کہ کسی شخص کے دردسر کا علاج اپنے سر میں پتھر مار لینا بھی ہے۔

تیسرا ذریعہ حق کی شناخت کا یہ ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کی معیت سچے مذہب اور اہل حق

کے ساتھ ہوتی ہے۔ اور وہ سچے مذہب اور اہل حق کو کبھی ضائع نہیں کرتا۔ اور ان کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا باغ اور اسکے پھل ہوتے ہیں۔ اور یہ کبھی بھی کسی شخص نے نہ دیکھا ہوگا۔ کہ ایک شخص باغ لگا کر خود اسکی طرف سے غافل اور لاپرواہ ہو جائے۔ نہیں بلکہ وہ اس کی آبپاشی۔ شاخ تراشی وحفاظت وغیرہ تمام امور کا جو اسکی سرسبزی اور شادابی کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ پورا پورا اہتمام کرتا ہے۔ اسی طرح پر اللہ تعالیٰ اپنے راستبازوں اور اپنی طرف سے بھیجی ہوئی صداقتوں کی تائید کے لئے ہمیشہ تازہ بتازہ تائیدات سماوی بھیجتا رہتا ہے۔ جنکی روشنی میں صادق چلتے اور انہیں سے شناخت کئے جاتے ہیں اب اس معیار پر عیسائی مذہب اور اسکے عقائد کو آزما کر دیکھ لو۔ تو ظاہر ہو جائیگا کہ اس میں بجز پوسیدہ ہڈیوں اور مردہ باتوں کے اور کیا رکھا ہے۔ اس بات کو تمام پادری صاحبان مانتے ہیں۔ کہ عیسائی مذہب میں اس وقت ایک بھی ایسا شخص نہیں۔ جو اپنے مذہب اور اسکے عقائد خون مسیح کی سچائی پر تائیدات سماوی کی مہر لگا سکے۔ یہ تو بڑی بات ہے۔ میں تو یوں کہتا ہوں۔ کہ انجیل کے اقرار دادہ نشانوں کے مطابق تو شاید ایک بھی ایماندار عیسائی کا دنیا کے پردہ پر پایا جانا امر محال ہے۔ زندہ نشانات کو اگر چھوڑ بھی دیا جائے۔ تو گذشتہ معجزات جو مسیح کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔ کہ حضرت مسیح نے قبر میں سے کس مردہ کو زندہ کر دیا تھا۔ بجز قصوں کے اور کیا وقعت رکھ سکتے ہیں۔ سلب امراض کے اعجوبے تو بعض ہندو سنیاسی بھی کر دیا کرتے ہیں۔ اور اس زمانہ میں مسمریزم والے بہت بہت عجائبات دکھا سکتے ہیں۔ پھر اس زمانہ میں مسیح کے سلب امراض والے معجزات کو کون مان سکتا ہے۔ جن کے ساتھ کوئی تاریخی ثبوت بھی موجود نہیں۔ اس لئے پیشگوئی ہی ایک نہایت زبردست نشان ہے۔ جو ہر زمانہ میں قابل عزت سمجھا جا سکتا ہے۔ اور اسکے بارے میں بھی اگر اناجیل کو دیکھا جائے تو نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے۔ کہ جو پیشگوئیاں حضرت مسیح کی اناجیل میں درج ہیں۔ وہ ایسی بے سروپا ہیں۔ کہ انہیں پڑھکر ہنسی آتی ہے۔ مثلاً یہ کہ قحط پڑینگے۔ زلزلے آئینگے۔ مرغ بانگ دیگا۔ اب غور کر کے دیکھ لو۔ کہ زلزلہ اور قحط

کا آنا ایک معمولی بات ہے۔ اور ہر گاؤں میں مرغ بانگیں دیا کرتے ہیں۔ پھر ان پیشگوئیوں کی خاص خصوصیت کیا ہوئی۔ آجکل کے مدبرین اور ماہران فن تو اس سے بھی بڑھکر واقعات عالم بتلاتے رہتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ کب طوفان آئیگا۔ اور کب اور کہاں بارش ہوگی وغیرہ وغیرہ اب ان کے مقابلہ میں آنحضرتؐ کی پیشگوئیوں کو دیکھو۔ کہ آپنے کئی سو برس پہلے پیشگوئیاں کیں۔ جو اس زمانہ میں پوری ہو رہی ہیں۔ مثلاً آپنے ایک پیشگوئی یہ کی۔ کہ ایک آگ نکلے گی جو سبزہ کو چھوڑ دیگی۔ لیکن پتھر کو گلا دے گی۔ جو آپ کے بعد چھ سو سال کے زمانہ میں پوری نکلی ان کو چھوڑ کر جو پیشگوئیاں میری تائید اور اسلام کی سچائی کے لئے اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے ظاہر کی ہیں وہ ایسی ہیں۔ کہ جن کا نمونہ عیسویت میں نہیں ملتا میں نے تو ایک اشتہار انعامی ایک ہزار روپیہ اس بارے میں دیا تھا۔ کہ اگر کوئی عیسائی یسوع مسیح کی پیشگوئیوں کو تعداد اور قوت ثبوت کے لئے میری پیشگوئیوں سے بڑھکر ثابت کریگا۔ تو وہ اس انعام کا مستحق ہوگا۔ لیکن آجتک کوئی عیسائی سامنے نہ آیا۔ مسیح کے معجزات جو محض قصص کے رنگ میں ہیں۔ ان سے کوئی فوق العادت تائید الٰہی کا پتہ نہیں لگتا۔ کیونکہ اس قسم کے طبی چٹکلے اور عجائبات آجکل کے دہریہ ماہرین فن بھی دکھاتے رہتے ہیں۔ مسیح کے معجزات شفاء امراض کی حقیقت تو اس سے بھی کھل جاتی ہے۔ کہ خود انجیل میں لکھا ہے۔ کہ اس زمانہ میں ایک تالاب تھا جس میں ایک خاص وقت غسل کرنے سے امراض شفا ہو جاتی تھی۔ جیسا کہ آجکل بھی یورپ اور ایشیا میں ایسے چشمے پائے جاتے ہیں جنمیں غسل کرنے سے کئی قسم کی امراض سے فائدہ ہو جاتا ہے۔ ابھی تھوڑا ہی عرصہ گذرا ہے۔ کہ اخبارات میں شائع ہوا تھا کہ ایک کوئیں میں غسل کرنے سے جذامی مریض بالکل صحتیاب ہو گئے تھے۔ عیسویت کے گذشتہ نشانات کا تو یہ حال ہے اور موجودہ نشانات ہیں ہی نہیں۔ تو اب کس دلیل پر ان کے قصوں کو مان لیا جائے کہ مسیح نے یہ معجزہ دکھایا۔ اور وہ دکھایا۔ اس طرح تو ہندو لوگ اپنے بزرگوں کیطرف بھی بڑے بڑے معجزے، اور کرامات منسوب کرتے ہیں۔ ان کا کیا قصور ہے۔ کہ ان کو بھی صحیح نہ مان لیا جائے۔ اور ان کی تینتیس ۳۳ کروڑ

دیوتاؤں کو ان قصوں کی بنا پر سچا نہ قبول کر لیا جائے۔ پرانوں میں ان دیوتاؤں کے ایسے ایسے قصے لکھے ہیں۔ کہ انجیل کے قصے ان کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ پنڈت دیانند نے اپنا ایک نیا مت نکال کر ہندو مذہب پر ہاتھ صاف کیا اور کہا کہ رام کا نام ہی وید میں نہیں ہے۔ لیکن افسوس کہ خود اسے جو خلاصہ وید کی تعلیم کا ہمارے سامنے پیش کیا وہ بھی نرا گند سے بھرا ہوا ہے۔

مذہب کا خلاصہ صرف دو ہی باتیں ہیں۔ اور انہی دو باتوں پر اسکی سچائی پرکھی جاسکتی ہے۔ اوّل حق اللہ ہے۔ دوم حقوق العباد۔ لیکن انہی دو باتوں میں وید اور اناجیل عاری ہیں۔ حقوق اللہ کا مطلب یہ ہے۔ کہ اسے کس طرح مانا جائے اور کس طرح اسکی عبادت کی جائے۔ اور حقوق العباد کا مطلب یہ ہے۔ کہ خدا کی مخلوق کے ساتھ کس طرح ہمدردی اور مواسات کرنی چاہیئے۔ پنڈت دیانند نے اسبارہ میں جو وید کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ وہ تو میں بعد میں بتاؤنگا۔ لیکن عیسویت نے جو کچھ ان کے بارے میں پیش کیا ہے۔ وہ سخت بیہودہ ہے۔ حق اللہ کے بارے میں تو انہوں نے یہ کیا۔ کہ اس خدا کو بالکل چھوڑ دیا۔ جو حضرت موسےٰ و دیگر راستبازوں اور پاکبازوں پر ظاہر ہوا تھا۔ اور اسکی بجائے ایک عاجز انسان کو خدا بنا لیا۔ اور حقوق العباد کی وہ مٹی پلید کی کہ کسی طرح درست ہونے میں نہیں آتے انجیل کی ساری تعلیم ایکہی طرف جھکی ہوئی ہے اور وہ انسان کی جملہ قوتوں کی مربی نہیں ہو سکتی۔ سب سے اوّل تو مسئلہ کفارہ کو مان کر حقوق العباد کے اتلاف سے بچنے کے لئے کوئی وجہ ہی نہیں مل سکتی ہے۔ کیونکہ جب یہ مان لیا گیا کہ مسیح کے خون نے گناہوں کی نجاست کو دور کر دیا۔ اور دھو دیا ہے۔ حالانکہ مشاہدہ یہ ہے کہ خون سے کسی قسم کی نجاست دور نہیں ہو سکتی۔ تو پھر عیسائی صاحبان ہی بتائیں کہ انہیں کونسی بات دنیا میں فسق و فجور اور فساد کرنے سے روک سکتی ہے۔ کیونکہ جب ایک شخص کو یہ یقین ہو۔ کہ چوری کرنے۔ بیگانہ مال مار لینے ڈاکہ زنی کرنے۔ خون کرنے اور جھوٹی گواہی دینے پر کوئی سزا نہ ملے گی تو وہ ان امور سے کیسے رک سکتا ہے۔ اور اسے کیونکر یقین ہو سکتا ہے۔ کہ ان بروئے افعال و اعمال کی سزا ملے گی۔ اور اگر باوجود کفارہ پر ایمان لانے کے بھی گناہ گناہ ہی ہیں

تو یہ ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ پھر کفارہ سے کیا معنے اور مطلب ہوا۔ اور عیسائیوں نے اس اعتقاد سے کیا فائدہ حاصل کیا۔ حقوق العباد کو پورے طور پر ادا کرنے اور بجا لانے کیلئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو مختلف قوائے کا مالک بنا کر اس دنیا میں بھیجا ہے۔ جس سے یہ منشا تھا۔ کہ وہ ان جملہ قوائے سے برمحل کام لیکر بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچائے۔ لیکن انجیل کی تعلیم سارا زور صرف حلم اور نرمی کی قوت کے استعمال پر ہی ہے۔ حالانکہ بعض اوقات یہ صفت زہر قاتل کا اثر رکھتی ہے۔ ہماری تمدنی زندگی جو مختلف صفات کے اختلاط اور ترکیب سے بنی ہے۔ بالطبع یہ تقاضا کرتی ہے۔ کہ ہم اپنے تمام قویٰ کو محل اور موقع پر استعمال کیا کریں۔ لیکن انجیل محل اور موقع شناس کو تو پس پشت ڈالتی ہے۔ اور اندھا دھند یہی تعلیم پیش کرتی ہے۔ کہ ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسری بھی آگے کر دو۔ اور کرتہ مانگنے والے کو چغہ بھی دے دو۔ کیا ان صفات پر عمل کرنے والے انسان بھی کسی نے کبھی دیکھے ہیں؟ ہرگز نہیں خود عیسائی صاحبان دو ہزار سال سے اس تعلیم کا عملی نمونہ پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ کیا کوئی شخص انجیل کی اس تعلیم پر فریفتہ ہو کر کبھی گوارا کر سکتا ہے۔ کہ اگر کوئی نابکار شخص اس کی بیوی یا مال پر حملہ کرے۔ تو وہ اپنی لڑکی اور سارا گھر اس کے سامنے پیش کر دے۔ ہرگز نہیں جس طرح ہمیں اپنے جسم کی صحت اور صلاحیت کیلئے ضروری ہوتا ہے۔ کہ موسم اور فصل کے لحاظ سے مختلف قسم کی غذائیں کھائیں اور مختلف قسم کے لباس پہنیں۔ بعینہٖ اسی طرح روح کی صلاحیت اور اس کے قویٰ و خواص کے نشو و نما پانے کیلئے یہ لازمی امر ہے کہ اسی قاعدہ کو مدنظر رکھ کر مختلف قویٰ سے موقعہ اور محل کے مناسب حال کام لیا جائے۔ جسمانی تمدن میں جس طرح پر گرم۔ سرد۔ نرم۔ سخت۔ حرکت سکون کی رعایت رکھنی ضروری ہے۔ اسی طرح پر روحانی صحت کیلئے مختلف قوتوں کی رعایت رکھنی لازمی ہے۔ کیونکہ ان مختلف قوتوں کا عطا ہونا ہی صاف دلیل اس امر کی ہے کہ یہ سب روح کی بھلائی کیلئے دی گئی ہیں۔ اور اگر ہم ان مختلف قوتوں سے کام نہیں لیتے یا دوسروں کو ان سے کام نہ لینے کی تعلیم دیتے ہیں۔ تو ایک خدا ترس اور غیور انسان کی نگاہ میں ہم خدا تعالیٰ کے فضلوں کی توہین کرنے والے ہیں۔ کیونکہ ایسی تعلیم دیکر ہم یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ کہ خدا تعالیٰ نے یہ جملہ طاقتیں محض لغو پیدا کی ہیں۔ پس اگر انجیل صرف ایک ہی قوت پر زور دیتی ہے۔ جیسا کہ عیسائی صاحبان پیش کرتے ہیں۔ تو میں آپ سے انصاف و دیانت

کرتا ہوں۔ کہ اللہ تعالیٰ کے خوف کو دل میں جگہ دیکر جواب دیں۔ کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اس فعل کی ہتک نہیں ہے۔ کہ اُس نے انسان کی روح میں مختلف قوتیں اور استعدادیں رکھ دی ہیں۔ اور اگر کوئی عیسائی یہ کہے۔ کہ صرف حلم اور نرمی کی ہی قوت کے نشو ونما سے جملہ دیگر قوتیں نشو ونما پاتی ہیں۔ تو ایسے شخص کی دانشمندی میں کیا شک ہو سکتا ہے حالانکہ خود اللہ تعالیٰ کی صفات مختلف ہیں۔ جن کے ظہور سے دنیا میں مختلف افعال صادر ہوتے رہتے ہیں۔ ہم نے تو آجتک کوئی ایسا عیسائی پادری نہیں دیکھا۔ جو سردی کے موسم میں اپنے گرمی کے لباس سے ہی کام لیتا ہو۔ یا ساری عمر اپنی ماں کا ہی دودھ پیتا ہے۔ یا اپنے بچپن کا ہی لباس زیب تن کرتا رہے غرض ایسی ناقابل عمل تعلیم پیش کرتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے اگر ذرہ بھر بھی اللہ تعالیٰ پر ایمان ہو اور اس کا خوف مدنظر ہو تو نرمی اور حلم کو کافی سمجھنے والے عیسائی صاحبان کو دیوانی۔ فوجداری جرائم کی سزاؤں کیلئے مختلف قوانین بنانے کی ضرورت نہ تھی۔ اور نہ سیاسیات اور ملکداری کیلئے کسی آئین کی ضرورت تھی۔ ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسری گال آگے کر دینے والی اقوام کو فوجوں اور پولیس کی کیا ضرورت؟ لہذا اسلئے کوئی شخص غور کرے۔ کہ اس اعتقاد نے کس طرح جملہ حقوق العباد پر پانی پھیر دیا ہے۔ جبکہ ساری قوتوں کو محض معطل اور بیکار سمجھ لیا۔

ایسی تعلیم کے مقابل پر اسلام کی تعلیم دیکھو۔ کہ کس طرح پر وہ جملہ قوتوں کو اپنے اپنے محل و موقعہ پر استعمال کرنے کی تعلیم دیتا ہے اور سب سے اوّل یہ بتایا۔ کہ کوئی قوت اور طاقت جو انسان کو دی گئی ہے۔ فی نفسہ بری نہیں بلکہ اس کی افراط اور تفریط اور بد استعمال اُسے اخلاقِ ذمیمہ کی ذیل میں داخل کرتی ہے۔ اور اس کا محل و موقعہ پر اعتدال سے استعمال حسن اخلاق ہے۔ یہ وہ اصول ہے۔ جسے دیگر مذاہب نے نہیں سمجھا۔ اور جسے صرف قرآن شریف نے بیان فرمایا ہے۔ اسی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ فرماتا ہے جزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا فمن عفا واصلح فاجرہٗ علی اللہ (الشوریٰ ع ۴) یعنی بدی کی سزا اُسی قدر بدی ہے۔ لیکن جس نے عفو کیا اور اس عفو میں اصلاح بھی ہو تو اس کا اللہ کے نزدیک بڑا اجر ہے۔ یہاں عفو کو تو ضرور رکھا ہے۔ لیکن یہ نہیں۔ کہ اس عفو سے شریر شخص اپنی شرارت میں بڑھ جائے یا تمدن اور سیاست کے اصولوں اور نظام میں کوئی خلل واقع ہو۔ بلکہ عفو اسی حالت تک رکھا ہے کہ اُس سے اصلاح مقصود ہو۔ اور

اگر عفو سے شرارت بڑھنے یا اصولِ سیاست و تمدن میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہو۔ تو وہاں سزا ضروری ہے۔ گویا عفو صرف اصلاح ہی کی حالت میں روا رکھا گیا ہے۔ اب خوب غور کر کے دیکھ لو۔ کہ فی الحقیقت ایسی ہی تعلیم اخلاق انسانی کی منظم اور مکمل ہو سکتی ہے نہ کہ نرے طمانچے کھانے والی۔ اور قانونِ قدرت بھی اسی کی تائید کرتا ہے اور عملی طور پر بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ انجیل پر عمل کرنے کا تو یہی نتیجہ ہونا چاہیئے۔ کہ تمام عدالتیں عیسائی سلطنتیں فوراً بند کر دیں اور فوج اور پولیس کو جواب دیدیں۔ ذرا اس تعلیم انجیلی پر دو روز تو عمل کر کے دیکھ لو۔ کہ دنیا میں کس قدر فتنہ برپا ہوتا ہے اور کس قدر خون کے دریا بہتے ہیں۔ اگر انجیل کی تعلیم ناقص اور ادھوری نہ ہوتی۔ تو عیسائی سلطنتوں کو نئے قوانین بنانے کی کیوں ضرورت پیش آتی۔ یہ ہے حقوق العباد پر انجیل کی تعلیم کا اثر۔

اب ذرا وید کی تعلیم کو بھی دیکھ لو۔ دیانند نے ان ہر دو امور یعنی حق اللہ اور حق العباد کے بارے میں ویدک تعلیم کا جو خلاصہ پیش کیا ہے۔ اس کا لُبِّ لباب تو یہ ہے۔ کہ مان لیا جائے۔ کہ خدا دنیا کی کسی چیز کا بھی خالق نہیں۔ ذرّاتِ عالم اور ارواح قدیم سے خود بخود چلی آتی ہیں۔ کسی کی پیدا کردہ نہیں۔ اور خدا صرف ان کے جوڑنے جارڑنے والا ہی ہے۔ جسے عربی زبان میں مؤلف کہتے ہیں۔ یعنی موجودہ مادہ سے کام لیکر کسی چیز کو بنا دینے والا۔ اس سے زیادہ حق اللہ کا اتلاف اور کیا ہو سکتا ہے۔ یہ اعتقاد رکھ کر اس کی ساری صفات کو سرے ہی سے اُڑا دیا۔ اور اس کی عظیم الشان صفت خالقیت کا زور شور سے انکار کر دیا گیا۔ جبکہ خدا صرف جوڑنے جارڑنے والا ہی ہے۔ تو اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ کسی وقت مر بھی جائیگا۔ تو سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ اس کے مرنے سے مخلوق پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ کیونکہ جب اُس نے اُن کو پیدا ہی نہیں کیا۔ تو وہ اپنے وجود کے بقاء و قیام میں قائم بالذّات ہیں۔ پھر اُنہیں خدا کی ضرورت ہی کیا پڑی۔ صرف جوڑنے جارڑنے سے اس کا کوئی خاص حق اور قدرت ثابت نہیں ہوتی۔ پھر جبکہ اجسام اور ارواح میں اتصال اور انفصال کی مختلف قوتیں بھی طبعاً موجود ہیں۔ تو اُن کے جوڑنے جارڑنے کیلئے خارجی وجود کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ انسانی ارواح میں بڑی بڑی قوتیں ہیں۔ مثلاً جیسا کہ کشف کی قوت۔ اور جس طرح انسانی ارواح میں اس صفت کا ظہور ہوتا ہے ویسا حیوانات مثلاً گائے بیل کی ارواح میں ہرگز نہیں ہوتا۔ افسوس ہے کہ دیانند کے پیرو آریہ ان ارواح کو

بھی مع اپنی جملہ قوتوں اور خواص کے خدا کی پیدا کردہ نہیں سمجھتے۔ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ جبکہ یہ جملہ اشیاء عالم یعنی مادہ وارواح خود بخود قائم بالذات ہیں اور اُن میں انفصال وانفعال کی قوتیں بھی قدیم سے موجود ہیں تو وجود باری پر اُن کے وجود سے کیا دلیل لیجا سکتی ہے۔ کیونکہ جب مثلاً میں یہ کہوں۔ کہ یہ اوٹا ایک قدم چل سکتا ہے تو دوسرا قدم نہ چلنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ وجود باری تعالیٰ پر دو ہی قسم کے دلائل ہو سکتے ہیں۔ اول مصنوع کو دیکھ کر صانع کے وجود کی طرف ہم ذہن کا انتقال کرتے ہیں۔ جو یہاں مفقود ہے۔ کیونکہ اس نے ارواح اور مادہ کو پیدا ہی نہیں کیا۔ اور اگر کچھ پیدا کیا ہو۔ تو اس سے وجود خالق پر دلیل پیدا کریں۔ دوسری صورت خوارق اور معجزات کی ہوتی ہے۔ جس سے وجود باری تعالیٰ پر زبردست دلائل قائم ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے دیانند اور اس کے پیروؤں نے اعتراف کیا ہے۔ کہ وید میں کسی پیشگوئی یا خارق عادت امر کا ذکر نہیں اور اُن کے خیال میں معجزہ کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ اب بتاؤ کہ اُن کے عقیدہ کے رو سے کونسی صورت خدا کی ہستی پر دلیل قائم کرنے کی رہی۔ پھر انہوں نے دنیا کے سامنے ایسا خدا پیش کیا ہے کہ کوئی شخص خواہ کتنی ہی محنت اور مشقت سے اسکی عبادت کرتا رہے لیکن وہ اُسے نجات ابدی دینے سے قاصر ہے۔ بلکہ ایسے شخص کو بھی جونوں کے بے انتہا چکر کاٹنے ہونگے۔ کبھی کیڑا مکوڑا کبھی کچھ اور کبھی کچھ بننا پڑیگا۔ حقوق العباد کے متعلق اتنا ہی کافی ہے۔ کہ اُن میں ایک نیوگ کا مسئلہ موجود ہے۔ جس کا منشا یہ ہے کہ اگر ایک عورت کے ہاں اپنے خاوند سے اولاد نہ پیدا ہوتی ہو تو اس کا خاوند اُسے اجازت دے۔ کہ وہ کسی غیر شخص سے ہم بستر ہو کر اولاد پیدا کرے۔ اب اس شخص سے بڑھکر دنیا میں دیوث اور کون ہو سکتا ہے۔ جو اپنی بیوی کو محض اولاد کی خاطر کسی غیر شخص سے ہم بستر کرائے۔ یہ مختصر نمونہ ہے ویدک اخلاقی تعلیم کا۔ یہاں قادیان میں پنڈت سوہراج ایک آریہ مدرس تھا۔ میں نے اُسے ایک جماعت کے روبرو بلایا۔ جس میں بعض ہندو بھی تھے اور وہاں اس سے اس مسئلہ کے بارہ میں دریافت کیا۔ جس پر اس نے جواب دیا۔ کہ ہاں جی ایسا کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔ ہمیں تو اس کے منہ سے یہ بات سنکر سخت تعجب ہوا اور دوسرے ہندو رام رام کہنے لگ پڑے۔ میں نے یہ سنکر کہا۔ کہ بس آپ جانے۔ یہ ہے اس مذہب میں حقوق العباد کا لحاظ۔

مسٹر عبدالحق صاحب۔ میں نے آپ کی کتاب آریہ دھرم پڑھی ہے۔

حضرت مسیح موعودؑ۔ میری ساری تقریر کا یہ خلاصہ ہے۔ کہ ہر ایک سچا مذہب اور سچا عقیدہ ان تینوں نشانوں یعنی نصوص۔ عقل اور تائید سماوی سے شناخت کیا جاتا ہے۔ عیسائی مذہب کے بارہ میں میں نے آپ کو مختصر طور پر مختلف پہلوؤں سے دکھایا ہے کہ وہ اس معیار پر پورا نہیں اترتا۔ یہودیوں کی کتابوں میں اس تثلیث اور کفارہ کا کوئی پتہ نہیں اور نہ وہ خدا کے کسی بیٹے کے منتظر تھے۔ عقل ان عقاید کو دور سے دھکے دیتی ہے۔ نشانات سماوی کا یہ حال ہے۔ کہ ان لوگوں میں انجیل کے بیان کردہ ایماندروں والے نشانات بھی پائے نہیں جاتے۔ ایک بار فتح مسیح نام ایک عیسائی نے کہا تھا۔ کہ اُسے الہام ہوتا ہے۔ اسپر جب میں نے اس کو کہا۔ کہ پھر تو کوئی پیشگوئی کر۔ تو سخت گھبرایا اور مجھے کہنے لگا۔ کہ ایک بند لفافہ میں مضمون رکھ دیا جائے۔ تو آپ اس کا مضمون بتا دیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مجھے اطلاع دی۔ کہ اس بات کو قبول کر لوں۔ جب میں نے اسے بھی قبول کر لیا تو کئی سو آدمیوں کے مجمع میں پادری وائیٹ بریخٹ نے کہدیا کہ فتح مسیح جھوٹا ہے۔ غرض حق ایک ایسی چیز ہے۔ جس کے ساتھ نصوص اور عقل کی شہادت کے علاوہ نور کی شہادت بھی ہوتی ہے۔ جو دیگر سب شہادتوں سے بڑھ کر ہوتی ہے اور یہی مذہب کی زندگی کا نشان ہوتا ہے۔ کیونکہ جو مذہب زندہ خدا کی طرف سے ہونے کا مدعی ہے۔ اس میں ہمیشہ زندگی کی روح کا پایا جانا ضروری ہوتا ہے۔ تا کہ اس زندہ خدا سے اس کا سچا تعلق ہونے پر ایک روشن نشان ہو۔ لیکن عیسائی صاحبان میں یہ ہرگز نہیں پایا جاتا۔ حالانکہ اس زمانہ میں جو سائنس اور ترقی علوم کا ہے ایسے خارق عادت نشانات کی بڑی سخت ضرورت تھی۔ جو اللہ تعالیٰ کی ہستی پر دلائل قائم کریں۔ اگر اس وقت کوئی عیسائی پادری حضرت مسیحؑ کے گذشتہ معجزات جن کی ساری رونق تالاب کی تاثیر دور کر دیتی ہے سُنا کر ان کی خدائی منوانا چاہے تو کوئی بھی قبول نہیں کر سکتا۔ جبتک کہ وہ خود کوئی کرشمہ عیسویت کی سچائی کیلئے کر کے نہ دکھائے۔ ورنہ آج کوئی بھی ایسی منطق اور فلسفہ نہیں ہے۔ جو ایسے انسان کی خدائی ثابت کر دکھائے۔ جو ساری رات روتا رہے۔ مگر پھر بھی اسکی دعا قبول نہ ہو اور جس کی زندگی کے واقعات نے اُسے ایک ادنیٰ درجہ کا انسان ثابت کر دیا ہو۔ پس میں دعویٰ سے کہتا ہوں اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ میں اس دعویٰ میں سچا ہوں اور تجربہ و

نشانات کی ایک بڑی تعداد نے میری سچائی کو روز روشن کی طرح ظاہر کر دیا ہے۔ کہ اگر یسوع مسیح ہی زندہ خدا ہے۔ اور وہ اپنے صلیب برداروں کی نجات کا باعث ہے اور ان کی دعاؤں کو قبول کرتا ہے باوجودیکہ خود اسکی اپنی دعا قبول نہیں ہوئی تو کسی پادری یا راہب کو میرے مقابلہ پر پیش کرو۔ کہ وہ اپنے خدا یسوع مسیح سے توفیق اور مدد پا کر کوئی خارق عادت نشان دکھلائے۔ میں اب میدان میں کھڑا ہوں اور میں سچ سچ کہتا ہوں۔ کہ میں اپنے خدا کو دیکھتا ہوں اور وہ ہر وقت میرے سامنے اور میرے ساتھ ہے۔ اور میں پکار کر کہتا ہوں کہ مسیح کو مجھ پر زیادتی نہیں۔ کیونکہ میں نورِ محمدی کا قائم مقام ہوں۔ جو ہمیشہ اپنی روشنی سے اپنی زندگی کے نشانات قائم کرتا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کسی چیز کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔ تسلی پانے اور زندہ خدا کو دیکھنے کیلئے روح انسانی میں ہمیشہ ایک تڑپ اور پیاس ہوتی ہے۔ جس کی تسکین آسمانی تائیدات و نشانات کے بغیر ممکن نہیں۔ اور میرا یہ دعویٰ ہے کہ عیسائی مذہب میں یہ نور اور زندگی نہیں پائی جاتی۔ بلکہ اسوقت یہ حق اور زندگی میرے پاس موجود ہے۔ اور میں اسبارہ میں ۲۶ برس سے اشتہارات دے رہا ہوں۔ لیکن تعجب کی بات ہے۔ کہ کوئی عیسائی پادری اپنے مذہب کی سچائی پرکھنے کیلئے میرے مقابلہ پر نہیں آیا۔ اگر فی الحقیقت ان کا مذہب زندہ ہے اور اسکی زندگی کے نشانات اُن کے پاس موجود ہیں۔ تو وہ کیوں اُن کو اناجیل کے جلال کیلئے پیش نہیں کرتے۔ ایک بار میں نے سولہ ہزار اشتہار انگریزی و اُردو میں چھپوا کر جملہ ممالک و مذاہب کے لیڈروں میں تقسیم کئے تھے۔ جن میں سے اب بھی کچھ ہمارے دفتر میں موجود ہونگے۔ لیکن ایک عیسائی بھی مقابل پر نہ اُٹھا۔ جو یسوع کی خدائی کا کرشمہ دکھاتا۔ اور اس مُردہ بت کی حمایت کرتا۔ حقیقی امر یہ ہے کہ وہاں کچھ ہے ہی نہیں تو اُسے پیش کوئی کیا کرے۔ خلاصہ مطلب یہ کہ حق کی شناخت کیلئے یہ تین ہی ذرائع ہیں۔ جو عیسائیت میں قطعاً مفقود ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ آپ کو اچھا موقعہ مل گیا ہے اور آپ یہاں آگئے ہیں۔ ان تقریروں کی ترتیب سے آپ کو بہت فائدہ ہوگا۔ آپ اُنہیں خوب غور سے سُن لیا کریں۔ اور پھر اگر اُن میں سے کسی امر پر آپ کو کلام باقی نہ ہو۔ تو اس پر اپنے دستخط کر دیا کریں۔ تاکہ ہمارا یہ وقت رائیگاں نہ جائے اور مفید ثابت ہو۔ سراج الدین کیلئے جو وقت ہم نے دیا۔ اگر اس طرح پر

تقاریر لکھی جاتیں۔ تو ایک حجت باقی رہتی۔ اُسنے اپنے طرزِ عمل سے دوسروں پر بھی بدظنی کا موقعہ دیا۔ میری تو سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ کہ جب ایک شخص ایک جگہ سچائی کو چھوڑتا ہے تو وہ دوسری جگہ اُس سے کم درجہ کی چیز سے کس طرح پیار کر سکتا ہے:۔

مسٹر عبدالحق صاحب۔ ہاں مجھے دستخط کرنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے اور میرا اس میں کوئی ہرج نہیں ہے؟

حضرت مسیح موعودؑ۔ بات یہ ہے کہ ساری جرأت دل کی پاکیزگی سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر انسان کا دل صاف ہو۔ تو اُسے کوئی بات روک نہیں سکتی۔

مسٹر عبدالحق صاحب۔ میں نے جب یہاں آنے کا ارادہ کیا۔ تو ایک عیسائی سے ذکر کیا تو اُس نے آپ کو گالی دی۔ جو مجھے سخت ناگوار معلوم ہوا۔ میں نے اُسے کہا۔ کہ یہ تو بُری بات ہے۔ گالی دینے کے کیا معنے؟ اُس نے جواب دیا کہ وہ ہمارا دشمن ہے جس پر میں نے کہا۔ کہ انجیل میں تو لکھا ہے۔ کہ دشمنوں سے پیار کرو۔ یہ کہاں لکھا ہے۔ کہ دشمنوں کو گالیاں دو۔ پھر میں نے سراج الدین سے اس کا ذکر کیا۔ اُنہوں نے بھی اُس کو اچھا نہ سمجھا۔ بعض آدمیوں کی حالت یہاں تک پہنچی ہوئی ہے:۔

حضرت مسیح موعودؑ۔ گالیاں دیتے ہیں۔ اس کی تو مجھے کچھ بھی پرواہ نہیں ہے۔ بہت سے خطوط گالیوں سے بھرے ہوئے آتے ہیں۔ جن کا مجھے محصول ڈاک بھی دینا پڑتا ہے۔ کھولتا ہوں۔ تو گالیوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ اشتہاروں میں گالیاں دی جاتی ہیں۔ اور اب تو کھلے لفافوں پر گالیاں لکھ کر بھیج دیتے ہیں۔ لیکن ان باتوں سے کیا ہوتا ہے اور خدا کا نور کہیں بجھ سکتا ہے۔ ہمیشہ انبیاء اور راستبازوں کے ساتھ ناشکروں نے یہی سلوک کیا ہے۔ ہم جس بزرگ کے نقشِ قدم پر آئے ہیں یعنی مسیح ناصری۔ اس کے ساتھ کیا سلوک ہوا؟ اور پھر ہمارے نبی کریمؐ کے ساتھ کیا سلوک ہوا؟ اب تک ناپاک طبع لوگ آپؐ کو گالیاں دیتے ہیں۔ میں تو بنی نوع انسان کا حقیقی خیر خواہ ہوں۔ جو شخص مجھے دشمن سمجھتا ہے۔ وہ خود اپنی جان کا دشمن ہے ہو

اتنے میں حضرت مسیح موعودؑ اپنے مکان کے قریب پہنچ گئے۔ اور مسٹر عبدالحق صاحب سے فرمایا۔ کہ آپ مہمان ہیں۔ آپ کو جس چیز کی تکلیف ہو۔ مجھے بے تکلف کہہ دیں۔ کیونکہ

میں تو اندر رہتا ہوں۔ اور نہیں معلوم ہوتا کہ کس کو کیا ضرورت ہے؟ اور آجکل تو مہمانوں کی کثرت کی وجہ سے بعض اوقات خادم بھی غفلت کر سکتے ہیں۔ آپ اگر اپنی ضروریات کو زبانی کہنا پسند نہ کریں۔ تو مجھے لکھ کر بھیج دیا کریں۔ مہمان نوازی تو میرا فرض ہے۔ (الحکم جلد ۶ ۔ ۵)

۲۴ دسمبر ۱۹۰۱ء ۔ گذشتہ دن کی تقریر سنائے جانے کے بعد آج صبح مسٹر عبدالحق صاحب کے ذیل کے سوال کے جواب میں حضرت مسیح موعود نے تقریر فرمائی:۔

مسٹر عبدالحق صاحب ۔ کفارہ کا مسئلہ تو میں نے سمجھ لیا ہے۔ اب آپ تثلیث کا رد فرمائیں۔

حضرت مسیح موعود ۔ میں نے سب سے پہلے اسی لئے آپ سے کہا تھا۔ کہ آپ اپنے اعتراضات جو اسلام پر ہوتے ہیں۔ پیش کریں۔ اور اسی لئے میں نے اپنی تقریر کے ضمن میں جہاد غلامی۔ تعدد ازدواج وغیرہ مضامین پر بھی کچھ باتیں بیان کی تھیں۔ تاکہ آپ کو ان پر بھی اعتراضات کرنے کا موقع نکل آئے۔ میری یہی رائے ہے۔ کہ ہر ایک طالب حق کا فرض ہے۔ کہ جو بات اس کے دل میں خلجان کرے۔ وہ فوراً پیش کر دے۔ ورنہ وہ اندر ہی اندر ایمان کو کمزور کر دیگی۔ اور روحانی قوائے پر برا اثر ڈالیگی۔ جس طرح سے کہ اگر کوئی انسان خراب اور گندی غذا کھالے۔ تو وہ پیٹ کے اندر جا کر کئی قسم کی خرابیاں پیدا کرتی ہے۔ اور قے یا دستوں کی صورت میں باہر نکلتی ہے۔ اسی طرح کسی قسم کا کوئی گندہ عقیدہ دل کے اندر رکھ کر فساد کرنے سے نہیں رکتا۔ اور اس کا فساد یہی ہوتا ہے۔ کہ انسان کے اخلاق اور چال چلن پر برا اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اُسے ایک مجذوم کی مانند کر دیتا ہے۔ اس لئے جو بھی اعتراض آپ کے دل میں کسی مسئلہ کے بارہ میں کھٹکتا ہو۔ آپ اُسے ضرور دریافت کریں۔ تثلیث کے رد میں میں مختصراً کہہ چکا ہوں۔ اسلئے اب میں آپ سے اُس کی تائید کے دلائل سننا چاہتا ہوں۔ چونکہ آپ اسے مدار نجات سمجھتے ہیں اس لئے اس کا بار ثبوت بھی آپ کے ذمہ ہے۔ کیونکہ اس امر میں آپ ایک گروہ کثیر سے اختلاف رکھتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص دنیا کی ایک معمولی مسلمہ بات کے خلاف کہ انسان آنکھ سے دیکھتا۔ کان سے سنتا۔ زبان سے بولتا اور چکھتا ہے۔ یہ دعویٰ کرے کہ انسان آنکھ سے بولتا ہے اور کان سے دیکھتا ہے۔ تو لازمی طور پر بار ثبوت ایسے مدعی کے ذمہ

ہوتا ہے۔ اسی طرح پر تثلیث کا مسئلہ ہے۔ یہودی جو ابراہیمی سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں اس مسئلہ سے انکار کرتے اور صاف طور پر کہتے ہیں۔ کہ ان کی کتابوں میں تثلیث کا نام و نشان تک نہیں۔ اسی طرح جملہ پیغمبروں کی تعلیم میں تثلیث کا نام تک نہیں پایا جاتا۔ برخلاف اسکے توحید کی تعلیم ہر ایک مذہب اور ملت میں پائی جاتی ہے۔ جو کسی پیغمبر کے نام پر جاری ہے اور آسمان زمین پانی غرض ہر جگہ دوسرا معبود خدا تجویز کرنے کی ممانعت آئی ہے۔ قانون قدرت بھی توحید کی ہی تائید کرتا ہے۔ اور باطنی شریعت میں توحید کے ہی نقوش قائم ہیں اب آپ جو نقل۔ عقل اور باطنی شریعت کے بالکل برخلاف اس بات کے مدعی ہیں۔ کہ خدا ایک نہیں بلکہ تین ہیں تو اس عجیب اور نئے مسئلے کا بار ثبوت بھی آپ کے ذمہ ہے۔ رکیک تاویلات سے کام نہیں چلتا اور نہ ایسی تاویلات سے تسکین قلب ہو سکتی ہے۔ آپ خود ہی اپنے دل میں غور کر کے انصاف کریں۔ کہ راستباز کے بغیر کوئی شخص وہ کام نہیں کر سکتا جو میں کرتا ہوں۔ اسلئے جسقدر مفصل طور پر آپ اس مسئلہ کی تائید میں لکھ سکیں وہ لکھ کر مجھے سنا دیں۔ لیکن اتنا خیال رہے کہ دعوی اپنے نفس میں بہت ابہام رکھتا ہے۔ بعض انسانوں کو یہ دھوکا لگ جاتا ہے۔ کہ وہ دعوی اور دلیل میں فرق نہیں کر سکتے دعوی کیلئے دلیل ایک روشن چراغ ہوتی ہے۔ اسلئے آپ دعوی اور اس کے دلائل میں فرق کا خیال رکھیں۔

مسٹر عبدالحق صاحب۔ میں کل تثلیث کے ثبوت لکھ کر سنا دوں گا۔

۲۶ دسمبر ۱۹۰۱ء۔ صبح کی سیر کے وقت مسٹر عبدالحق صاحب نے ایک مختصر سی تقریر تثلیث اور الوہیت مسیح کی خفانیت کے بارہ میں سنائی۔ جس پر حضرت مسیح موعودؑ نے سلسلہ تقریر شروع فرمایا۔

حضرت مسیح موعودؑ۔ اصل بات یہ ہے۔ کہ یہ بات ہر ایک شخص کو معلوم ہے۔ جس سے کوئی بھی دانشمند انکار نہیں کر سکتا۔ کہ ہر ایک آدمی جو کسی غلطی میں مبتلا یا غلط خیال میں گرفتار ہے۔ وہ اپنی تائید میں کوئی نہ کوئی وجوہات رکیکہ ضرور رکھتا ہے۔ لیکن ایک سمجھدار اور سلیم الفطرت انسان انکی توزین کر کے اصل نتیجہ یعنی سچائی کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی اصول کے مطابق عیسائی صاحبان نے بھی اپنے عقیدہ تثلیث کی تائید میں کچھ باتیں گھڑ رکھی ہیں۔ جن کو وہ دلائل قرار دیتے اور سمجھتے ہیں۔ لیکن اپنے آپ کو معلوم

ہو جائیگا۔ کہ یہ دلائل کیا وقعت رکھتے ہیں۔ اور کہاں تک ان میں سچائی اور زور ہے۔ جس صورت میں کہ خود عیسائیوں میں ایسے فرقے موجود ہیں۔ جو نہ تو مسیح کی الوہیت کے قائل ہیں۔ اور نہ تثلیث کو ہی مانتے ہیں۔ جیسے مثلاً یونیٹیرین۔ تو کیا وہ اپنی تائید میں اناجیل سے دلائل بیان نہیں کرتے؟ کرتے ہیں۔ اور ضرور وہ اناجیل سے ہی اپنی تائید میں دلائل پیش کر کے تثلیثی مذہب کو جھٹلاتے ہیں۔ اب اگر اناجیل میں الوہیت مسیح اور تثلیث کا صراحتاً ذکر ہوتا۔ تو کوئی وجہ نہ تھی کہ یونیٹیرین فرقہ اس کی تردید کر کے اس کا انکار کرتا۔ حالانکہ وہ اناجیل کو دیگر عیسائی فرقوں کی طرح سچا مانتا ہے جو پیشگوئیاں الوہیت مسیح اور تثلیث کی تائید میں توریت کی پیش کی جاتی ہیں۔ اُن کے متعلق بھی یہ فرقہ کلام رکھتا ہے۔ ایک یونیٹیرین کی بعض تحریریں بھی اب تک میرے پاس موجود ہیں۔ تو کیا ان دلائل کو اس فرقہ نے اب تک نہیں پڑھا اور سمجھا۔ قرآن شریف نے کیا خوب فرمایا ہے کل حزب بما لدیھم فرحون۔ میری مراد مندرجہ بالا بیان سے یہ ہے۔ کہ تاویلات رکیکہ اور ظنی باتیں تو ہر ایک باطل پرست بھی اپنی تائید میں پیش کر سکتا ہے۔ کیا ہمارا فرض نہ ہونا چاہیئے کہ ہم ان پر پورا پورا غور کریں۔ یونیٹیرین لوگوں نے تثلیث پرستوں کے دلائل اور توراۃ کی پیشگوئیوں کی تاویلات رکیکہ سن کر صاف طور پر کہدیا ہے۔ کہ یہ ایسی بودی اور قابل شرم باتیں ہیں۔ جو کسی کے سامنے پیش کرنے کے لائق نہیں۔ اور اگر انہیں دلائل کی بنا پر الوہیت مسیح اور تثلیث ثابت ہو سکتی ہے۔ تو پھر بائیبل سے ہر ایک فضول امر کا ثبوت نکل سکتا ہے۔ لیکن ایک محقق کیلئے غور طلب یہ بات ہے کہ وہ ان کو پڑھکر ایک امر تنقیح قرار دے اور پھر اندرونی اور بیرونی واقعات کی بنا پر غور کی نگاہ سے اُنہیں سوچے۔ توراۃ کی پیشگوئیوں کے متعلق جہانتک میں کہہ سکتا ہوں۔ مندرجہ ذیل امور قابل غور ہیں:۔

اوّل۔ کیا ان پیشگوئیوں کا مطلب یہودیوں نے بھی جنکی کتب میں یہ درج ہیں یہی سمجھا ہوا تھا کہ ان سے تثلیث یا الوہیت مسیح کا ثبوت نکلتا ہے۔

دوم۔ کیا خود مسیح نے بھی اس امر کو تسلیم کیا کہ یہ پیشگوئیاں اس کے حق میں ہیں۔ اور پھر اپنے آپ کو ان کا مصداق قرار دیکر اس کا عملی ثبوت پیش کیا۔ اگرچہ اس امر پر اور بھی لمبی چوڑی بحث ہو سکتی ہے۔ کیا درحقیقت یہ پیشگوئیاں اصل کتاب میں اسی طرح درج بھی ہیں یا نہیں۔ لیکن اسکی چنداں ضرورت نہ سمجھ کر مندرجہ بالا ہر دو تنقیح طلب امور پر نظر کرتے ہیں۔

یہودیوں نے جو اصل وارث کتاب توریت کے ہیں اور جن کے بارہ میں خود مسیح نے

نے کہا ہے۔ کہ وہ موسیٰ کی گدی پر بیٹھے ہیں۔ کبھی بھی ان پیشگوئیوں کے وہ معنے نہیں کئے جو آپ یا دیگر عیسائی صاحبان کرتے ہیں۔ اور وہ کبھی بھی ایسے مسیح کے منتظر نہیں تھے۔ جو تثلیث کا ایک جزو ہو۔ اس بارہ میں میں مفصل طور پر پہلے بیان کر چکا ہوں۔ عیسائی صاحبان محض زبردستی کی راہ سے ان پیشگوئیوں کو حضرت مسیح پر چسپاں کرتے ہیں۔ جو کسی صورت سے بھی اُن پر صادق نہیں آسکتیں۔ ان کے بیان کو سچا سمجھنے کیلئے علماء یہود کی شہادت ان کی تائید میں پیش کرنی چاہیے کہ وہ بھی ان سے یہی مراد لیتے تھے۔ جو آپ لوگ لیتے ہیں۔ پھر انجیل کو جو کوئی بہت بڑی کتاب نہیں پڑھ کر دیکھ لو۔ اس میں بھی کہیں نہیں لکھا۔ کہ حضرت مسیح نے ان پیشگوئیوں کو پورا نقل کر کے یہ کہا ہو۔ کہ ان کے رو سے وہ خدا ہیں۔ اور یہ ان کی الوہیت کے دلائل ہیں۔ کیونکہ نرا دعویٰ تو کسی دانشمند کے نزدیک قابل سماعت نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ اس کے دلائل بھی ساتھ نہ ہوں۔ اور یہ بات بجائے خود ایک دعویٰ ہے کہ ان پیشگوئیوں میں مسیح کو خدا کہا گیا ہے مسیح نے خود تو کبھی خدائی کا دعویٰ نہ کیا۔ تو کسی دوسرے کا انہیں خواہ مخواہ خدا بنانا نہایت عجیب بات ہے۔ اور اگر بالفرض محال اُنہوں نے خدائی کا دعویٰ کیا بھی ہو۔ تو ان کے اقوال و افعال میں اسقدر تناقض پایا جاتا ہے کہ کوئی عقلمند اور دانشمند خدا ترس آدمی اُنہیں خدا کہنا تو درکنار ایک عظیم الشان انسان بھی بمشکل مان سکتا ہے۔ عیسائیوں کے اس دعویٰ کو رد کرنے کیلئے تو خود انجیل ہی کافی ہے۔ جس میں کہیں بھی مسیح کا یہ دعویٰ نہیں پایا جاتا۔ بلکہ جس جگہ اُنہیں اپنی خدائی منوانے کا موقعہ ملا۔ وہاں اُنہوں نے صاف جواب دے دیا۔ اور ان ساری پیشگوئیوں کے مصداق ہونے سے انکار کر دیا۔ ان کے افعال و اقوال مندرجہ اناجیل مروجہ بھی اسی کی تائید میں ہیں۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کیلئے یہ ضروری امر ہوتا ہے۔ کہ اس کے اقوال و افعال میں تناقض نہ پایا جائے۔ حالانکہ اناجیل میں صریح تناقض موجود ہے۔ مثلاً ایک جگہ مسیح کا قول موجود ہے۔ کہ باپ کے سوا قیامت کا علم کسی کو نہیں ہے۔ اب اگر بقول عیسائی صاحبان باپ اور بیٹے کی عینیت ایک ہی ہے۔ تو کیا مسیح کا یہ قول اس مقولہ کا مصداق نہیں ہے کہ "دروغ گو را حافظہ نباشد" کیونکہ ایک جگہ تو دعویٰ الوہیت اور دوسری جگہ الوہیت کی صفات سے انکار۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے۔ کہ اناجیل میں مسیح کی نسبت بیٹے کا لفظ آیا ہے۔ تو اس کے جواب میں ہمیں یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ اناجیل محرف یا مبدل ہیں۔ بلکہ ان کے پڑھنے والوں پر یہ امر مخفی نہیں۔ کہ ان میں بیٹے کا لفظ عام طور پر مستعمل ہے۔ اسرائیل کی نسبت لکھا ہے۔ کہ اسرائیلی فرزند من

بلکہ نخست زادۂ من است۔ اس سے بڑھکر اور کونسا لفظ ہوگا۔ اسی طرح بائیبل سے خدا کی بیٹیاں بھی ثابت ہوتی ہیں۔ اور ان سب سے بڑھکر خود لفظ خدا کا اطلاق بھی انسانوں پر ہوا ہے اب ایسی صورت میں ہر ایک منصف مزاج دانشمند غور کر سکتا ہے۔ کہ اگر ابن کا لفظ عام نہ ہوتا۔ تو تعجب کا مقام ہوتا۔ لیکن جب کہ یہ لفظ عام طور پر مستعمل ہے اور آدم بھی شجرہ ابناء میں داخل ہے اسرائیل کو نخست زادہ کہا گیا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس لفظ کا کثرت استعمال مقدس اور ر استیاز انسانوں پر محض حسنِ ظن کی وجہ سے ہوا ہے۔ اس لئے ایسی صورت میں جب تک مسیح پر اس لفظ کے اطلاق کی خصوصیت نہ بتائی جائے کہ کیوں اسکی ابنیت دیگر راستبازوں سے کسی علیحدہ طرز کی ہے۔ اُس وقت تک محض اس لفظ کا استعمال کچھ مفید اور مؤثر نہیں ہو سکتا کیونکہ جب یہ لفظ عام اور قومی محاورہ کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ تو مسیح پر دیگر لوگوں سے کوئی زائد معنے پیدا نہیں کر سکتا۔ ہم اس لفظ کو مسیح کی خدائی یا ابنیت کی دلیل مان لیتے اگر یہ لفظ کسی اور ر استباز کی نسبت استعمال نہ ہوتا۔ میں سچے طور پر خدا تعالیٰ کا خوف مدنظر رکھ کر کہتا ہوں کہ ایک پاک دل اور باضمیر انسان کیلئے محض یہ کہہ دینا کچھ اثر نہیں رکھتا۔ کہ یہ لفظ مسیح کی نسبت استعمال ہوا ہے۔ جب تک کہ یہ بھی نہ دکھا دیا جائے۔ کہ دیگر لوگوں کے بارے میں یہ لفظ کبھی کسی اور جگہ استعمال نہیں ہوا۔ اور یا مسیح کی نسبت فلاں قوی وجوہات کی بنا پر دیگر لوگوں سے ممتاز اور خاص خصوصیت رکھتا ہے۔ یہ عجیب دورنگی ہے۔ کہ جب حضرت مسیح کیلئے وہ لفظ آ جائے تو اُسے خدا بنا دیا جائے اور جب دوسروں کے بارے میں آئے۔ تو وہ انسان کے انسان ہی رہیں۔

پھر اگر یہ اعتقاد رکھا جائے۔ کہ خود خدا ہی دنیا میں آ کر لوگوں کو نجات دیا کرتا ہے یا اس کے بیٹے آیا کرتے ہیں۔ تو اس سے دَور لازم آئیگا۔ اور ہر زمانہ میں خدا اور اس کے بیٹوں کا آنا ماننا پڑیگا جو بالکل غلط بات ہے۔ ان سب امور کو علیحدہ رکھ کر ہم پوچھتے ہیں۔ کہ وہ کونسے نشانات تھے جن سے حقیقتہً مسیح کی خدائی ثابت ہوتی ہے۔ کیا اس کے معجزات تھے؟ اگر یہی تھے۔ تو سب سے پہلے مسیح کے معجزات کا ثبوت ہی نہیں ملتا۔ کیونکہ جب اناجیل نویسوں کی سچائی اور عینی شہادت کا ہی کوئی ثبوت نہیں۔ کہ انہوں نے یہ حالات بطور ایک محقق اور چشم دید واقعات کے لکھے ہیں اور اگر تھوڑی دیر کیلئے مان بھی لیا جائے۔ کہ یہ فی الحقیقت معجزات تھے۔ تب بھی ان میں کوئی رونق اور قوت نہیں پائی جاتی۔ ایک تالاب کا قصہ ہی مسیح کے جملہ معجزات کی رونق کو دور کر دینے کے لئے کافی ہے۔ پھر اگر مقابلتہً دیکھا جائے۔ تو انبیائے سابقین کے معجزات کسی حالت میں بھی مسیح کے

معجزات سے کم درجہ نہیں رکھتے۔ بلکہ بعض صورتوں میں بہت بڑھکر ہیں۔ اور بائیبل کے مطالعہ کرنے والوں سے یہ امر پوشیدہ نہیں۔ کہ سابقہ انبیاء سے بھی مُردوں کا زندہ ہونا ثابت ہے بلکہ بعض کی ہڈیوں سے مُردوں کا لگ کر زندہ ہو جانا ثابت ہے حالانکہ اسکے مقابل پر مسیح کے حواریوں میں کچھ اثر نہیں پایا جاتا کیونکہ مسیح کی لاش سے کسی مُردہ کو زندہ نہیں کیا۔ پھر بتاؤ کہ کون سی چیز مسیح کو خدا بنا سکتی ہے کیا پیشگوئیاں؟ ان کی حقیقت میں پہلے بتا چکا ہوں کہ مسیح کی پیشگوئیاں پیشگوئی کا رنگ ہی نہیں رکھتیں۔ جو امور اُن پیشگوئیوں میں درج ہیں۔ وہ ایسے ہیں کہ ایک معمولی آدمی بھی ان سے بہتر پیشگوئیاں کر سکتا ہے۔ اور قیافہ شناس اہل ہر کی پیشگوئیاں تو ان سے بدرجہا بڑھ کر ہوتی ہیں۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ اگر اس وقت حضرت مسیح ہوتے تو جس قدر عظیم الشان تائیدی نشان پیشگوئیوں کے رنگ میں خدا تعالیٰ نے میرے ہاتھ پر صادر کئے ہیں۔ وہ انہیں دیکھ کر شرمندہ ہو جاتے۔ اور اپنی ایسی پیشگوئیوں کا کہ زلزلے آئینگے۔ مری اور قحط پڑیگے۔ مرغ بانگ دیگا۔ کبھی ہمارے ندامت کے نام بھی نہ لیتے۔ پھر آپ ہی ہمیں بتائیں کہ ہم کس طرح پر مان لیں کہ مسیح خدا تھا۔ خدائی کا دعویٰ اس کا موجود نہیں۔ صحف سابقہ کی پیشگوئیوں کا اپنے متعلق ہونے کا اس نے کوئی ثبوت نہیں دیا۔ اور سب سے بڑھکر یہ کہ خدائی صفات اس میں مفقود ہیں۔ قیامت کے بارہ میں اس کا اقرار موجود ہے۔ کہ اُسے اس کا کوئی علم نہیں۔ باپ بیٹے کے متحد فی الوجود ہونیکے باوجود ان میں سے ایک کا عالم ہونا اور دوسرے کا جاہل ہونا قابلِ غور امر ہے۔ تقدیس کا یہ حال کہ خود کہتا ہے۔ کہ اُسے نیک نہ کہو اور صرف باپ کو ہی نیک ٹھہراتا ہے یہ اختلافات باپ اور بیٹے کی عینیت کے خلاف ہیں۔ صرف لفظ ابن کا استعمال اُس کی خدائی کو ثابت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ حقیقت اور مجاز میں باہمی تفریق کرنے کا ہمیں کوئی اختیار نہیں۔ کہ ایک جگہ تو کہدیں کہ یہاں ابن سے مجاز مراد ہے۔ اور دوسری جگہ حقیقت یہی لفظ بائیبل میں دیگر انبیاء بنی اسرائیل اور قاضیوں کے بارے میں استعمال ہو تو کہا جائے کہ اس سے مجاز مراد ہے اور جب یہی لفظ مسیح کی نسبت بولا جائے تو اس سے حقیقت مراد ہے۔ اور اس پر اس کی خدائی اور الوہیت کی بنیاد کھڑی کی جائے یہ امر راستی اور انصاف کے خلاف ہے۔ گویا کہ خود ایک نئی شریعت اور کتاب کی بنیاد رکھنا ہے۔ جس سے کوئی فائدہ نہیں۔ پادری صاحبان تخیلی اور فرضی باتوں کی بنا پر مسیح کی خدائی کے ثبوت کیلئے بڑے ہاتھ پاؤں مارے ہیں۔ لیکن آج تک میری نظر سے ان کا کوئی ایسا رسالہ یا تحریر نہیں گذری۔ اور کوئی پادری مجھے

ایسا نہیں ملا۔ جس نے مسیح کے معجزات کے چہرہ سے تالاب کے قصے کے داغ کو دور کیا ہو۔ اور جب تک انجیل میں یہ قصہ درج ہے۔ اس داغ کا اُٹھنا محال ہے۔ میں بار بار آپ کو اس امر کی طرف توجہ دلاتا ہوں۔ کہ آپ دیکھیں کہ مسیح میں کونسی صفاتِ خداوندی از روئے اناجیل پائی جاتی ہیں۔ باقی رہا پولوس کی تحریریں جن سے مسیح کی خدائی کا ثبوت پیش کیا جاتا ہے۔ سو وہ اپنے چال چلن کے لحاظ سے بجائے خود نہایت غیر معتبر ٹھیرتا ہے۔ پھر اس کے بارے میں مسیح کی کوئی پیشگوئی موجود نہیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ ایک دانشمند انسان اُسے کس طرح خدا سمجھ لے۔ اور ایسے خدا کی کون پرستش کر سکتا ہے؟ مسیح کی زندگی اُسکی پوری ناکامی اور نامرادی کی تصویر ہے۔ اگر آج وہ زندہ ہوتا۔ تو اُن نشانات کو دیکھ کر جو اس مسیح کے ہاتھ پر صادر ہوئے ہیں۔ شرمندہ ہو جاتا۔ کیا مسیح کی قبولیت دعا کا یہی حال ہے۔ کہ ساری رات چلاتا رہا۔ اور کسی نے بھی کچھ نہ سُنا۔ اور پھر آخری ساعت میں خدا کا شکوہ کرتا ہوا رخصت ہوا۔ کہ ایلی ایلی لما سبقتانی۔ اِس وقت جو خدا تعالیٰ نے مجھے مامور کر کے بھیجا ہے۔ جو نشانات اُس نے میری تائید میں ظاہر کئے۔ اُنکی نظیر پیش کرنی محال ہے۔ مثلاً یہی ڈگلس صاحب کی عدالت والا مقدمہ جو دیندار پادریوں کی کوشش اور ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسری پھیر دینے کی تعلیم دینے والوں کی طرف سے مجھ پر کیا گیا۔ کئی سو آدمی اس بات کے گواہ موجود ہیں۔ کہ کس طرح پر قبل از وقت کل واقعات سے اطلاع دی گئی تھی۔ اور خدا تعالیٰ نے کس طرح مجھے ہر قسم کی ذلت سے محفوظ رکھا۔

پہلے پہل امرت سر میں جب یہ مقدمہ دائر کیا گیا۔ تو وہاں کے ڈپٹی کمشنر نے چالیس ہزار روپیہ کی ضمانت کے ساتھ میرے نام وارنٹ جاری کرنے کا حکم دیدیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت کہ وہ اسکی تعمیل نہ کرا سکا۔ اور وارنٹ کا اجرا نہ ہو سکا۔ اور وہ اسی کی کتاب میں رہ گیا۔ بعد ازاں جب اسے یہ معلوم کرایا گیا۔ کہ ایسے وارنٹ کا اجرا ناجائز ہے۔ تو اُس نے وارنٹ کو روکنے کیلئے گورداسپور تار دے دی۔ لیکن وہ ابھی تک وہاں پہنچا ہی نہ تھا۔ آخر کار یہ مقدمہ چلا۔ اور عیسائی پادریوں نے ہر طرح سے مجھے سزا دلانے کی کوشش کی۔ لیکن خدا تعالیٰ نے اپنی قدرت کا ہاتھ دکھایا۔ اور میری اہانت چاہنے والوں کی بڑی بھاری اہانت ہوئی۔ ڈگلس صاحب ڈپٹی کمشنر نے نہایت عزت و احترام کے ساتھ مجھے بلایا اور اپنی عدالت میں کرسی دی۔ حالانکہ مجھے ان باتوں کی ذرہ بھی پرواہ نہیں۔ آریہ اور بعض میرے مخالف مسلمان بھی پادریوں کی امداد پر تھے

پنڈت رام بھجدت پلیڈر آریہ لاہور بلا فیس پادریوں کے مقدمہ کی پیروی کرتا تھا۔ اور اس نے مجھے خود کہا۔ کہ وہ اس لئے اس مقدمہ میں شریک ہوا ہے۔ کہ لیکھرام کے قاتل کا سراغ مل جائے مولوی محمد حسین بٹالوی پادریوں کی طرف سے گواہ بنکر آیا۔ اور ڈپٹی کمشنر سے کرسی مانگ کر بہت ذلیل ہوا۔ آخر جب ساری عدالتی کارروائی ہو چکی۔ تو عبدالحمید مدعی نے صاف صاف اقبال کر لیا کہ میں نے اُسے قتل کیلئے بھیجا تھا۔ جب مقدمہ کی پوری شکل تیار ہو گئی۔ تب خدا تعالیٰ نے اپنی قدرت کی چمکار دکھائی۔ اور ڈگلس صاحب کے دل میں ڈال دیا۔ کہ یہ سارا مقدمہ جھوٹا ہے۔ اس نے کپتان لیمار چینڈ صاحب کو بُلا کر کہا۔ کہ اُسے اس مقدمہ میں اطمینان نہیں۔ دوبارہ عبدالحمید سے اصلیت دریافت کرو۔ آخر کپتان صاحب کے روبرو عبدالحمید نے اصل راز اور پادریوں کی سازش کا حال بیان کر دیا۔ کہ اُسے جھوٹ موٹ سکھایا گیا تھا۔ اس پر ڈپٹی کمشنر صاحب کو تار دیا گیا۔ اور مجھے عزت سے بری کیا گیا۔ مقدمہ کا نتیجہ بعینہٖ ویسا ہی ظہور پذیر ہوا۔ جیسا کہ اُسکی پیشگوئی اس کے نام و نشان سے بہت عرصہ پہلے تمام شہروں میں شائع ہو چکی تھی۔ علاوہ اس کے لیکھرام و دیگر نشانات بھی ہیں۔ جماعت کے لحاظ سے بھی اگر دیکھا جائے۔ تو مسیح سخت ناکام اُٹھا۔ خود حواریوں نے اس کے سامنے جھوٹی قسمیں کھائیں اور اس پر لعنت بھیجی۔ اور ادھر یہ حال ہے کہ ہمارے ایک مخلص دوست عبدالرحمٰن نام کو جو فواح کابل کا باشندہ تھا محض ہماری مریدی کی وجہ سے ایک سال تک قید رکھا گیا۔ لیکن اُس نے موت کو انکار پر ترجیح دی۔ آخر اُسے جیسا کہ معلوم ہوا ہے۔ گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا۔ اور جیسا اُس نے کہا تھا۔ اُس کے مرنے کے بعد ایک نشان ظاہر ہوا۔ مجھے افسوس ہے کہ عیسائی صاحبان اپنے ایمان کی متاع پولوس کی باتوں پر ہار دیتے ہیں۔

انجیل کا ایک بہت بڑا حصہ اللہ تعالیٰ کی توحید کی تعلیم دیتا ہے۔ مثلاً جب مسیح کو یہودیوں نے اس کے اس کفر کے بدلے کہ یہ ابن اللہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے پتھراؤ کرنا چاہا۔ تو اس نے اُنہیں جواب دیا کہ کیا تمہاری شریعت میں یہ نہیں لکھا۔ کہ تم خدا ہو۔ اب ایک دانشمند آدمی سوچ سکتا ہے۔ کہ اس الزام کے وقت تو چاہیئے تھا کہ مسیح اپنی خدائی کا زور سے دعویٰ کرتا اور اُنہیں اپنی خدائی کے نشانات دکھا کر اچھی طرح ملزم کرتا۔ اگر وہ فی الواقعہ خدا یا خدا کا بیٹا تھا۔ تو یہ جواب کیوں دیتا کہ یہ کفر نہیں۔ بلکہ اُسے چاہیئے تھا۔ کہ یہودیوں کو کہتا کہ وہ واقعی خدا کا بیٹا ہے۔ جس کے ثبوت میں تمہاری کتابوں میں فلاں جگہ لکھا ہے۔

کہ میں ہی قادرِ مطلق عالم الغیب خدا ہوں۔ اور ان کی کتابوں سے نکال کر دکھا دیتا۔ اور ساتھ ہی اس کے اپنی خدائی کی قدرت اور طاقت کا اظہار بھی اُن کے روبرو کر دیتا۔ اور اس سے پہلے بھی جو کام اپنی خدائی کے دکھا چکا تھا۔ ان کی فہرست یہودیوں کو الگ بتا دیتا۔ پھر اسکی خدائی کے ایسے بیّن ثبوتوں کی موجودگی میں کسی یہودی فقیہ یا فریسی کی مجال تھی۔ کہ انکار کرتا۔ وہ ایسی قدرتوں اور نشانوں والے خدا کو دیکھ کر سجدے کرتے۔ لیکن اُسکے خلاف یسوع نے کیا کیا۔ یہ کہ جب اُنہوں نے اس پر خدائی کے دعویٰ کا الزام دیا۔ تو یہ کہکر اپنا پیچھا چھڑایا۔ کہ تمہیں بھی تو کتابوں میں خدا لکھا ہے۔ اس جواب سے ایک خداترس آدمی اسی نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ اُس نے اپنی خدائی کا ابطال کیا۔ نہ کہ اثبات کی غرض یہ ایسی باتیں ہیں۔ کہ اُن کے بیان کرنے سے بھی شرم آتی ہے۔ میں اس کو آپ کے انصاف پر ہی چھوڑتا ہوں۔ کہ تورات۔ اسلام۔ قانونِ قدرت بالطبع شریعت یہ سب کے سب توحید کی شہادت دیتے ہیں۔ اور ایک پادری یسوع کی خدائی کے یہ دلائل دیتا ہے۔ کہ کتب سابقہ میں اسکی بشارتیں ہیں۔ جن کو یہودیوں نے کبھی تسلیم نہیں کیا۔ کہ وہ خود خدا یا اس کے بیٹے کیلئے ہیں۔ بلکہ وہ مسیح کے آنے سے بہت پہلے پوری ہو چکی تھیں پھر اناجیل کے بعض اقوال پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ خود اناجیل کا یہ حال ہے کہ اُن کے اصل نسخہ کا پتہ ہی نہیں۔ کیونکہ انجیل عبرانی زبان میں تھی۔ جو یسوع کی مادری زبان تھی۔ اور موجودہ اناجیل کا اصل نسخہ یونانی زبان میں پایا جاتا ہے۔ خود یسوع اپنی ایک علیحدہ انجیل کا ذکر کرتا ہے پھر یسوع نے کہیں اپنی خدائی کا دعویٰ نہیں کیا۔ یہودیوں کے پتھراؤ کرنے اور اس کفر کے الزام پر ان کا قومی اور کتابی محاورہ پیش کر کے نجات پائی۔ لیکن اپنی خدائی کا کوئی قوی ثبوت پیش نہ کیا۔ اور انسانی طاقت سے بڑھکر کوئی خارق العادت کام کر کے نہ دکھایا۔ معجزات اور پیشگوئیوں کی حالت ہی عجیب ہے علم کا یہ حال کہ اتنا پتہ نہیں۔ کہ انجیر کے درخت کو اس وقت پھل نہیں لگا ہوگا۔ اختیار کا یہ حال کہ اسے پھل بھی نہ لگا سکا۔ ساعت کا علم نہیں۔ ضعف و ناتوانی کا یہ حال کہ طمانچے اور کوڑے کھاتا ہوا صلیب پر چڑھایا گیا۔ یہودی تمسخر کرتے ہیں۔ کہ اگر خدا کا بیٹا ہے تو صلیب سے اُتر آ۔ اُترنا تو درکنار۔ اُن کو کچھ جواب بھی نہیں دیتا۔ چال چلن کا وہ حال کہ استاد بھی عاق کر دیتا ہے اور یہودیوں کے الزامات کئی اوپر کی لپتوں پر ہوتے ہیں۔ اور کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا جاتا (الحکم جلد ۶ ۱۷) اور پھر مسیح کے حالات مندرجہ اناجیل کو پڑھو۔ تو صاف طور پر معلوم ہو جائے گا۔ کہ یہ شخص کبھی بھی اس قابل نہیں ہو سکتا۔ کہ اسے خدا کا نبی کہا جائے چہ جائیکہ اسے خدا یا خدا کا بیٹا

کہا جائے۔

تدبیر عالم اور جزاء و سزا کیلئے عالم الغیب ہونا ضروری امر ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان صفت ہے۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے بیان کر آیا ہوں۔ کہ مسیح کا قول ہے کہ اُسے قیامت تک کا علم نہیں۔ اور نہ اُسے اتنی خبر تھی۔ کہ بے موسم انجیر کے درخت کے پاس شدت بھوک سے بیقرار ہو کر پھل کھانے کیلئے جاتا ہے۔ اور درخت کو جسے بذات خود کوئی اختیار نہیں ہے۔ کہ بغیر موسم کے پھل دے سکے۔ بد دعا دیتا ہے۔ اوّل تو وہ خدا کیا ہوا۔ جسے بھوک لگی۔ اور پھر یہ خوبی صرف انجیلی خدا میں ہی پائی جاتی ہے۔ کہ وہ بھوک سے بیقرار ہو جاتا ہے۔ اور ایک درخت کی طرف پھل کھانے کیلئے دوڑتا ہے۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ اتنا بھی علم نہیں رکھتا۔ کہ اس درخت پر پھل نہیں ہے۔ حالانکہ ایک معمولی دنیا دار شخص کو بھی اسبات کا علم ہوتا ہے۔ کہ کونسے موسم میں انجیر کے درخت کو پھل لگتا ہے۔ اگر بالفرض اُسے اسقدر بھی علم نہ تھا تو بایں وہاں اپنی خدائی کا ہی کوئی کرشمہ دکھا دیتا۔ اور اس درخت کو بے موسم پھل لگا دیتا تاکہ دنیا کے لئے ایک نشان ہو جاتا۔ لیکن اتنی طاقت تو تھی نہیں۔ بیچارے بے جان درخت کو کوسنا شروع کر دیا۔ ان باتوں کی موجودگی میں کونسا ایسا امر ہے۔ جس کی بنا پر اُسے خدا بنایا جائے۔ میں آپ سے سچی خیر خواہی سے کہتا ہوں کہ تکلفات سے کچھ نہیں بنتا۔ کیا جو شخص ایک ہی وقت اپنی دو حیثیتیں بتاتا ہے یعنی باپ ہونے کی بھی اور بیٹا ہونے کی بھی پھر خدا ہونے کی بھی اور انسان ہونے کی بھی کیا ایسا شخص دھوکا باز نہیں۔ انجیل کے جن مقامات کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ اُن کے سیاق و سباق پر نظر ڈالنے سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ حوالہ جات یسوع کی خدائی ثابت کرنے کیلئے کافی نہیں ہیں۔ اور اُن سے تو صرف اُس کی انسانیت کا ہی ثبوت ملتا ہے اور انسانیت کے لحاظ سے بھی اُسے عظیم الشان انسانوں میں داخل نہیں کر سکتے۔ مثلاً جب اُسے نیک کہا گیا۔ تو اُس نے نیک کہلائے جانے سے انکار کیا۔ اگر بقول عیسائی صاحبان اس کی روح میں کامل تطہر اور پاکیزگی تھی۔ پھر وہ نیک کہلائے جانے سے کیوں انکار کرتا رہا اس امر کو چھوڑ کر بھی اس کی زندگی پر بہت سے دوسرے اعتراضات و الزامات وارد ہوتے ہیں۔ جن کا کوئی تسلی بخش جواب اُن کے پیروؤں کی طرف سے میری نظر سے نہیں گذرا۔ ایک یہودی نے حضرت مسیح کی سوانح عمری لکھی ہے۔ جو یہاں میرے پاس

موجود ہے۔ اس میں اُس نے لکھا ہے۔ کہ یسوع ایک لڑکی پر عاشق ہو گیا تھا۔ جب وہ اپنے استاد کے سامنے اپنی معشوقہ کے حسن و جمال کا تذکرہ کر بیٹھا۔ تو استاد نے اُسے عاق کر دیا۔ پھر خود اناجیل کے مطالعہ سے جو کچھ مسیح کی حالت کا پتہ لگتا ہے۔ وہ آپ سے بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ کہ کس طرح پر وہ نامحرم نوجوان عورتوں سے ملتا جلتا تھا۔ اور کسطرح پر ایک بازاری عورت سے عطر ملواتا تھا۔ پھر اُنہیں اناجیل سے اسکی بعض نادانیوں اور وادیوں کی جو حالت ظاہر ہوتی ہے۔ وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔ ان میں سے تین جو مشہور و معروف ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں۔ بنت۔ سبع۔ راحاب۔ تمر۔ پھر یہودیوں نے جو الزامات خود اس کی والدہ پر لگائے ہیں۔ وہ بھی ان کتابوں میں درج ہیں۔ اگر ان پر بیجائی نظر ڈالی جائے تو اس کا یہ قول کہ "مجھے نیک نہ کہو"۔ اپنے اندر کچھ حقیقت رکھتا معلوم دیتا ہے۔ اور یہ محض فروتنی اور انکساری کے طور پر نہ تھا۔ جیساکہ بعض عیسائی کہتے ہیں۔ اب میں دریافت کرتا ہوں۔ کہ جس شخص کے اپنے ذاتی چال چلن کا یہ حال ہو۔ اور حسب نسب کا یہ۔ تو کیا خدا بھی ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ یاد رکھو یہ باتیں اللہ تعالیٰ کے تقدس کے صریح خلاف ہیں۔ خدا تعالیٰ اپنی قدرت سے علیحدہ نہیں ہوا۔ حالانکہ یسوع کی نسبت صاف طور پر معلوم ہے۔ کہ نہایت ناتواں اور بے علم تھا۔ پھر اس کی راستبازی میں بھی کلام ہے۔ پہلے اس نے دعویٰ کیا کہ وہ داؤد کا تخت قائم کرنے کیلئے آیا ہے۔ اور حواریوں کو کپڑے بیچ کر تلواریں خریدنے کی بھی تعلیم دی۔ لیکن جب اس طرح دال گلتی نظر نہ آئی۔ تو اُسے یہ کہکر ٹال دیا۔ کہ اس سے مراد آسمانی بادشاہت ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں۔ کہ کیا داؤد کا تخت آسمانی تھا؟ اصل بات یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ ابتدا میں اُسے خیال نہ تھا۔ کہ اس کی مخبری کی جائیگی۔ لیکن آخر جب مخبری ہو گئی۔ اور عدالتوں میں طلبی ہوئی۔ تو آنکھ کھلی۔ اور اپنے اس قول سے مراد آسمانی سلطنت کہکر اسے ٹالا۔ بھلا اس قسم کا ضعف اور بے علمی اور ایسا چال چلن ہوتے ہوئے کہیں خدائی کا دعویٰ کرتا۔ کہیں خدا کا بیٹا کہلاتا اور ساتھ ہی انسان ہونا یہ جملہ امور ایک ہی وقت جمع ہو جائیں۔ نہایت ہی حیرتناک بات ہے۔ باقی رہا پولوس کا اجتہاد یا اس کے اقوال۔ جن لوگوں نے پولوس کے چال چلن پر غور کی ہے اور جیساکہ اس کے خطوط کے بعض فقرات سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ ہر مذہب والے کے رنگ میں بدل جایا کرتا تھا۔ آپ کو خوب معلوم ہے۔ آزاد خیال لوگوں نے اسکی تواریخ میں صاف طور پر

لکھا ہے۔ کہ وہ اچھے چال چلن کا آدمی نہ تھا۔ اور بعض تواریخ کی کتابوں سے پایا جاتا ہے کہ وہ ایک کاہن کی لڑکی پر عاشق تھا۔ اور ابتدا میں اُس نے بڑے بڑے دُکھ عیسائیوں کو دیئے۔ لیکن بعد میں جب اُسے اپنے مقاصد میں کامیابی کا کوئی ذریعہ نظر نہ آیا۔ تو ایک خواب گھڑ کر اپنے آپ کو حواریوں کا جمعدار بنالیا۔ خود پادریوں کو اس امر کا اعتراف ہے۔ کہ وہ بڑا سنگدل اور خراب آدمی تھا۔ وہ یونانی زبان پڑھا ہوا تھا۔ میں نے جہاں تک غور کی ہے۔ یہی معلوم ہوا ہے۔ کہ ساری خرابی اس کاہن کی لڑکی ہی کے معاملہ کی تھی سارا عیسائی مذہب کے ساتھ اپنی دشمنی کا مکمل اظہار کرنے کیلئے اُس نے یہ آخری طریق سوچا کہ اپنا اعتبار جمانے کیلئے ایک خواب گھڑ کر سُنادی۔ اور عیسائی ہوگیا۔ اور پھر یسوع کی تعلیم کو اپنی طرز پر ایک بالکل نئی تعلیم کے ڈھنگ میں ڈھالدیا۔ میں سچ سچ کہتا ہوں۔ کہ موجودہ عیسائی مذہب کی خرابی اور اسکی بدعات کا اصل بانی یہی شخص تھا۔ علاوہ بریں میں یہ کہتا ہوں۔ کہ اگر یہ شخص ایسا ہی عظیم الشان تھا۔ اور وہ واقعی یسوع کا رسول تھا۔ اور عیسائی مذہب میں اتنے بڑے انقلاب کا موجب ہونے والا تھا۔ اور باوجود سخت مخالف ہونے کے پھر یسوع کا رسول بننے والا تھا۔ تو کسی جگہ اناجیل سے اس کے بارے میں یسوع کی کوئی پیشگوئی نکال کر دکھادو۔ جہاں اس کی صفات اور نام ونشان دیا ہوا ہو۔ نیز یہ بھی بتایا گیا ہو۔ کہ وہ یسوع کی خدائی کو ثابت کریگا۔ ورنہ یہ کیا اندھیر ہے؟ کہ پطرس کے لعنت کرنے اور یہوداسکریوطی کے گرفتار کرانے کی پیشگوئیاں تو یسوع کردے۔ لیکن مذہب عیسوی کے اتنے بھاری مجتہد کے بارے میں کوئی پیشگوئی نہ کرجائے۔

ایسے حالات کی موجودگی میں اس شخص کی کوئی بھی بات قابلِ سند نہیں ہوسکتی۔ اور جو کچھ اُس نے کہا ہے۔ وہ کونسے دلائل پر مبنی ہے اور بجائے خود نرے دعوے ہی دعوے ہیں۔ میں بار بار کہتا ہوں۔ اور مکرر سہ کرر اس بات کو بیان کرتا ہوں۔ کہ آپ اسے اچھی طرح سمجھ لیں۔ اور یسوع کی خدائی کا رد کرنے کیلئے خود اُنہیں اناجیل کو پڑھیں۔ جو کافی طور پر اسکی تردید سے پُر ہیں۔ اگر یسوع واقعی خدا تھا۔ تو کیوں اس نے بالکل نرالی طرز کے معجزات نہ دکھائے۔ میں نے یہ اچھی طرح تحقیق کرلیا ہے۔ کہ یسوع کے معجزات کی حقیقت سلب امراض سے کچھ بھی بڑھی ہوئی نہ تھی۔ جس میں آجکل یورپ کے مسمریزم کرنے والے وہنود اور دیگر لوگ بھی مشاق ہوتے ہیں۔ اور اس کے خیالات ایسے بیہودہ اور اسطحی تھے

کہ صرع کے مریض کو کہتا ہے۔ کہ اس میں جن گھسا ہوا ہے۔ حالانکہ اگر صرع کے مریض کو کوئی کچلا اور فولاد استعمال کرائیں۔ اور اس کے دماغ میں رسولی نہ ہو تو وہ اچھا ہو جاتا ہے۔ بھلا جن کو مرگی سے کیا تعلق۔ چونکہ یہودیوں کے خیالات ایسے کمزور ہو گئے تھے۔ اسلئے یسوع نے بھی انکی تقلید میں ایسا ہی کہدیا۔ اور یا یہ کہ جیسا آجکل جادو ٹونے کرنے والے کیا کرتے ہیں کہ بعض ادویات کی سیاہی سے تعویذ لکھکر علاج کرتے ہیں۔ اور بیماری کو جن بتاتے ہیں ویسے ہی وہ بھی کرتا ہو۔ مجھے نہایت افسوس ہے کہ یسوع کے معجزات پر مسلمانوں نے بھی غور نہیں کی۔ اور عیسائیوں کی دیکھا دیکھی اور اُن سے سُن سنا کر اُن کے غلط معنے کر لئے۔ مثلاً اکمہ کا لفظ ہے۔ جس کے معنی شبکور کے ہیں۔ اور مسلمان اب اس کے یہ معنے کر لیتے ہیں کہ وہ مادر زاد اندھوں کو شفا دے دیا کرتا تھا۔ حالانکہ اکمہ وہ مرض ہے۔ کہ جس کا علاج بکرے کی کلیجی کھانا بھی ہے۔ جس سے اس مرض سے شفا ہو جایا کرتی ہے۔ اناجیل کا یسوع ضعف۔ ناتوانی۔ بیکسی۔ اور نامرادی کی سچی تصویر ہے۔ اور عام کمزوریوں میں دیگر انسانوں کے شریک۔ کوئی خاص امر اس میں نہیں پایا جاتا۔ کتب سالقہ کی پیشگوئیوں کا جو ذخیرہ پیش کیا جاتا ہے۔ ان میں صدہا اختلافات ہیں۔ اوّل تو خود یہودیوں کی تفاسیر میں اُن پیشگوئیوں کے وہ معنے نہیں لکھے۔ جو عیسائی لوگ کرتے ہیں۔ اور دوم ان تفاسیر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ پوری ہو چکی ہوئی تھیں۔ عرصہ ہوا ایک شخص میرے پاس آیا تھا۔ اور انہیں امور پر اس سے گفتگو ہوئی تھی۔ آخر اللہ تعالیٰ نے اس پر اپنا فضل کیا اور وہ مسلمان ہو گیا۔ اور مسلمان ہی مرا۔

انبیائے بنی اسرائیل کی تعلیم کے اصل وارث تو یہودی ہی تھے۔ جو ہمیشہ سے اُن سے تعلیم پاتے چلے آئے تھے۔ اس لئے اُن کا حق تھا۔ کہ وہ ان پیشگوئیوں کی صحیح تفسیر کریں۔ اور خود مسیح نے بھی فقیہوں اور فریسیوں کی بات ماننے کا حکم دیا تھا۔ گو ان کے اعمال کی پیروی سے منع کیا تھا۔ یہودیوں اور عیسائیوں میں یہی اختلاف ہے۔ کہ اول الذکر کہتے ہیں۔ کہ وہ پیشگوئیاں پہلے زمانہ میں پوری ہو چکی ہوئی ہیں۔ اور مؤخر الذکر اُن سے ابنیت اور الوہیت مسیح نکالتے ہیں۔ انصاف کے رو سے یہودی ہی حق پر معلوم ہوتے ہیں۔ جنہوں نے ہمیشہ انبیاء سے تعلیم حاصل کی۔ اور اُن کی باتوں سے اپنے ایمانوں کی تجدید کرتے رہے۔ اور برابر چودہ سو برس تک خدا کی باتیں سنتے چلے آئے۔ حضرت مسیح حضرت موسیٰؑ

سے چودہ سو سال بعد یعنی چودھویں صدی میں آئے تھے۔ اور جس طرح اُمّت موسوی کو ایک مسیح دیا گیا تھا کہ تا موسوی جنگوں کے اعتراضات کو اپنی تعلیم سے دور کرے اور خاتمہ جنگ و جدال پر نہ ہو ویسے ہی اس اُمّت کیلئے مثیل موسیٰؑ یعنی حضرت محمد رسول اللہ کے خلفاء میں سے چودھویں صدی پر ایک مسیح مبعوث کیا گیا تا اپنی پاک تعلیم کے ذریعہ سے جہاد کے غلط خیال کی اصلاح کرے اور ثابت کر دے کہ اسلام تلوار کے ذریعہ سے ہرگز نہیں پھیلایا گیا۔ بلکہ صرف اپنے حقائق اور معارف کی وجہ سے پھیلا ہے۔ غرض پیشگوئیوں کی تفسیر کرنے میں یہودی لوگ عیسائیوں پر غالب آ جائینگے اور حق بھی اُنکے ساتھ ہوگا۔ اور جہاں تک دیکھا گیا ہے۔ عیسائیوں کی نسبت وہ بات بھی معقول کہتے ہیں جیسے مثلاً نزول ایلیا کے بارے میں اُنہوں نے مسیح سے کہا اور جس کے بارہ میں اُن کے ہاتھ میں شہادات کا ایک بڑا بھاری سلسلہ موجود ہے اگر کوئی شخص پسند کرے تو ہم اب بھی اُنکی کتابیں منگوا کر دکھا سکتے ہیں۔ یہی بات میں نے سراج الدین سے کہی تھی۔ دیکھو ایک انسان جب ایک برتن کو بھی لیتا ہے تو اُسے بڑے غور سے دیکھ بھال لیتا ہے پھر ایمان کے بارہ میں کیوں اتنی لاپرواہی کی جاتی ہے۔ مسیح کے بارہ میں کتب سابقہ کی پیشگوئیاں تو یوں رد ہو گئیں اب باقی رہے اناجیل کے اقوال سو سب سے پہلے تو ہم یہ کہتے ہیں۔ کہ جب اصل انجیل ہی جو مسیح پر نازل ہوئی تھی۔ ان لوگوں کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ تو کیوں نہ یہ امر قرین قیاس مانا جائے۔ کہ مسیح کے کلمات میں بہت کچھ تاویل کی جا چکی ہے۔ مسیح اور اس کی ماں کی زبان عبرانی تھی۔ اور جس ملک میں وہ رہتے تھے وہاں عبرانی بولی جاتی تھی۔ صلیب پر چڑھ کر جو آخری کلمات مسیح کے مُنہ سے نکلے۔ وہ عبرانی تھے۔ یعنی ایلی ایلی لما سبقتانی۔ اب بتاؤ جب اصل انجیل کا ہی پتہ ندارد ہے۔ تو موجودہ تراجم اناجیل کی بنا پر کسی شخص کو کیوں یہ حق نہیں پہنچ سکتا ہے کہ وہ اصل اناجیل کا مطالبہ کرے۔ علاوہ ازیں انجیل میں مسیح کا اپنا قول موجود ہے۔ کہ میری انجیل۔ اب اس لفظ پر بھی غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انجیل کا کوئی اصل مسودہ بھی تھا۔ جسے خود مسیح نے لکھا تھا۔ اور یہ نبی کا فرض ہوتا ہے۔ کہ وحی الٰہی کی خود حفاظت کرے۔ اور اس کی حفاظت کا کام دوسروں پر نہ چھوڑ دے۔ کہ وہ جو چاہیں لکھ دیں۔ پولوس کے بارہ میں میں پہلے کہہ آیا ہوں کہ جس شخص کی تقریروں یا تحریروں پر مسیح کی ساری خدائی کا انحصار تھا۔ نہایت تعجب کی بات ہے۔

کہ خدا ہو کر اس کے بارے میں ایک لفظ بھی پیشگوئی کا نہ منہ سے نکلا۔ حالانکہ ایسے شخص کیلئے تو چاہیئے تھا کہ وصیت نامہ لکھ جاتے۔ کہ اُن کی وفات کے بعد پولوس اُن کے مذہب کا جمعدار مقرر کیا جائیگا۔ جب اُن میں سے کوئی بات بھی نہیں۔ تو اُسے کیا حاصل تھا۔ کہ خود بخود مسیح کے مذہب کا مجتہد بن بیٹھا اُسے ایسا سرٹیفکیٹ (سند) ملا کہاں سے تھا۔ انہی وجوہات کی بنا پر یہ بالکل صحیح ہے کہ موجودہ مذہب عیسوی عیسوی نہیں۔ بلکہ پولوسی ہے۔ الغرض صدق اور اخلاص بڑی نعمت ہے۔ جس شخص کو خدا تعالیٰ مرحمت فرمائے مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے اور میں حلفاً کہتا ہوں کہ میں تو اپنے دشمن کا بھی سب سے بڑھ کر خیر خواہ ہوں۔ بشرطیکہ کوئی میری باتوں کو سُنے بھی۔ یہ جو کچھ میں نے کہا ہے۔ آپ اس پر غور کریں اور پھر جو کمی رہ جائے اُسے پھر بیان کریں تاکہ میں اُسے دوبارہ بیان کردوں جونہی حضرت مسیح موعود نے یہ تقریر ختم کی۔ اڈیٹر الحکم نے عرض کیا کہ مسٹر عبدالحق صاحب نے اپنی تقریر میں پادری عماد الدین کے حوالہ سے ایک بات تثلیث کے ثبوت میں پیش کی ہے۔ اور وہ یہ کہ وضو کرتے وقت تین دفعہ ہاتھ دھوتے ہیں جو تثلیث کا نشان ہے۔ اس پر بھی روشنی ڈالی جائے۔

حضرت مسیح موعودؑ - یہ تو بالکل بیہودہ اور کچی باتیں ہیں اگر ایسے اور اس طرح کے ثبوت دینے ہوں تو جتنے چاہے خدا بنالو۔ عماد الدین کی ایسی ہی باتوں پر پادری رجب علی نے ایک ریویو لکھا تھا۔ جس میں اُس نے بڑا واویلا کیا تھا۔ کہ ایسی ایسی باتوں سے عیسویت کی توہین ہوتی ہے۔ چونکہ وہ ظریف طبع تھا اسلئے اُس نے لکھا۔ کہ عماد الدین نے تثلیث کے ثبوت میں یہ بات رہ گئی اور پھر ایک ایسی مثال دی جو قابل ذکر نہیں۔ عماد الدین ایک جاہل آدمی تھا میں نے اُسے اُردو کی عبارت کا ہی مطلب بیان کرنے کی دعوت تھی لیکن وہ جواب نہ دے سکا اور میری کتاب نور الحق کا ابھی تک اُس سے کوئی جواب نہیں بن آیا۔ حالانکہ اُسکے جواب کیلئے پانچ ہزار روپیہ انعام بھی مقرر تھا۔ ایسی باتیں تو پیش کرتے ہوئے شرم بھی آنی چاہیئے دیکھو آخر مرنا ہے۔ خدا سے ہمیشہ ڈرنا چاہیئے۔ دین کے معاملہ میں بڑی غور و فکر درکار ہے اور پھر خدا کا فضل بھی (الحکم جلد ۶ ۷)

۲۷ دسمبر ۱۹۰۱ء - بعد نماز عصر در مسجد اقصیٰ حضرت مسیح موعودؑ نے ذیل کی تقریر فرمائی سب کو متوجہ ہو کر سُننا چاہیئے اور پورے غور اور فکر کے ساتھ سُنو۔ کیونکہ یہ معاملہ

ایمان کا معاملہ ہے۔ اس میں غفلت سستی اور عدم توجہی بہت بُرے نتائج پیدا کرتے ہیں جو لوگ ایمان کے معاملہ میں غفلت سے کام لیتے ہیں اور جب اُن کو مخاطب کر کے کچھ بیان کیا جائے تو اُسے غور سے نہیں سُنتے ہیں۔ اُن کو بولنے والے کے بیان سے خواہ وہ کیسا ہی اعلیٰ درجہ کا مفید اور مؤثر کیوں نہ ہو۔ کچھ بھی فائدہ نہیں ہوتا۔ ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں۔ جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ کان رکھتے ہیں لیکن سنتے نہیں۔ دل رکھتے ہیں لیکن سمجھتے نہیں۔ پس یاد رکھو۔ کہ جو کچھ بیان کیا جائے اُسے پوری توجہ اور غور سے سُنو۔ کیونکہ جو شخص توجہ سے نہیں سنتا ہے وہ خواہ ایک عرصہ دراز تک فائدہ رسان وجود کی صحبت میں رہے اُسے کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ جب خدا تعالیٰ انبیاء کو دنیا میں مامور کر کے بھیجتا ہے۔ تو اس وقت دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو اُن کی باتوں پر توجہ کرتے اور کان دھرتے ہیں۔ اور جو کچھ وہ کہتے ہیں۔ اُسے پورے غور سے سُنکر اس پر عمل کرتے ہیں۔ یہ فریق وہ ہوتا ہے جو فائدہ اُٹھاتا ہے اور سچی نیکی اور اس کے برکات و ثمرات کو پالیتا ہے۔ دوسرا فریق وہ ہوتا ہے۔ جو ان کی باتوں کو توجہ اور غور سے سُننا تو درکنار رہا اُن پر ہنسی کرتے اور اُن کو طرح طرح کے دُکھ دینے کیلئے منصوبے سوچتے اور کوششیں کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے نبی کریمؐ جب مبعوث ہوئے۔ تو اس وقت بھی اسی سنت اللہ کے مطابق دو فریق تھے۔ ایک وہ جس نے حضرت نبی کریمؐ کی باتوں کو سُنا اور پورے غور سے سُنا اور پھر آپ کی باتوں سے ایسے متاثر ہوئے اور آپ پر ایسے فدا ہو گئے کہ والدین اور اولاد۔ احبا اور اعزہ غرض دنیا میں جو چیز اُنہیں عزیز تریں ہو سکتی تھی۔ اس پر آپ کے وجود کو مقدم کر لیا۔ اچھے بھلے آرام سے بیٹھے تھے۔ برادری اور احباب کے تعلقات سے اپنے خیال کے مطابق لطف اُٹھا رہے تھے۔ لیکن اس پاک وجود کے ساتھ تعلق پیدا کرتے ہی وہ سارے رشتے اور تعلق اُن کو چھوڑنے پڑے اور ان سب سے الگ ہونے میں اُنہوں نے ذرا بھی تکلیف محسوس نہ کی۔ بلکہ راحت اور خوشی سمجھی۔ اب غور کرنا چاہیئے کہ ہمارے نبی کریمؐ کے پاس وہ کیا چیز تھی۔ جس نے ان لوگوں کو ایسا گرویدہ بنا لیا۔ کہ وہ آپ پر اپنی جانیں دینے کیلئے تیار ہو گئے اور اپنے تمام دنیوی مفاد۔ منافع اور تمام ملکی اور قومی تعلقات کو قطع کرنے کیلئے آمادہ ہو گئے۔ نہ صرف آمادہ بلکہ اُنہوں نے قطع تعلق کر کے اور اپنی جانوں کو فدا کر کے دکھا دیا کہ وہ آپ کے ساتھ کس خلوص اور ارادت سے ہمراہ ہوئے تھے۔ بظاہر آپؐ کے پاس کوئی مال و دولت نہ تھا

جو ایک دنیادار انسان کیلئے تحریص اور ترغیب کا موجب ہو سکے۔ خود آپ نے یتیمی میں پرورش پائی تھی۔ وہ اوروں کو کیا دے سکتے تھے۔ میں پھر کہتا ہوں۔ کہ بلا شک آپ کے پاس کوئی مال و دولت اور دنیوی تحریص و ترغیب کا ذریعہ نہ تھا۔ اور ہرگز نہ تھا۔ لیکن آپ کے پاس وہ زبردست چیزیں جو حقیقی اور اصلی مؤثر اور جاذب ہیں موجود تھیں وہی آپ نے پیش کیں اور انہوں نے ہی ایک دنیا کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ چیزیں تھیں حق اور کشش۔ یہ ہر دو چیزیں ہی ہوتی ہیں۔ جن کو انبیاء لیکر دنیا میں آیا کرتے ہیں۔ اور جب تک یہ دونو چیزیں موجود نہ ہوں۔ انسان کسی ایک سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ اور نہ کسی دوسرے کو فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ حق ہو لیکن ساتھ اُس کے کشش نہ ہو تو کیا حاصل؟ کشش ہو لیکن حق نہ ہو تو اس سے کیا فائدہ۔ بہت سے لوگ ایسے دیکھے گئے ہیں۔ جو اس دنیا میں موجود ہیں۔ جن کی زبان پر حق ہوتا ہے لیکن دیکھا گیا ہے کہ وہ حق مفید اور مؤثر ثابت نہیں ہوتا۔ کیوں؟ وجہ یہ کہ وہ حق صرف ان کی زبان پر ہے لیکن دل اُس سے آشنا نہیں۔ اور وہ کشش جو دل کی قبولیت کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ اس کے پاس نہیں ہے۔ اس لئے وہ جو کچھ کہتا ہے محض اوپر کے دل سے کہتا ہے۔ جس کا سُننے والے پر کچھ اثر نہیں ہوتا سچی کشش۔ حقیقی جذب اور حقیقی تاثیر اس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب وہ اس حق کو جسے وہ بیان کرتا ہے نہ صرف خود قبول کرے۔ بلکہ اس پر عمل کر کے اس کے چمکتے ہوئے نتائج اور خواص کو اپنے اندر رکھتا ہو۔ جب تک انسان خود سچا ایمان ان امور پر جو وہ بیان کرتا ہے نہیں رکھتا اور سچے ایمان کے اثرات اپنے اعمال سے نہیں دکھاتا اُس کے اقوال ہرگز ہرگز مؤثر اور مفید نہیں ہوتے اور وہ باتیں صرف بدبودار ہونٹوں سے نکلتی ہیں۔ جو دوسروں کے کانوں تک پہنچتے ہیں اور بھی بدبودار ہو جاتی ہیں۔ بلکہ میں سچ کہتا ہوں کہ ایسے ظالم اور سفاک لوگ حق کا یوں بھی خون کرتے ہیں۔ کہ چونکہ اس کے برکات اور درخشاں ثمرات ان کے ساتھ نہیں ہوتے۔ اس لئے سُننے والے محض خیالی اور فرضی باتیں سمجھ کر اُن کی پرواہ بھی نہیں کرتے اور یوں دوسروں کو محروم کرتے ہیں۔

غرض یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ وہ شخص جو دنیا کی اصلاح اور بہتری کا مدعی ہو جبتک اپنے ساتھ حق اور کشش نہ رکھتا ہو دنیا کو کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ اور وہ لوگ جو توجہ اور غور سے ایسے مصلح کی بات کو نہیں سُنتے وہ اس سے بھی کسی قسم کا فائدہ حاصل نہیں کر سکتے جو کشش اور حق بھی اپنے ساتھ رکھتا ہو۔ جیسا کہ خدا تعالیٰ کا قانون قدرت ہے کہ رات کے بعد دن اور

دن کے بعد رات آتی ہے۔ اور اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں۔ بعینہٖ اسی طرح دنیا پر بھی مختلف زمانے آتے رہتے ہیں۔ کبھی روحانی طور پر رات ہوتی ہے اور پھر کبھی روحانی آفتاب طلوع ہو کر نیا دن چڑھتا ہے۔ چنانچہ گذشتہ ایک ہزار سال جو گذرا ہے۔ وہ روحانی طور پر ایک تاریک رات کی طرح سے تھا۔ جس کا نام حضرت نبی کریمؐ نے فجیح اعوج رکھا تھا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کا ایک دن ہے۔ جیسا کہ فرمایا۔ انّ یوماً عند ربک کالف سنۃ مما تعدون۔ اس ہزار سال میں دنیا پر ایک خطرناک ظلمت کی چادر چھائی ہوئی تھی۔ جس میں ہمارے نبی کریمؐ کی عزت کو ایک ناپاک کیچڑ میں ڈالنے کیلئے پوری پوری مکاریوں حیلہ سازیوں اور تدابیر سے کام لیا گیا تھا۔ اور خود وہ لوگ جو مسلمان کہلاتے تھے۔ ہر قسم کے شرک اور بدعات میں گرفتار ہو گئے تھے۔ جس گروہ کے بارہ میں حضرت نبی کریمؐ نے فرمایا۔ لیسو منّی ولست منھم یعنی نہ وہ مجھ سے ہیں اور نہ میں اُن سے ہوں۔ غرض اللہ تعالیٰ کے فرمانے کے مطابق یہ ہزار سالہ تاریک رات گذر گئی ہے۔ اور اب اسکی رحمت نے تقاضا فرمایا کہ دنیا کو روشنی سے حصہ دے اور جن لوگوں میں اس روشنی سے فائدہ حاصل کرنے کی قابلیت ہے۔ وہ اُس سے مستفید ہوں۔ کیونکہ ہر ایک شخص اس قابل نہیں ہوتا کہ اس سے حصہ لے سکے۔ چنانچہ اُس نے مجھے اس صدی پر مامور کر کے بھیجا ہے۔ تاکہ میں اسلام کو دوبارہ زندہ کروں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ پورے اور کامل طور پر اصلی معنوں میں اپنے مشن میں کامیاب نہ ہو سکے۔ کیونکہ وہ اپنی قوم کے بہت بڑے حصہ کو خلاصی نہ دلا سکے اور ان کی تھوڑی سی غیر حاضری میں اُن کی قوم بگڑ گئی۔ باوجودیکہ حضرت ہارونؑ اُن میں موجود تھے۔ لیکن قوم نے گوسالہ پرستی شروع کر دی۔ اور پھر مختلف قسم کے شکوک و شبہات پیش کرتے رہے۔ ساری قوم نے کبھی بھی انشراح قلب کے ساتھ باوجود بہت سے نشانات و معجزات کے دیکھنے کے راہ راست اختیار نہ کیا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کی ناکامی بھی ظاہر ہے۔ موجودہ اناجیل سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ خود اُن کے حواری بھی بگڑ گئے تھے۔ اور بعضوں نے مرتد ہو کر اُن پر لعنتیں کیں۔ حضرت موسیٰؑ کی گدی پر بیٹھنے والے فقیہہ اور فریسی اس آسمانی نور سے بے نصیب رہے۔ اور اُنہیں یہ توفیق نہ ملی۔ کہ وہ اُن سچی باتوں کو جو حضرت عیسیٰؑ لائے تھے۔ توجہ سے سنتے اور اُنہیں قبول کرتے۔ اگرچہ کہا جائے گا۔ کہ اُن کو بہت سی

مشکلات پیش آئیں۔ جو مسیح کی علامتوں اور نشانات کے متعلق پیشگوئیوں کے رنگ میں تھیں۔ لیکن اگر وہ توجہ کرتے اور رشید ہوتے اور اُن کو قوت حاسہ ملی ہوئی ہوتی تو ضرور فائدہ حاصل کر لیتے۔ اور کوشش اور زور سے اُن مشکلات سے نکل جاتے۔ اُن امور اور واقعات پر غور کرنے سے طبعاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ ایسا کیوں ہوا کرتا ہے اس کا مختصر جواب یہی ہے۔ کہ انسان اپنی ہی غفلت سے ہلاک ہوتا ہے۔ جو لوگ انبیاء اور مامورین کی باتوں کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ اور اس کے وجود کو بیہودہ اور فضول خیال کرتے ہیں اور اسکی پاکیزہ باتوں پر کسی قسم کا غور نہیں کرتے۔ اس کے نتیجہ میں وہ لازمی طور پر تمام فوائد سے محروم رہ جاتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا۔ کہ مامور کی بات کو نہایت توجہ اور غور سے سننا چاہیئے۔ لیکن جو لوگ ان کی باتوں کی طرف توجہ اور غور نہیں کرتے۔ ان کی مثال یہی ہے۔ کہ کان رکھتے ہوئے نہیں سُنتے۔ اور آنکھیں رکھتے ہوئے نہیں دیکھتے اور دل رکھتے ہوئے نہیں سوچتے۔ یہی لوگ ہیں جن کے دلوں پر قفل لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور جن کے کانوں اور آنکھوں پر پردہ ہوتا ہے اور اسی لئے وہ اللہ تعالیٰ کے ماموروں اور مرسلوں کی باتوں پر ہنسی کرتے اور اُن سے فائدہ نہ حاصل کر کے تمام فوائد سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اور آخر کار عذاب الٰہی میں گرفتار ہو جاتے ہیں لیکن جو لوگ حسن ظن سے کام لیکر صبر و استقلال سے ماموروں کی باتوں کو توجہ سے سنتے ہیں وہ ضرور فائدہ حاصل کر لیتے ہیں۔ اور سچائی کی چمک اُن کے دل کو روشن کر دیتی ہے۔ اور اُن کی آنکھیں کھُل جاتی ہیں۔ اور ان کے کانوں میں سُننے کی ایک نئی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اُن کا دل ان باتوں پر غور و خوض کرتا ہے۔ جس سے اُن میں عمل کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ تسکین قلب حاصل کر لیتے ہیں۔ دنیا میں بھی ہم یہی قانون قدرت دیکھتے ہیں کہ جب ایک انسان کو نیکی اور بھلائی کرنے کا موقع ملے۔ اور وہ اُسے جان بوجھکر ضائع کر دے۔ تو وہ اس موقع کے ضائع ہو جانے سے غم و ہم اور ایک قلبی درد محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح پر جو لوگ انبیاء اور مامورین کا زمانہ پاکر اُسے ضائع کر دیتے ہیں۔ وہ عذاب الٰہی میں گرفتار ہو جاتے ہیں افسوس ہے۔ کہ دنیادار لوگ اس راز سے بیخبر ہیں۔ اگر اُن کو مردہ لوگوں کے حالات پر اطلاع مل سکتی۔ اور مُردے دنیا میں دوبارہ اپنے حالات سُنا سکتے۔ تو دنیا کے سارے لوگ فرشتوں کی سی زندگی بسر کرنے والے ہوتے۔ اور دنیا میں

گناہ پر ایک موت طاری ہو جاتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں چاہے۔ اور اس معاملہ کو پردۂ خفا میں ہی رکھا۔ تاکہ نیک اعمال کرنے والوں کی نیکی کا اجر اور ثواب ضائع نہ ہو جائے۔ دیکھو۔ اگر امتحان شروع ہونے سے پہلے ہی سوالات کو شائع کر دیا جائے۔ تو ان کے جوابات دینے میں کسی شخص کی لیاقت اور قابلیت کیا معلوم ہو سکتی ہے۔ اسی طرح پر اللہ تعالیٰ نے مواخذہ کا طریق افراط و تفریط سے بچا کر رکھا ہے اگر وہ سارے کے سارے پردے کھول دیتا۔ اور کوئی امر بھی مخفی اور پوشیدہ نہ ہوتا۔ اور مُردے آکر کہدیا کرتے کہ جنت و نار سب حق ہیں۔ تو بتاؤ کہ دنیا میں کوئی شخص دہریہ اور بُت پرست رہ سکتا تھا؟ مثلاً اگر اس گاؤں کے ہی دو چار مُردے زندہ ہو کر مرنے کے بعد کی ساری حقیقت آکر اپنے بیٹوں۔ پوتوں اور عزیز و اقارب کو آکر بتا دیں۔ تو پھر کون روگردان رہ سکتا ہے؟ کوئی بھی نہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں چاہا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص آفتاب کے وجود پر ایمان لائے۔ کہ وہ موجود ہے۔ اور روشنی دیتا ہے۔ تو اس ایمان کا اُسے کیا ثواب مل سکتا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ اسی طرح پر اللہ تعالیٰ نے ایمان کی قدر و قیمت اور نیکی کی جزا کے لئے یہ پسند فرمایا ہے۔ کہ کچھ اخفا بھی ہو۔ ایک دانشمند آدمی سعادت حاصل کرتا ہے اور بے وقوف اس سے محروم رہ جاتا ہے۔ پھر علاوہ ازیں کوئی ایمانی امر ایسا نہیں ہے کہ جس کی تہ کے نیچے کوئی حقیقت اور فلسفہ نہ ہو۔ اس اخفا میں یہ عظیم الشان فلسفہ ہے۔ کہ اگر ایسا کامل انکشاف ہو جاتا اور کوئی چیز مخفی نہ رہتی۔ معاد کا سارا حال اور اللہ تعالیٰ کی رضا کا بخوبی طور پر پتہ معلوم ہو جاتا۔ تو نیکی نیکی نہ رہتی اور نہ اُس کی کوئی قدر و منزلت ہوتی۔ محسوس اور مشہود چیزوں پر ایمان لانے سے کوئی ثواب نہیں مل سکتا۔ ایک مسجد یا درخت یا آفتاب کی ہستی پر ایمان لانے والا اور ان کے وجود کا اعتراف کرنے والا کسی جزا کا مستحق نہیں ہے۔ لیکن جو شخص کسی مخفی امر کو عقل و فکر سے معلوم کر کے اس پر ایمان لاتا ہے۔ تو بلا شک وہ قابل تعریف فعل کرنے والا ٹھہرتا ہے۔ اور ہر قسم کی مدح و تعریف کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ جب ہر ایک امر کا کامل انکشاف ہو گیا تو پھر اجر کیا؟ مثلاً اگر کوئی شخص ۲۹ دن کے ہلال کو دیکھتا ہے۔ تو اسکی نظر قابل تعریف سمجھی جاتی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص چودہ دن کے چاند کو جب وہ بدر ہو چکا ہو اور ساری دنیا میں اس کی کامل روشنی پھیل چکی ہو۔ دیکھ کر لوگوں کو کہتا پھرے کہ آؤ میں تمہیں چاند دکھاؤں۔ تو وہ مسخرا

اور فضول گو ٹھہرایا جائیگا۔ غرض ہر شخص کی قابلیت اس کی فراست سے ظاہر ہوتی ہے۔ اللہ تعالےٰ نے کچھ امور اخفا میں رکھے ہیں۔ اور کچھ ظاہر کر دیئے ہیں۔ اگر وہ ہر ایک امر کو بالکل ظاہر کر دیتا۔ تو ایمان کا ثواب جاتا رہتا۔ اور اگر ہر ایک امر کو پردۂ اخفا میں رکھتا۔ تو جملہ مذاہب تاریکی میں دبے رہتے اور کوئی امر بھی قابل اطمینان نہ رہتا۔ اور کوئی مذہب دوسرے کو غلطی پر نہ کہہ سکتا۔ اور نہ ہی مواخذہ کا اصول قائم رہ سکتا۔ کیونکہ یہ تکلیف بالایطاق تھی۔ جس کے بارہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لایکلف اللہ نفساً الا وسعہا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے۔ کہ اُس نے انسان کیلئے ہلکا سا امتحان رکھا ہوا ہے۔ جس میں کوئی لمبی چوڑی مشکلات نہیں۔ باوجودیکہ دوسرا عالم ایسا ادق ہے۔ کہ انسان کی سمجھ سے باہر ہے۔ اور جو شخص وہاں جاتا ہے واپس نہیں آتا۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے انوار و برکات کا ایک سلسلہ قائم کر رکھا ہے۔ جس کے ذریعہ سے اسی دنیا میں پتہ لگ جاتا ہے۔ اور آخرت کے مخفی امور متحقق ہو جاتے ہیں۔ آجکل کے فلاسفروں اور حکماء نے مُردوں کے واپس آنے کے بارے میں بڑی بڑی تحقیقاتیں کی ہیں امریکہ میں ایک شخص کو مار کر تجربہ کیا گیا۔ کہ آیا اُسے کچھ شعور رہتا ہے یا نہیں۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۹) اُس شخص کو جس پر تجربہ کیا گیا تھا۔ کہہ دیا گیا تھا۔ کہ تم نے آنکھ کے اشارے سے بتا دینا۔ لیکن جب وہ ہلاک کیا گیا۔ تو کچھ بھی حرکت نہ کر سکا۔ کیونکہ یہ ایک سرّ الٰہی ہے جسکی تہ تک پہنچنا انسان کیلئے محال ہے۔ انسان جب حد سے گذر جاتا ہے۔ تو وہ بھید کے دریافت کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ مغربی دنیا جو زمینی تحقیقات میں مصروف ہے۔ وہ ہر فلسفہ میں حدِّ ادب سے دور نکل جاتی ہے۔ اور انسانی حدود سے گذر کر الٰہی حدود میں قدم رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن نتیجہ سوائے ناکامی اور نامرادی کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان جملہ امور کو جو ایمانیات سے تعلق رکھتے ہیں نہ تو اس قدر چھپا کر رکھا ہے۔ کہ تکلّف کی حد تک پہنچ جائیں۔ اور نہ اس قدر ظاہر کیا ہے۔ کہ اس پر کوئی فائدہ مرتب نہ ہو سکے۔ باوجود ان ساری باتوں کے آج اسلام کیلئے خوشی کا دن ہے۔ کہ معمورۂ عالم میں کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اور وہ اپنی روشن ہدایات اور عملی سچائیوں کے ساتھ نشانات اور زندہ برکات کا ایک زبردست معجزہ اپنے

ساتھ رکھتا ہے۔ جسکے مقابلہ کی کسی دوسرے مذہب کو ہرگز ہرگز طاقت نہیں یہ بات کہ اسلام اپنی پاک تعلیم اور اس کے زندہ نتائج کے ساتھ اس وقت معمورۂ عالم میں ممتاز ہے۔ نرا دعوے ہی دعوے نہیں۔ بلکہ اللہ تعالےٰ نے اپنے اس بندے کے ذریعہ سے اس سچائی کو ثابت کر دیا ہے اور اسنے کل مذاہب و ملل کو دعوت حق دے کر بتا دیا ہے۔ کہ فی الحقیقت اسلام ہی ایک زندہ مذہب ہے۔ اور جس شخص کو اسبارہ میں ابھی تک شک ہو وہ میرے پاس آئے اور ان خوبیوں اور برکات کو خود مشاہدہ کرلے لیکن شرط یہ ہے۔ کہ طالب صادق بنکر آئے نہ جلد باز معترض ہوکر۔ جس زمانہ میں حضرت نبی کریمؐ دنیا پر ظاہر ہوئے۔ اور خدا کا جلال اور گم گشتہ توحید کو زندہ کرنے کے لئے آپ مبعوث ہوئے اگر کوئی سلیم الفطرت اور سعادتمند شخص غور کرے تو اسے معلوم ہو جائیگا۔ کہ اس زمانہ کی بُری حالت ہی آپ کی سچائی پر ایک روشن دلیل ہے اور ایک دانشمند شخص اس وقت کے حالات ہی معلوم کرکے آپکے منجانب اللہ ہونے کا اقرار کر سکتا ہے جسکی موجودگی میں اسے کسی معجزہ کی بھی ضرورت نہیں۔ پادری فنڈر صاحب نے اپنی کتاب میزان الحق میں یہ سوال اٹھایا ہے۔ کہ کیا وجہ کہ جب آنحضرتؐ نے دعوئے نبوت کیا۔ تو خدا تعالیٰ نے انہیں نہ روکا؟ پھر خود ہی اس سوال کا جواب دیتا ہے۔ کہ چونکہ اس وقت کے عیسائی بگڑ چکے تھے اور ان کے اخلاق و اعمال بہت خراب تھے۔ اور انہوں نے سچائی اور راستبازی کا طریق چھوڑ رکھا تھا۔ اسلئے اللہ تعالےٰ نے ان کی تنبیہ کے لئے حضرت نبی کریمؐ کو بھیجا۔ اور اسی سبب سے آپکو دعوئے نبوت سے نہ روکا۔ اس بیان سے یہ نادان عیسائی آنحضرتؐ کی سچائی کا تو اعتراف نہیں کرتا۔ بلکہ الٹا اس امر کو معترض کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جب خود عیسائیوں کی یہ حالت تھی تو کیا اس وقت کے حسب حال کسی مصلح کی بھی ضرورت تھی یا نہ؟ اور یا یہی صورت خدا تعالےٰ کے رحم کے مناسب حال تھی۔ کہ ایک شخص کا اگر ایک ہاتھ کٹا ہوا ہے۔ تو دوسرا بھی کاٹ دیا جائے۔ اور جو بیمار ہے اسے پتھر مار دیا جائے۔ اصل بات یہ ہے۔ کہ خود عیسائیوں کے اعتراف کے مطابق بھی۔ آنحضرتؐ کی بعثت کا زمانہ نہایت تاریکی کا زمانہ تھا۔ دیانند نے بھی اس امر کو اپنی کتاب میں تسلیم کیا ہے۔ اور تاریخ بھی اسکی شہادت دیتی ہے۔ کہ ہندوستان میں نہایت گھنونی بت پرستی ہو رہی تھی۔ اور دنیا کے دیگر ممالک پر ایک خطرناک تاریکی اور جہالت چھائی ہوئی تھی۔ جسکا اعتراف ہر ایک قوم کے مورخوں اور محققین نے کیا ہے۔ کیا اب ایسی حالت میں حضرت نبی کریمؐ کا وجود بے ضرورت تھا

ہرگز نہیں بلکہ وہ ایسے وقت میں کل دنیا کیلئے ایک رحمت کا نشان تھا۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ وَمَا اَرْسَلْنَاکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعَالَمِیْنَ۔ یعنی اے نبی کریمؐ ہم نے تمہیں تمام عالم پر رحمت کیلئے بھیجا ہے۔ آپؐ کو تو کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ کہ اُس وقت آریہ ورت کی کیا حالت تھی۔ اور وہ کسی خطرناک بُت پرستی کے تاریک غار میں گرا ہُوا ہے۔ یہاں تک کہ اُس زمانہ میں وید کے ماننے والوں میں انسان کی شرمگاہ تک کی پرستش مروّج تھی۔ نہ آپؐ کو یہ معلوم تھا۔ کہ بلاد شام کے عیسائیوں کا کیا حال ہے اور وہ کس قسم کی انسان پرستی میں مصروف ہو کر اخلاق اور اعمال صالح کی قیود سے نکلکر بالکل تاریک زندگی بسر کر رہے تھے۔ نہ آپؐ کو ایران و مصر کا حال معلوم تھا۔ کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ غرض آپ تو ایک الگ تھلگ ملک کے جنگل میں پیدا ہوئے تھے۔ نہ اُس وقت کوئی تاریخ کی کتاب مدون ہوئی تھی۔ جو آپنے پڑھی ہو۔ اور نہ کسی مکتب یا مدرسہ میں آپؐ نے کچھ تعلیم پائی تھی۔ جس کے ذریعہ سے معلومات وسیع ہو جاتے۔ اور نہ کوئی اور ذرائع مثلاً اخبار یا ڈاک خانہ لوگوں کے حالات معلوم کرنے کیلئے آپ کے پاس تھے۔ دنیا کے بگڑ جانے کی اطلاع تو اللہ تعالیٰ نے ہی آپ کو بذریعہ اپنے کلام کے دی جب یہ آیت نازل ہوئی۔ ظَہَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ یعنی دریا بھی بگڑ گئے اور جنگل بھی بگڑ گئے۔ دریاؤں سے مراد وہ لوگ ہیں۔ جن کو پانی دیا گیا۔ یعنی شریعت اور کتاب اللہ ملی۔ اور جنگل سے مراد وہ لوگ ہیں۔ جن کو اُن سے حصّہ نہیں ملا تھا۔ مطلب یہ کہ اہل کتاب بھی بگڑ گئے تھے اور مُشرک لوگ بھی۔ آپکا زمانہ ایسا بگڑا ہوا تھا۔ کہ ساری دنیا میں کفر و شرک کی ظلمت پورے زور سے پھیلی ہوئی تھی۔ عین اس وقت اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو پیدا کیا۔ تاکہ آپ اُس تمام تاریکی کو دور کریں۔ ایسے پُرفتن زمانہ میں جبکہ چاروں طرف فسق و فجور کی ترقی تھی۔ شرک اور دہریت کا زور تھا۔ نہ تو اعتقاد درست تھے اور نہ ہی اعمال صالحہ اور اخلاق باقی رہے تھے۔ آپؐ کا پیدا ہونا بجائے خود آپ کی مسیحائی اور من جانب اللہ ہونے کا ایک زبردست ثبوت ہے۔ کاش کوئی دانشمند اس پر غور کرے ایک عقلمند اور سلیم الفطرت انسان ایسے تاریکی کے وقت پر آنے والے مصلح کی تکذیب کیلئے کبھی جلدی نہیں کر سکتا۔ اور کم از کم اُسے اتنا تو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ آپؐ عین وقت پر تشریف لائے تھے۔ وبا، طاعون اور ہیضہ کے زور و شدت کے وقت

اگر کوئی شخص یہ دعوے کرے کہ وہ اُن کے علاج کیلئے آیا ہے تو کیا اتنا نہ ماننا پڑے گا کہ وہ شخص فی الحقیقت ایک ضرورت کے وقت آیا ہے۔ بیشک یہ بات ضرور ہی ماننی پڑیگی اسی طرح پر حضرت نبی کریمؐ کی خفاینت کی پہلی دلیل تو یہی ہے کہ جس وقت آپ تشریف لائے۔ وہ وقت چاہتا تھا۔ کہ "سرو ے از غیب بیروں آید و کارے بکند"۔ اس کی طرف قرآن کریم کی اس آیت میں اشارہ ہے۔ وبالحق انزلناہ وبالحق نزل۔ پس خوب یاد رکھو۔ کہ مامور من اللہ کی سچائی کی شناخت کی پہلی دلیل یہی ہوتی ہے کہ وہ ضرورت کے وقت آتا ہے۔ اُس کے وقت پر غور کی نگاہ ڈالی جائے اور سوچا جائے کہ کیا اس وقت کسی مرد آسمانی کے آنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اگر ایک شخص نہروں اور متعدد کنوؤں کی موجودگی میں پھر اُسی جگہ ایک اور کنواں لگاتا ہے تو صاف کہنا پڑتا ہے کہ وہ شخص وقت اور روپیہ کا خون کرتا ہے۔ لیکن اگر وہی شخص ایک ایسے جنگل و بیابان میں کنواں لگائے جہاں پانی نایاب ہے تو اس کا یہ خیال دانائی پر مبنی اور مستحسن سمجھا جائیگا۔ آنحضرتؐ جس طرح ایک جنگلی زمین میں پیدا ہوئے۔ اُسی طرح ایسے وقت پیدا ہوئے جب کہ ہر طرف روحانی جنگل تھا۔ خود مکہ میں اگر جسمانی اور روحانی انہار نہ تھیں۔ تو دیگر ممالک بھی روحانی نہروں کے نہ ہونے کے سبب ہلاک ہو چکے تھے۔ اور زمین مردہ ہو چکی تھی۔ اسی لئے قرآن کریم نے فرمایا: اعلموا ان اللہ یحیی الارض بعد موتھا۔ یعنی یہ بات تمہیں معلوم ہے کہ ساری زمین مر چکی تھی اور اب اللہ تعالیٰ اُسے نئے سرے سے زندہ کرتا ہے پس یہ زبردست دلیل ہے آنحضرتؐ کی سچائی پر کہ آپ ایسے وقت میں آئے کہ ساری دنیا عام طور پر بدکاریوں اور بد اعتقادیوں میں مبتلا ہو چکی تھی اور حق وحقیقت اور توحید و پاکیزگی سے بالکل خالی ہو چکی تھی۔ پھر دوسری دلیل آپؐ کی سچائی کی یہ ہے کہ آپ ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ کی طرف اُٹھائے گئے۔ جب آپ اپنے فرض رسالت کو پورے طور پر ادا کر کے کامیاب و بامراد ہو چکے تھے۔ حقیقت میں جس طرح مامور من اللہ کیلئے پہلے یہ بات دیکھنی ضروری ہوتی ہے کہ آیا وہ ضرورت کے وقت آیا ہے یا نہیں۔ اُسی طرح یہ بھی دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے فرض منصبی میں کامیاب بھی ہوا ہے یا نہیں۔ آیا اُس نے ان بیماروں کو تندرست بھی کر دیا ہے یا نہیں جن کے علاج کیلئے وہ بھیجا گیا تھا۔ (الحکم جلد ۶ ع ۱۰)

اس مقام پر زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اس مجمع میں بہت سے لوگ ایسے موجود ہیں۔ جن کو اس بات کا پورا پورا علم ہے کہ آنحضرتؐ کی بعثت کے وقت عرب کا کیا حال تھا کوئی بدی ایسی نہ تھی۔ جو اُن میں نہ پائی جاتی تھی۔ جس طرح سے کہ کوئی شخص ہر صیغہ اور ہر ایک امتحان کو پاس کر کے ہر ایک فن کا کامل اُستاد بنجاتا ہے۔ اسی طرح پر عرب لوگ ہر قسم کی بدیوں اور بدکاریوں میں پورے پورے ماہر تھے۔ شرابی۔ زانی یتیموں کا مال کھانے والے۔ قمار باز غرضیکہ ہر ایک قسم کی بُرائی میں سب اقوام سے بڑھے ہوئے تھے۔ یہیں تک بس نہیں بلکہ اپنی بدکاریوں پر فخر کرنے والے تھے ان کا قول تھا۔ ان ھی الا حیوٰۃ الدنیا نموت ونحی۔ یعنی ہماری زندگی اسی قدر ہے کہ یہاں ہی مرتے ہیں اور زندہ ہوتے ہیں۔ حشر۔ نشر۔ قیامت جنت۔ جہنم کچھ بھی نہیں۔ غرضیکہ قرآن شریف کے احکام جن جن بدیوں اور برائیوں سے روکتے ہیں۔ وہ سب مجموعی طور پر ان میں موجود تھیں۔ اُن کی حالت کا یہ نقشہ تھا۔ جس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا تھے۔ ایک موقعہ پر اُن کے بارے میں فرمایا ہے یاکلون ویتمتعون یعنی کھاتے ہیں اور تمتع اُٹھاتے ہیں۔ یعنی اپنے پیٹ کے دھندوں اور دیگر شہوانی امور میں مبتلا اور اسیر ہیں۔ اس بات کو خوب یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ جب ایک انسان جذباتِ نفس اور دیگر شہوانی امور میں اسیر اور مبتلا ہو جاتا ہے۔ تو چونکہ وہ اپنے طبعی تقاضوں کو اخلاقی حالت میں نہیں لاتا۔ اسلئے ان شہوات کی غلامی اور اسیری ہی اُسکے لئے جہنم ہو جاتی ہے اور ان ضروریات کے حصول میں مشکلات کا پیش آنا اس پر ایک خطرناک عذاب کی صورت ہو جاتی ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ کہ وہ جس حال میں گرفتار ہیں گویا جہنم میں مبتلا ہیں۔ یہ بات ہرگز فراموش کر دینے کے قابل نہیں ہے کہ قرآن شریف جو خاتم الکتب ہے۔ قصوں کا مجموعہ ہرگز نہیں ہے اور جن لوگوں نے اپنی غلط فہمی اور حق پوشی کی بنا پر اسے قصوں کا مجموعہ قرار دیا ہے انہوں نے حقائق شناس فطرت سے حصہ نہیں پایا۔ ورنہ اُنہیں معلوم ہو جاتا۔ کہ اس پاک کتاب نے تو پہلے قصص کو بھی ایک فلسفہ بنا دیا ہے اور یہ اس کا احسان عظیم ہے۔ دنیا کی ساری الہامی کتابوں اور جملہ انبیاء پر۔ ورنہ آجکل کے زمانے میں گذشتہ انبیاء کی باتوں پر ہنسی کی جاتی ہے۔ اور مزید براں یہ بھی اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس علمی زمانہ میں جبکہ موجودات عالم کے حقائق اور خواص الاشیاء کے علوم ترقی کر رہے ہیں اُسنے آسمانی علوم اور کشف حقائق کیلئے ایک سلسلہ کو قائم کیا۔ جس نے ان تمام باتوں کو جو فیج اعوج

زمانہ میں معمولی قصوں سے بڑھکر وقعت نہ رکھتی تھیں۔ اور سائنس کے اس زمانہ میں ان پر ہنسی ہو رہی تھی علمی پیرایہ میں ایک فلسفہ کی صورت میں پیش کیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے زمانہ میں بہشت اور دوزخ کو بالکل ایک خیالی اور سادگی کے طور پر رکھا گیا تھا۔ حضرت مسیح نے پھانسی پانے والے چور کو یہ تو کہدیا۔ کہ آج ہم بہشت میں جائینگے۔ لیکن بہشت کی حقیقت پر کوئی نکتہ بیان نہ فرمایا۔ ہم اس وقت اس سوال کو سامنے لانے کی ضرورت نہیں سمجھتے کہ عیسائیوں کے انجیلی عقیدے اور بیان کے موافق وہ بہشت میں گئے یا ہاویہ میں بلکہ صرف یہ دیکھانا ہے۔ کہ بہشت کی حقیقت انہوں نے کچھ بھی بیان نہیں کی۔ یونتو عیسائی صاحبان نے اپنے بہشت کی مساحت بھی کی ہوئی ہے۔

اسکے خلاف قرآن شریف کسی تعلیم کو قصوں کے رنگ میں پیش نہیں کرتا۔ بلکہ وہ اسے ہمیشہ ایک علمی صورت میں پیش کرتا ہے۔ مثلاً اسی بہشت و دوزخ کے بارے میں قرآن شریف فرماتا ہے۔ مَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى یعنی جو اس دنیا میں اندھا ہے۔ وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے دوسرے عالم کی لذات کے دیکھنے کے لئے ہمیں اس جہان میں حواس اور آنکھیں ملتی ہیں جس شخص کو اس جہان میں نہیں ملیں اسے وہاں بھی نہیں ملینگی اب یہ امر انسان کو اس طرف متوجہ کرتا ہے۔ کہ ہر ایک انسان کا فرض ہے۔ کہ وہ اُن حواس اور آنکھوں کے حاصل کرنے کے لئے اسی جہان میں کوشش اور سعی کرے تاکہ دوسرے عالم میں بینا اٹھے۔ ایسا ہی عذاب آخروی کی حقیقت اور فلسفی بیان کرتے ہوئے قرآن شریف فرماتا ہے۔ نار اللّٰہ الموقدۃ التی تطلع علی الافئدۃ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا عذاب ایک آگ ہے جس کو وہ بھڑکاتا ہے۔ اور انسان کے دل پر ہی اس کا شعلہ بھڑکتا ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے۔ کہ عذاب الٰہی اور جہنم کی اصل جڑ انسان کا اپنا ہی دل ہے۔ اور دل کے ناپاک خیالات اور گندے ارادے اور عزم اس جہنم کا ایندھن ہیں۔ اور پھر بہشت کے انعامات کے متعلق نیک لوگوں کی تعریف میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ یفجرونھا تفجیرا۔ یعنی اسی جگہ نہریں نکال رہے ہیں۔ اور پھر دوسری جگہ مومنوں اور اعمال صالحہ کرنے والوں کی جزا کو بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے۔ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ۔ اب میں پوچھتا ہوں۔ کہ کیا کوئی شخص ان باتوں کو قصہ قرار دے سکتا ہے۔ یہ کیسی سچی بات ہے۔ کہ جو لوگ یہاں آبپاشی کرتے ہیں۔ وہی پھل کھائینگے۔ غرض قرآن کریم اپنی ساری تعلیمات کو علوم کی صورت

اور فلسفہ کے رنگ میں پیش کرتا ہے۔ اور موجودہ زمانہ جس میں خدا تعالیٰ نے ان علوم حقہ کی تبلیغ کیلئے اس سلسلہ کو قائم کیا ہے۔ کشف حقائق کا زمانہ ہے۔ پس خوب یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ قرآن شریف نے پہلی الہامی کتب اور انبیاء پر احسان کیا ہے۔ جو انکی تعلیموں کو جو قصّہ کے رنگ میں تھیں علمی رنگ دے دیا ہے۔ میں سچ سچ کہتا ہوں۔ کہ کوئی شخص ان قصوں اور ان کہانیوں کو پڑھکر نجات حاصل نہیں کرسکتا۔ جبتک کہ وہ قرآن شریف کو نہ پڑھے۔ کیونکہ یہ اسی کی شان ہے۔ کہ وہ انہ لقول فصل وما ھو بالھزل ہے اور وہی میزان مہیمن۔ نور اور شفا اور رحمت ہے جو لوگ قرآن شریف کو پڑھتے اور اسے محض ایک قصّہ سمجھتے ہیں۔ انہوں نے فی الحقیقت قرآن کو نہیں پڑھا۔ بلکہ اسکی بے حرمتی کی ہے۔ ہمارے مخالف کیوں ہماری مخالفت میں اس قدر تیز ہو رہے ہیں۔ صرف اس لئے کہ ہم قرآن شریف کو جیسا کہ خدا تعالےٰ نے فرمایا ہے۔ کہ وہ سراسر نور حکمت اور معرفت ہے۔ دیکھانا چاہتے ہیں۔ اور ہمارے مخالف یہ کوشش کرتے ہیں۔ کہ قرآن شریف کو ایک معمولی قصّے سے بڑھکر وقعت نہ دیں۔ لیکن ہم اسے گوارا نہیں کرسکتے۔ اور خدا تعالےٰ نے اپنے خاص فضل سے ہم پر کھولدیا ہے۔ کہ قرآن شریف ایک زندہ اور روشن کتاب ہے۔ اسلئے ہم کیوں ان لوگوں کی مخالفت کی پرواہ کریں۔

غرض میں بار بار اس امر کیطرف ان لوگوں کو جو میرے ساتھ تعلق رکھتے ہیں نصیحت کرتا ہوں کہ خدا تعالےٰ نے اس سلسلہ کو کشف حقائق کیلئے قائم کیا ہے۔ کیونکہ بغیر اسکے عملی زندگی میں کوئی روشنی اور نور پیدا نہیں ہوسکتا۔ اور میں چاہتا ہوں۔ کہ عملی سچائی کے ذریعہ سے اسلام کی خوبی دنیا پر ظاہر ہو۔ جس کام کے لئے خدا نے مجھے مامور کیا ہے۔ اسلئے تم لوگ قرآن شریف کو کثرت سے پڑھو۔ مگر نرا قصّہ سمجھکر نہیں بلکہ ایک فلسفہ سمجھکر۔ اب میں پھر اصل مطلب کیطرف رجوع کرکے کہتا ہوں۔ کہ قرآن شریف نے بہشت اور دوزخ کی جو حقیقت بیان کی ہے۔ کسی دوسری الہامی کتاب نے ہرگز نہیں کی۔ قرآن شریف نے صاف طور پر ظاہر کردیا ہے۔ کہ اسی دنیا سے بہشتی اور دوزخی زندگی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے چنانچہ ایک جگہ فرمایا وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ۔ یعنی جو شخص خدا کے حضور کھڑا ہونے سے ڈرا اسکے واسطے دو بہشت ہیں یعنی ایک بہشت تو اسی دنیا میں مل جاتا ہے کیونکہ خدا تعالےٰ کا خوف انسان کو بدیوں سے روکتا ہے۔ اور بدیوں کیطرف دوڑنا دل میں ایک اضطراب اور قلق پیدا کرتا ہے۔ جو بجائے خود ایک خطرناک جہنم ہے۔

لیکن جو شخص خدا تعالےٰ کا خوف کھاتا ہے۔ تو وہ بدیوں سے پرہیز کر کے اس دنیا کے عذاب اور درد سے تو دم نقد بچ جاتا ہے۔ جو شہوات اور جذبات نفسانی کی غلامی اور اسیری سے پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ وفاداری اور خدا کی طرف جھکنے میں ترقی کرتا ہے۔ جس کے سبب سے اسے ایک لذت اور سرور دیا جاتا ہے۔ اور یوں بہشتی زندگی اسکے لئے اسی دنیا سے شروع ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ اس وقت میرا صرف یہ مطلب ہے۔ کہ میں اس دوسری دلیل کی طرف تمہیں متوجہ کروں۔ جو آنحضرت کی نبوت پر اللہ تعالےٰ نے دی ہے یعنی یہ کہ جس کام کی سرانجام دہی کے لئے آپ تشریف لائے تھے اسمیں پورے پورے کامیاب ہو گئے۔ میں پہلے بتا چکا ہوں۔ کہ جب آپ تشریف لائے تو آپ نے لکھو کہا روحانی مریضوں کو مرض کے آخری درجہ میں پایا۔ جو اُن کی موت کے قریب پہنچ چکا تھا۔ بلکہ فی الحقیقت وہ مر چکے تھے۔ جیسا کہ اُس زمانہ کی تاریخ سے پتہ ملتا ہے پھر انصافاً سوچنے کی بات ہے۔ کہ کوئی شخص اپنے خدمتگار کے عیب دور نہیں کر سکتا۔ تو جس شخص نے ایک بگڑی ہوئی قوم کی ایسی اصلاح کر دی۔ کہ اُن کے عیوب کو ایسا دھو دیا۔ گویا اُن میں وہ عیب تھے ہی نہیں۔ تو اُس سے بڑھکر اُس کی صداقت کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے؟ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں نے اِس طرف توجہ نہیں کی۔ ورنہ یہ ایسے روشن دلائل ہیں کہ دیگر انبیاء میں ان کے نظائر بہت ہی کم ملیں گے۔ مثلاً حضرت مسیح کو ہی لے لو۔ کہ بموجب اناجیل کے وہ چند حواریوں کی بھی اصلاح نہ کر سکے اور ہمیشہ اُنہیں سُست اعتقاد کہتے رہے یہانتک کہ بعض کو شیطان ہی کہا۔ پھر وہ ایسے لالچی تھے۔ کہ یہوداہ اسکریوطی جو مسیح کا خزانچی تھا ایسا اوقات اُس تھیلی میں سے جو اُس کے پاس رہا کرتی تھی کبھی کبھی کچھ چرا بھی لیا کرتا تھا۔ اور آخر اسی لالچ نے اُسے مجبور کیا کہ وہ تیس ۳۰ درہم لیکر اپنے اُستاد اور مرشد کو گرفتار کرا دے۔ اُس کے مقابل حضرت نبیؐ کریم کے صحابہؓ کی طرف جب ہم دیکھتے ہیں۔ تو انہوں نے اپنی جانیں دے دینی آسان سمجھیں۔ بجائے اُسکے کہ اُن میں غداری کا ناپاک حصّہ پایا جاتا۔ یورپین مؤرخین تک کو اس امر کا اعتراف کرنا پڑا ہے۔ کہ نبیؐ کریم کے صحابہ میں جو اُنس۔ وفاداری اور اطاعت اپنے ہادیؐ کے لئے تھی اُسکی نظیر کسی دوسرے نبی کے متبعین میں نہیں ملتی۔ خصوصاً حضرت مسیح تو اس

مقابلہ میں بالکل نہیدست نظر آتے ہیں۔ اب جبکہ اُنکی شان میں غلو کیا گیا ہے اور باوجود اُن کی کمزوریوں کی مثالوں اور واقعات کی موجودگی کے جو اناجیل میں پائے جاتے ہیں۔ اُن کو خدا بنالیا گیا ہے۔ اُن کی قوت قدسی اور جذب و کشش کا یہ نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ کہ وہ اپنے چند حواریوں کو بھی درست نہ کر سکے تو اُن سے اور کیا امید ہو سکتی تھی۔ عیسائی صاحبان جب حواریوں کی اعتقادی اور عملی کمزوریوں کا کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ تو یہ کہہ دیتے ہیں۔ کہ مسیحؑ کے بعد اُن میں قوت اور طاقت آگئی تھی۔ اور وہ کامل نمونہ ہو گئے تھے۔ لیکن یہ جواب نہایت مضحکہ خیز اور عذر گناہ بدتر از گناہ کا مصداق ہے۔ کہ چراغ کی موجودگی میں تو کوئی روشنی نہ تھی چراغ کے بجھ جانے کے بعد روشنی ہو گئی۔ کیا خوب!!! ایک نبی کی موجودگی میں تو وہ پاک نہ ہو سکے لیکن اُس کی غیر حاضری میں پاک ہو گئے۔ اس سے تو یہ معلوم ہوا۔ کہ مسیحؑ اپنی قوت قدسی کے لحاظ سے اور بھی کمزور اور ناتوان تھا۔ اور معاذ اللہ وہ ایک نحوست تھا۔ کہ جب تک حواریوں کے سامنے رہا وہ پاک نہ ہو سکے اور جونہی وہ اُن سے علیحدہ ہو گیا۔ تو وہ روح القدس سے معمور ہو گئے۔ نہایت تعجب کی بات ہے! بہت سے انگریز مصنفین نے بھی اس مضمون پر قلم اُٹھایا ہے۔ اور یہی رائے ظاہر کی ہے مسیحؑ نے ایک ایسا گروہ پایا تھا جو پہلے سے توریت کے مقاصد پر اطلاع پا چکا تھا۔ اور وہ فقیہوں اور فریسیوں سے خدا کی باتیں سُنتا رہتا تھا۔ اگر وہ راستباز اور پاک باز ہوتے تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ اور چودہ سو برس تک لگاتار اُن میں وقتاً فوقتاً نبی اور رسول آتے رہے جو خدا کے احکام اور حدود سے اُنہیں اطلاع دیتے رہے۔ گویا اُن کے لطفہ میں رکھا ہوا تھا۔ کہ وہ خدا کو مانیں اور اُس کی حدود کی حفاظت کریں۔ اور بدکاریوں سے بچیں۔ پھر کیونکر ممکن تھا۔ کہ وہ اس تعلیم سے جو مسیحؑ انہیں دینا چاہتا تھا بے خبر ہوتے۔ مسیحؑ اگر انہیں درست بھی کر دیتے تب بھی یہ کوئی بڑی قابل تعریف بات نہ تھی۔ کیونکہ ایک طبیب کے کامل علاج کے بعد اگر کوئی دوسرا طبیب اچھا کرے۔ تو خوبی کی بات نہیں۔ اس لئے اگر بفرض محال مسیحؑ نے اُنہیں فائدہ پہنچایا بھی ہو۔ تو بھی یہ کوئی قابل تعریف بات نہ تھی۔ لیکن افسوس تو یہ ہے۔ کہ یہاں اُس فائدہ کی جو مسیحؑ نے اپنے حواریوں کو پہنچایا کوئی نظیر بھی نظر نہیں پڑتی۔ یہودا اسکریوطی نے تیس ۳۰ روپیہ لیکر اپنے اُستاد مسیحؑ کو دشمنوں کے ہاتھ بیچ دیا۔ اور ایک دوسرے حواری پطرس نے مسیحؑ کے سامنے

کھڑے ہو کر اُس پر لعنت کی۔ لیکن دوسری طرف ہمارے نبی کریم کے صحابہؓ نے اُحد اور بدر کی لڑائیوں میں آپ کی حفاظت میں اپنے سر کٹوا دئے۔ اب مقام انصاف ہے کہ اگر حضرت نبی کریم نہ آئے ہوتے اور قرآن شریف نہ ہوتا تو ایسے نبی کے بارہ میں لوگ کس رائے کا اظہار کرتے۔ جس کی تعلیم اور قوت قدسیہ کا نمونہ یہود اسکریوطی اور پطرس ہیں۔ قوت قدسی کی ایسی کمی اور تعلیم ایسی ادھوری اور ناقص کہ کوئی دانشمند اُسے کامل نہیں کہہ سکتا۔ اور نہ صرف یہی بلکہ انسان کی تمدنی معاشرتی اور سیاسی زندگی کو اس سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ اور سب سے بڑھ کر لطف یہ کہ اُس کی کوئی تاثیرات بھی کچھ باقی نہیں۔ دعوے ایسا۔ کہ عقل۔ کانشنس۔ قانون قدرت اور متقدمین کے عقائد اور مسلمات کے صریح خلاف۔ انگریز مصنفین کو صاف طور پر اس امر کا اعتراف کرنا پڑا ہے کہ اگر قرآن نہ آیا ہوتا۔ تو دنیا کی حالت بہت بُری ہوتی۔ اور کہ آنحضرتؐ نے درندوں اور وحشیوں کو درست کیا۔ اور پھر ایسے صادق اور وفادار لوگ تیار کئے جنہوں نے آپ کی رفاقت میں اپنے مال و جانکی ذرہ بھر بھی پرواہ نہیں کی۔ اس قسم کی وفاداری جو صحابہؓ میں تھی اور ایسی اطاعت و ایثار و جان نثاری پیدا نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ مقتدا اور متبوع میں اعلےٰ درجہ کی قوت قدسی اور جذب نہ ہو۔ پھر اُنہیں مصنفین نے لکھا ہے کہ عربوں کو صرف سچی راستبازی ہی نہ سکھائی گئی تھی۔ بلکہ اُن کی دماغی قوتوں کی بھی تربیت کی گئی تھی۔ حواری تو ایک گاؤں کا بھی انتظام نہ کر سکے لیکن صحابہؓ نے دنیا کا سارا انتظام کر کے دکھا دیا۔ کون کہہ سکتا ہے۔ کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے والدین نے کسی مُلک پر حکومت کی تھی۔ اور اس لئے وہ انتظام مُلک داری اور قوانین سیاست سے واقف تھے ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ صرف حضرت نبی کریم کی پاک تربیت اور قرآن شریف کی کامل تعلیم کا نتیجہ تھا۔ کہ ایک طرف اُس نے اُن کو فرشتہ بنا دیا تو دوسری طرف وہ عقل مجسّم ہو گئے (الحکم جلد ۱۱ ۶) یہ کیسی بدیہی اور صاف بات ہے۔ کہ ایک طبیب اگر ناقابل علاج مریضوں کو اچھا کر دے تو اُسے طبیب حاذق ماننا پڑتا ہے۔ اور جو شخص واقعات کی موجودگی میں اُسکی صداقت کا اقرار نہ کرے اُسے بجز احمق اور نادان کے اور کیا کہیں گے ہمارے نبی کریم نے لکھوکھا مریضان گناہ کو شفا دی حالانکہ اُن مریضوں میں سے ہر ایک بجائے خود ہزار ہا قسم کی روحانی امراض سے بیمار اور مریض تھا۔ جس طرح ایک شخص مریض ہو اور اُسے سر درد۔ نزول اُستسقےٰ وجع المفاصل اور طحال وغیرہ امراض لاحق ہوں

توجو طبیب ایسے مریض کو شفا دیدے اُس کی تشخیص اور علاج کو صحیح اور حکمی ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ یہی حال آنحضرتؐ کا تھا۔ کہ آپنے ایسے لوگوں کو شفا بخشی جنمیں ہزاروں روحانی امراض تھیں۔ جس قدر ہم عرب لوگوں کی گری ہوئی حالت اور بدکاری کی زندگی کو نظر کے سامنے رکھتے ہیں اور اُس کے ساتھ جو تبدیلی اُن میں حضرت نبی کریمؐ کی قوت قدسی کے باعث پیدا ہوئی۔ تو ہمیں آپ کی قوت قدسی کا اقرار کرنا پڑتا ہے اور ہمارے دل میں آپؐ کی عزت اور بڑھ جاتی ہے۔ ضد اور تعصب ایک الگ امر ہے۔ جو اپنی تاریکی کی وجہ سے سچائی کے نور کی پہچان کی قوت کو سلب کر دیتا ہے لیکن اگر دل انصاف سے خالی نہ ہو اور سر میں عقل صحیح ہو۔ تو صاف اقرار کرنا پڑتا ہے۔ کہ آپؐ سے بڑھکر عظیم الشان پاکیزگی اور طہارت کی طرف تبدیلی کرا دینے والا اور کوئی انسان اس دنیا میں نہیں ہو گذرا۔ اللھم صل علے محمد و علے آل محمد و آلہ و اصحابہ۔ اس کے مقابل ہم حضرت مسیح کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہ اُنہوں نے اپنی قوم کا کیا علاج کیا اور اپنی روحانیت۔ عقد ہمت اور قوت قدسی کا کیا کرشمہ دکھایا۔ محض زبانی باتیں بنانے سے کچھ فائدہ نہیں۔ جب تک عملی رنگ میں انکا نمونہ نہ دکھایا جاسکے جب کہ مسیح کی شان میں اس قدر مبالغہ سے کام لیا گیا ہے کہ باوجود اتنی ناتوانی اور ضعف کے اُن کو خدائی کا منصب دیدیا گیا ہے۔ تو چاہیئے تو یہ تھا۔ کہ اُنکی عام رحمت اپنا اثر دکھاتی اور اُن کی اقتداری قوت کوئی نمونہ پیش کرتی۔ جس سے گناہ کی زندگی پر دنیا میں موت وارد ہو جاتی اور فرشتوں کی طرح زندگی بسر کرنے والوں سے دنیا معمور ہو جاتی۔ مگر یہ کیا ہو گیا۔ کہ اُن کے چند خاص ہمنشین بھی جو رات دن آپ کی صحبت میں رہا کرتے تھے۔ درست نہ ہو سکے ع عیسائی اپنے خداوند یسوع کا مقابلہ تو آنحضرتؐ سے کرنے لگ جاتے ہیں۔ لیکن تعجب ہے کہ انہیں ذرا شرم نہیں آتی کہ وہ قوت قدسی کے نتائج کے لحاظ سے مسیح اور آنحضرتؐ کا مقابلہ کرنے کی طرف نہیں آتے۔ اگر اُنکی نیت میں صدق ہو۔ تو اصلاحی نتائج پر مقابلہ کرنے تو اُنہیں اصلیت معلوم ہو جاتی۔

خوب یاد رکھو۔ کہ انبیاء تخلقوا باخلاق اللہ ثابت کرنے کیلئے دنیا میں آیا کرتے ہیں اور وہ اپنے عملی نمونہ سے دکھا دیتے ہیں کہ وہ اخلاق اللہ کا پورا پورا نقشہ ہیں۔ یہ ظاہر ہے۔ کہ دنیا میں جس قدر اشیاء اللہ تعالےٰ نے پیدا کی ہیں وہ سب کی سب کسی نہ کسی پہلو سے انسان کے لئے مفید ہیں جیسے مثلاً درخت۔ اُس کے پتے۔ سایہ۔ چھال۔ لکڑی اور اُس کا پھل گویا کہ اُسکا ہر ایک

جزو کسی نہ کسی رنگ میں فائدہ بخش ہے۔ سورج کی روشنی سے انسان بڑے فوائد حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح دیگر اشیاء کا حال ہے۔ لیکن اس کے خلاف ہمیں عیسائیوں کی حالت پر افسوس آتا ہے کہ انہوں نے ایک عاجز انسان کو خدا اور اُسکا بیٹا تو قرار دیا لیکن اُس کے آنے کا کوئی خاص فائدہ دنیا کو نہ بتا سکے۔ نہ اُسکی مقتدرانہ تجلی کا نمونہ دکھا سکے چاہیئے تو یہ تھا۔ کہ ان کا ابن اللہ یقول سے اگر پدر نتواند پسر تمام کند کا مصداق ہوتا۔ لیکن اُسکی سوانحعمری پر غور کرنے سے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے۔ کہ اُس نے کچھ بھی نہ کیا۔ نرمی خودکشی۔ اور دوسروں کی مصیبت کو دیکھکر اپنی جان پر کھیل جانا نہ معلوم اپنے اندر کونسی دانشمندی اور مصلحت رکھتا ہے۔ اور اس سے مصیبت زدوں کو کیا فائدہ؟ انصاف اور ایمان کا تقاضا تو یہ ہے۔ کہ واقعات کو مدنظر رکھکر حضرت نبی کریمؐ کے مقابلہ میں مسیح کو بالکل ناکامیاب ماننا پڑتا ہے۔ کیونکہ حقیقت الامر یہ ہے۔ کہ حضرت نبی کریمؐ کو جس قسم کا موقع ملا وہ مسیح کو نہیں مل سکا۔ اور یہ اُنکی بدقسمتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مسیح کو ہم کامل نمونہ نہیں کہہ سکتے انسان کے ایمان کی تکمیل کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ اوّل یہ کہ دیکھنا پڑتا ہے۔ کہ جب وہ مصائب کا تختہ مشق بنا۔ تو اُس وقت وہ خدا تعالےٰ سے کیسا تعلق رکھتا تھا؟ کیا وہ صدق۔ اخلاص استقلال۔ اور سچی وفاداری کے ساتھ ان مصائب پر بھی انشراح صدر سے اللہ تعالیٰ کی رضا کو تسلیم کرتا اور اُسکی حمد و ستائش کرتا رہا ہے۔ یا شکوہ و شکایت کرتا رہا ہے پھر جب دوسرے وقت اُسے عروج حاصل ہوا اور اقبال و فروغ ملا۔ تو کیا اُس اقتدار اور اقبال کی حالت میں وہ خدا تعالےٰ کو بھول گیا۔ اور اُسکی حالت میں کوئی قابل اعتراض تبدیلی پیدا ہو گئی یا وہ بطور سابق اللہ تعالےٰ سے تعلق رکھتا اور اُسکی حمد و ستائش کرتا رہا اور اپنے دشمنوں کو عفو کرتا اور اُن پر احسان کر کے اپنی عالی ظرفی اور بلند حوصلگی کا ثبوت دیتا رہا؟ اسکی مثال یوں سمجھیئے۔ کہ مثلاً ایک شخص کو کسی دوسرے نے سخت مارا ہے۔ اگر مار کھانے والا اس بات پر قادر ہی نہیں ہو سکا۔ کہ مارنے والے کو سزا دیکر اپنا انتقام لے تو اگر ایسا شخص یہ دعوے کرے۔ کہ دیکھو اپنے دشمن کو اُسنے کچھ نہیں کہا۔ تو یہ بات اخلاق میں داخل نہیں ہو سکتی۔ اور اسکا نام تحمل اور بردباری نہیں رکھ سکتے۔ کیونکہ اُسے قدرت ہی نہیں ملی۔ کہ وہ ظالم سے بدلا لے سکتا۔ بلکہ یہ ایسی حالت ہے۔ کہ گالی کے صدمہ سے بھی رو پڑے۔ تو یہ تو ستر بی بی از بے چادری والا معاملہ ہے۔ اس کو اخلاق اور بردباری

سے کیا تعلق۔ مسیح کے اخلاق کا نمونہ اسی قسم کا تھا۔ اگر اُنہیں کوئی اقتداری قوت ملتی اور اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی توفیق ملتی تو ایسی حالت میں اگر وہ دشمنوں سے پیار کرتے اور اُن کی خطائیں بخش دیتے تو بیشک ہم تسلیم کر لیتے۔ کہ فی الحقیقت انہوں نے اپنے اخلاق فاضلہ کا نمونہ دکھایا۔ لیکن جبکہ اُن کو یہ موقعہ ہی نہیں ملا۔ تو پھر اُنہیں اخلاق فاضلہ کا نمونہ ٹھہرانا صریح بے حیائی ہے۔ جبتک دونوں اخلاق کے ظہور کا موقعہ نہ ہو اُسوقت تک اخلاق کا ثبوت نہیں ملتا۔ اِسکے مقابلہ میں حضرت نبی کریم کی طرف دیکھو۔ کہ جب مکہ والوں نے آپکو نکالا۔ اور تیرہ ۱۳ برس تک آپ کو ہر قسم کی تکالیف دیتے رہے۔ جن کے تصور سے بھی دل کانپ اُٹھتا ہے۔ اُس وقت جس صبر اور تحمل سے آپنے کام لیا اُسے سب جانتے ہیں۔ جب مدینہ کو ہجرت کر لینے کے بعد آپکو فتح مکہ کا موقع ملا۔ تو اُسوقت اِن تکالیف اور مصائب اور سختیوں کا خیال کر کے جو مکہ والوں نے تیرہ ۱۳ سال تک آپؐ پر اور آپ کے اصحابؓ پر کی تھیں آپؐ کو حق پہنچتا تھا۔ کہ تمام مخالف مکہ والوں کو قتل عام کر کے تباہ کر دیتے۔ اور ایسا کرنے میں کوئی مخالف سے مخالف شخص بھی آپ پر اعتراض کرنے کا حق نہیں رکھ سکتا تھا کیونکہ آپکو اور آپؐ کے صحابہؓ کو سخت سے سخت تکالیف دینے کی وجہ سے وہ واجب القتل ہو چکے تھے۔ اسلئے اگر آپؐ میں قوت غضبی ہوتی۔ تو یہ موقعہ انتقام لینے کا تھا۔ کیونکہ آپکے سب مخالف گرفتار ہو چکے تھے۔ لیکن اسکے خلاف آپؐ نے اُن سے کیا سلوک کیا؟ یہی کہ آپؐ نے اُن سب مخالفین کو آزاد کر دیا اور فرمایا لا تثریب علیکم الیوم۔ یہ کوئی چھوٹی سی بات نہیں۔ مکہ میں جو مصائب اور تکالیف آپکو دی گئیں۔ ان کا نظارہ آنکھوں کے سامنے لاؤ۔ اور پھر آنحضرتؐ کے اخلاق کو دیکھو۔ کہ قوت و طاقت کے ہوتے ہوئے کس طرح اپنے جانستان دشمنوں کو معاف کر دیا۔ یہ تھا نمونہ آپؐ کے اخلاق فاضلہ کا جسکی نظیر پیش کرنے سے دنیا عاجز ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اہل مکہ نے صرف آپؐ کی تکذیب نہیں کی تھی۔ صرف تکذیب کرنے سے جو محض سادگی کی بنا پر ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اِس دنیا میں سزا نہیں دیا کرتا۔ لیکن جب تکذیب کرنے والا شرافت اور انسانیت کی حدود سے نکل کر شوخی۔ بیحیائی اور دریدہ دہنی سے اعتراض کرتا ہے اور صرف اعتراضات کی حد تک ہی نہیں رہتا۔ بلکہ ہر قسم کی ایذا دہی اور تکلیف رسانی کے منصوبے کرتا ہے۔ اور پھر اِن میں حد تجاوز سے گذر جاتا ہے۔ اُسوقت اللہ تعالیٰ

کی غیرت جوش میں آتی ہے اور وہ اپنے مامور و مرسل کی حمایت میں اُسکے مخالف ظالموں کو ہلاک کر دیتا ہے جسطرح سے کہ نوحؑ کی قوم کو ہلاک کیا۔ یا حضرت لوطؑ کی قوم کو۔ اِس قسم کے عذاب ہمیشہ اُن شرارتوں اور مظالم کی وجہ سے نازل ہوا کرتے ہیں جو خدا کے ماموروں اور اُنکی جماعت پر کئے جاتے ہیں۔ ورنہ نرمی تکذیب کی سزا اِس دنیا میں نہیں دی جاتی بلکہ اس کا معاملہ خدا کے ساتھ ہوتا ہے اور ایسی تکذیب کی سزا کیلئے اُسنے ایک اور عالم رکھا ہوا ہے کسی قوم پر جو عذاب آیا کرتے ہیں۔ وہ مامور کی تکذیب کو ایذا کے درجے تک پہنچانے سے آتے ہیں اور تکذیب کو استہزار اور ٹھٹھے کے رنگ میں بدل دینے سے آتے ہیں اگر محض نرمی اور شرافت سے یہ کہا جائے۔ کہ مجھے فلاں معاملہ کی سمجھ نہیں آئی اس لئے مجھے اُسکے ماننے میں تامل ہے۔ تو ایسا انکار خدا کے عذاب کو کھینچ کر لانے والا نہیں ہے۔ کیونکہ یہ تو صرف سادگی اور کمی علم کی وجہ سے ہے۔ بس سچ سچ کہتا ہوں۔ کہ اگر نوحؑ کی قوم کے اعتراضات شریفانہ رنگ میں ہوتے۔ تو اللہ تعالیٰ اُنہیں نہ پکڑتا۔ جملہ اقوام محض اپنی کرتوتوں کی پاداش میں سزا پاتی ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے تو قرآن مجید میں یہانتک بھی فرمادیا ہے۔ کہ جو لوگ قرآن سُننے کے لئے آتے ہیں اُن کو بھی امن کی جگہ تک پہنچا دیا جائے۔ خواہ وہ مخالف و منکر ہی ہوں۔ اِسلئے کہ اسلام میں کسی قسم کا جبر اور اکراہ نہیں جیسا کہ فرمایا لا اکراہ فی الدین۔ لیکن اگر کوئی شخص قتل کرے یا قتل کے منصوبے کرے اور شرارتوں اور ایذا رسانیوں کیلئے کوشش کرے تو ضرور ہے کہ ایسا شخص سزا پائے۔ قاعدہ کی بات ہے۔ کہ ہر ایک شخص صرف مجرمانہ حرکات کی وجہ سے ہی پکڑا جاتا ہے پس اہل مکہ بھی اپنی شرارتوں اور مجرمانہ حرکات کے باعث اس قابل ٹھہر چکے تھے۔ کہ اُن کو سخت سزائیں دی جاتیں اور اُن کے وجود سے اِس ارض مقدس اور اُسکے گرد و نواح کو پاک و صاف کر دیا جاتا۔ رحمۃ للعالمین اور انک لعلےٰ خلق عظیم کا مصداق۔ اپنے خون کے پیاسے واجب القتل دشمنوں کو بھی باوجود اُن پر پوری قوت اور مقدرت پالینے کے کہتا ہے لا تثریب علیکم الیوم اب پادری صاحبان ہمیں بتائیں۔ کہ مسیح کے اس قسم کے خلق کو ہم کہاں ڈھونڈیں۔ اور اُسکی زندگی میں حضرت نبی کریمؐ کے اس اخلاق کا نمونہ کہاں سے لائیں۔ جبکہ وہ عیسائیوں کے عقیدے کے موافق ساری عمر ماریں کھاتا رہا۔ اور سر رکھنے کو جگہ تک نہ ملی۔ دراصل یہ ہمارا یہ عقیدہ نہیں ہے۔ کہ ہم خدا تعالےٰ کے ایک نبی اور مامور کی نسبت یہ گمان کریں۔ کہ وہ اتنا

ذلیل اور مفلوک الحال تھا) انسان کی شرافت کا سب سے بڑا نشان اُسکا خلق ہوتا ہے لیکن ایک گال پر طمانچہ کھاکر دوسری پھیر دینے کی تعلیم دینے والے معلم کی عملی حالت میں اس خلق کا ہمیں کوئی پتہ نہیں لگتا۔ دوسروں کو تو نصیحت کرتا ہے کہ گالی نہ دو۔ لیکن خود یہودیوں کے متقدس فریسیوں اور فقیھوں کو حرامکار۔ سانپ اور سانپ کے بچے کہتا ہے۔ حالانکہ اسکے مقابل یہودیوں میں بھی کچھ اخلاق کا پتہ ملتا ہے۔ اور وہ اُسے نیک استاد کہہ کر پکارتے ہیں۔ اور یہ اُن کو حرام کار کہتا ہے۔ اور اُنہیں کتوں اور سوروں سے تشبیہ دیتا ہے۔ باوجود اسکے کہ وہ فقیھ اور فریسی لوگ نرم نرم الفاظ میں اُس سے کچھ پوچھتے تھے۔ دنیوی حیثیت سے بھی بلحاظ اپنی وجاہت کے رومی گورنمنٹ میں کرسی نشین تھے۔ اسلیئے اُن کے مقابلہ میں اُن کے سوالات کے جوابات تو بہت ہی نرمی سے دینے چاہئیں تھے۔ اور نرمی سے سمجھانا چاہیئے تھا۔ لیکن بجائے نرمی سے سمجھانے کے مسیح اُن کو گالی پر گالی دیئے چلا جاتا تھا۔ کیا اسی کا نام اخلاق ہے میں بار بار کہتا ہوں کہ اگر قرآن شریف نہ ہوتا اور آنحضرت تشریف نہ لائے ہوتے۔ تو مسیح کی نبوت تو ایک طرف شاید کوئی دانشمند شخص اُنکو عالی خیال اور وسیع الاخلاق انسان بھی ماننے میں تامل کرتا۔ یہ قرآن شریف اور ہمارے نبی کریم کا حملہ انبیاء پر عموماً اور حضرت مسیح پر خصوصاً احسان عام ہے۔ کہ اُنہوں نے ان کی نبوت کا ثبوت بہم پہنچایا۔

مسیح کی خدائی کی ایک اور پہلو سے بھی پڑتال کرنی چاہیئے۔ اخلاقی حالت تو یہ تھی۔ کہ یہود کے معزز بزرگوں کو گالیاں دیتے تھے۔ لیکن جب ایک وقت آیا کہ اُنکے قابو میں آگئے تو اسقدر دعا کی کہ جسکی کوئی حد نہ تھی۔ لیکن افسوس کہ عیسائیوں کے عقیدہ کیمطابق وہ دعا بالکل رد ہوگئی۔ اُسکا ذرہ بھر بھی نتیجہ نہ نکلا۔ اگرچہ یہ خدا کی شان کے شایاں نہ تھا کہ وہ دعا کرتا بلکہ چاہیئے تھا۔ کہ اپنی خدائی کی طاقت کا کوئی اقتداری کرشمہ دکھاتا جس سے یہود کو بجز اقرار و تسلیم کے چارہ نہ رہتا۔ لیکن دعا مانگی تو اُسکا اثر اُلٹا ہی نکلا ؎ او خود گم است کرا رہبری کند۔ کا معاملہ نظر آتا ہے۔ ساری رات دعائیں کرتا ہے چیختا ہے چلاتا ہے۔ لیکن افسوس کہ وہ دعا سُنی بھی نہیں جاتی۔ اور موت کا پیالہ جو صلیب کی لعنت کی زہر سے لبریز ہے نہیں ٹلتا۔ اب کوئی شخص ایسے خدا اور اُسکے بیٹے سے کیا فیض پائیگا جو خود دوسروں سے مانگتا ہے۔ لیکن باوجود مانگنے کے

اُسے کچھ بھی نہیں دیا جاتا۔ ایک طرف تو وہ خود تعلیم دیتا ہے۔ کہ جو مانگو سو ملیگا۔ اور دوسری طرف خود اپنی ناکامی اور نامرادی کا نمونہ دکھاتا ہے۔ اب کوئی شخص الفاظ سے ہمیں بتائے کہ ایسے ناکام خدا سے کسی عیسائی کو کیا تسلی اور اطمینان ملسکتا ہے۔ غرض جس پہلو سے بھی مسیح کا آنحضرتؐ سے مقابلہ کیا جائے تو صاف طور پر نظر آجاتا ہے کہ مسیح کو آپؐ سے کوئی نسبت نہیں مسیح کی زندگی ایک سخت ناکامی کی زندگی تھی۔ اور آنحضرتؐ کی زندگی ایک نہایت عظیم الشان کامیاب زندگی تھی۔ اور آپؐ کیا بلحاظ اپنے اخلاق فاضلہ کے اور کیا بلحاظ اپنی قوت قدسی صعقدسمت کے اور کیا بلحاظ خوبی تعلیم اور تکمیل کے اور کیا بلحاظ اپنے کامل نمونہ اور قبولیت دعاؤں کے مسیح پر ہر پہلو اور ہر طریق سے اعلےٰ واقع تھے اور اپنی سچائی اور برتری کے شواہد اور آیات اپنے ساتھ رکھتے تھے کہ جنہیں دیکھکر ایک غبی سے غبی انسان بھی بشرطیکہ اُس کے دل میں بیجا ضد اور عداوت نہ ہو۔ صاف طور پر تسلیم کرلے گا۔ کہ آپؐ مخلوق باخلاق اللہ کا کامل نمونہ اور ایک کامل و مکمل انسان تھے لیکن اُسکے خلاف مسیح کے حالات پر نظر کی جائے۔ تو ایک دانشمند اور منصف مزاج انسان کو اُن کے نبی ماننے میں بھی تامل ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ مہذب اور شریفانہ باتوں کا جواب گالی سے دیتا اور نیک اُستاد کہنے والوں کو سانپ اور سانپ کے بچے اور حرام کار کہتا ہے۔ علاوہ ازیں یہودیوں کو ایک اور عجیب مشکل درپیش تھی۔ جس میں بظاہر حق پر ہو سکتے تھے۔ اور وہ یہ تھی۔ کہ ملاکی نبی کی کتاب میں وہ پڑھ چکے تھے۔ کہ مسیح کے آنے سے پہلے ایلیا کا آسمان سے اُترنا ضروری ہے۔ اور جب تک اُس کا نزول آسمان سے نہ ہو۔ مسیح نہیں آسکتا۔ اب غور کرو۔ کہ اُن کے سامنے کسی شخص کے دوبارہ آنے کی کوئی نظیر موجود نہیں ہے اور ایلیا کا آسمان سے اُترنا وہ اپنی کتابوں میں پڑھ چکے ہیں۔ انہوں نے ایلیا کو آسمان سے اُترتے دیکھا نہیں۔ لیکن مسیح نے آکر دعوےٰ بھی کر دیا۔ اب اُسے وہ تسلیم کریں تو کس بنا پر؟ مسیح نے آکر جو فیصلہ ایلیا کے آسمان سے اُترنے کا کیا کہ وہ یوحنا کے رنگ میں آچکا ہے۔ بظاہر یہودیوں کے پاس اُسکے انکار کی وجوہات تھیں۔ کیونکہ اُنہیں ایلیا کے دوبارہ آنے کا وعدہ دیا گیا تھا نہ کہ مثیل ایلیا کا۔ اور اس سے پہلے کوئی اس قسم کا واقعہ نہیں ہوا تھا۔ اسلئے اُنہیں مسیح کا انکار کرنا پڑا۔ ایک یہودی کی کتاب میرے

پاس موجود ہے جس میں اُس نے بڑے زور سے اس امر پر بحث کی ہے۔ اور پھر وہ اُس میں اپیل کرتا ہے۔ کہ بتاؤ ایسی صورت اور حالت میں ہم کیا کریں؟ بلکہ اُسنے یہاں تک لکھا ہے۔ کہ اگر خدا تعالیٰ ہمیں اُس کے متعلق قیامت کو باز پرس کرے گا۔ تو ہم ملاکی نبی کی کتاب کھول کر اُس کے سامنے رکھدیں گے۔ کہ اس میں ایلیا کا آنا لکھا ہے نہ کہ اُس کے مثیل کا۔

ایک مشکل تو یہودیوں کو یہ پیش آئی۔ دوسری یہ کہ مسیح مصلوب ہوگیا۔ اور اُس کی صلیبی موت کی لعنت نے اُس کے کذب پر ایک اور رنگ چڑھا دیا۔ کیونکہ وہ توریت میں پڑھ چکے تھے۔ کہ جھوٹا نبی صلیب پر لٹکایا جاتا ہے اور وہ ملعون ہوتا ہے۔ پس انہوں نے یہ خیال کیا کہ ایک طرف تو ایلیا آسمان سے نہیں اُترا اور یہ شخص مسیحیت کا مدعی ہے۔ اور ایلیا کے نزول کے بارہ میں جو تاویل کرتا ہے وہ بظاہر ملاکی نبی کی کتاب کے مخالف ہے۔ اس لئے کاذب کی مخالفت اور خود مسیح کے طرز عمل اور سلوک نے یہودیوں کو اور بھی برافروختہ کر دیا۔ جب وہ اُنہیں سانپ۔ سانپ کے بچے اور حرامکار کہہ کر پکارتا تھا۔ تو انہوں نے اُسے صلیب دے دینے کی کوشش کی۔ اور جب وہ بقول عیسائی صاحبان صلیب پر چڑھکر مرگیا تو اس واقعہ نے اُن کے پہلے خیال کو اور بھی مضبوط کر دیا۔ کیونکہ اُنہوں نے مشاہدہ کر لیا۔ کہ مدعی مسیحیت صلیب پر جان دیکر لعنتی ہوگیا ہے اس لئے وہ جھوٹا ہے۔ پس اُنہیں یقین ہوگیا کہ جب وہ خود لعنتی ہوگیا ہے تو دوسروں کی کیا شفاعت کر سکتا ہے۔ اور صلیب کی موت نے اُس کے کذب پر مُہر لگادی ہے۔ جب دو گواہوں کی گواہی پر ایک انسان پھانسی پا سکتا ہے۔ تو ان دو ظاہری گواہیوں کی بنا پر کیوں مسیح جھوٹا نہ ٹھہرے صلیب پر چڑھتے وقت بھی یہودیوں نے اُس سے کہا۔ کہ اگر تو سچا ہے۔ تو صلیب پر سے اُتر آ۔ لیکن وہ اُتر نہ سکا۔ اس سے وہ اور بھی بدظن ہوگئے (الحکم جلد ۹ ع ۱۳) عیسائی چونکہ لعنت کے مفہوم اور منشاء سے ناواقف تھے اس لئے مسیح کو ملعون قرار دیتے وقت انہوں نے ذرہ نہیں سوچا کہ اِس کہنے کا انجام کیا ہوگا۔ عربی زبان سے بغض و نفرت ہونے کے سبب سے انہوں نے عبرانی زبان میں مہارت حاصل کرنا بھی لاحاصل سمجھا۔ چونکہ یہ سر دو زبانیں ایک ہی درخت کی دو شاخیں تھیں اور عربی جاننے والے کیلئے عبرانی کا پڑھ لینا سہل تر امر تھا۔ لیکن عیسائی صاحبان عربی کے ساتھ بغض کی وجہ سے لغت عبرانی سے

بھی کچھ فائدہ حاصل نہ کر سکے۔ لعنت کا مفہوم عربی و عبرانی زبان میں یہ ہے۔ کہ کوئی شخص خدا تعالیٰ سے سخت بیزار ہو جائے۔ اور اللہ تعالیٰ اُس سے بیزار ہو جائے عیسائیوں کے اپنے مطابع وغیرہ کی چھپی ہوئی لغت کی کتابیں جو بیروت سے آتی ہیں اُن میں بھی لعنت کے یہی معنے لکھے ہوئے ہیں۔ اور لعین شیطان کو کہتے ہیں۔ مجھے اِن عیسائیوں کی عقل و سمجھ پر بڑا افسوس ہوتا ہے کہ اپنے مطلب کی خاطر انہوں نے ایک عظیم الشان نبی کی سخت بے عزتی کی ہے اور اُسے ملعون ٹھہرایا۔ اس امر کی طرف انہوں نے ذرہ توجہ نہیں کی کہ لعنت کا تعلق دل سے ہوتا ہے جب تک ایک شخص کا دل خدا تعالےٰ سے برگشتہ نہ ہو جائے اُسے ملعون نہیں کہا جا سکتا۔ اب کسی عیسائی عالم سے دریافت کر کے دیکھ لو کہ کیا ملعون کے یہ معنی عربی و عبرانی لغت میں متفقہ طور پر لکھے ہیں یا نہیں؟ پھر اگر دل میں شرارت اور ہٹ دھرمی نہ ہو اور محض خدا تعالےٰ کی رضامندی کیلئے کسی مذہب کو اختیار کیا جائے تو کیا لغت میں لعنت کا یہ مفہوم عیسائی مذہب کی تردید کے لئے کافی نہیں؟ اوّل تو ایک عیسائی کو غور کرنا چاہیئے کہ جب اُس کے نزدیک یہ امر مسلم ہے۔ کہ تورات میں یہ لکھا ہے کہ جو کاٹھ پر لٹکا دیا جائے وہ لعنتی ہوگا اور وہ کاذب ہوگا۔ پھر وہ بتلائے۔ کہ جب مسیح صلیب پر چڑھکر لعنت کی موت مرگیا۔ اور تورات کی تحریر کے بموجب وہ ملعون اور کاذب ٹھہر گیا۔ تو وہ دوسروں کی کیا شفاعت کرے گا؟ اور خود گم است کرا رہبری کند میں سچ کہتا ہوں۔ کہ جب سے عیسائیوں نے خدا تعالےٰ کو چھوڑ کر الوہیت کا تاج ایک عاجز انسان کے سر پر رکھدیا ہے۔ وہ بالکل اندھے ہوگئے ہیں اور اُنہیں کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا ایک طرف تو اُسے خدا بناتے ہیں۔ اور دوسری طرف اُسے صلیب پر چڑھا کر لعنتی ٹھہراتے ہیں اور پھر تین دن کیلئے اُسے ہاویہ میں بھی بھیجتے ہیں۔ کیا وہ دوزخ میں دوزخیوں کو نصیحت کرنے گئے تھے یا اُن کے لئے بھی کفارہ ہونے کے لئے گئے تھے؟ مختصر یہ کہ عیسائی مذہب کے اصولوں میں اِس قسم کے فساد موجود ہیں۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ اناجیل کے رو سے مسیح کی کوئی بھی اخلاقی خوبی ثابت نہیں ہوتی اور وہ صرف حضرت رسول کریمؐ کے سہارے سے ہی تسلیم کیا گیا ہے۔ اگر انجیل کی بنا پر ہی ماننا پڑتا۔ تو ایسی مشکلات کی موجودگی میں اُسے کون تسلیم کر سکتا تھا۔ عیسائیوں اور اُنکی اناجیل نے اس پر اور بھی داغ لگائے ہیں۔ پھر یہودی جس قسم کے الزام حضرت مسیح پر لگاتے ہیں ان کے

بیان کرنے سے بھی شرم معلوم ہوتی ہے۔ اور یہ لوگ ایسی دلیری سے اسکی ماں کو متہم کرتے ہیں کہ الاماں۔ علاوہ ازیں ایک اور عجیب بات بھی قابل غور ہے اور وہ یہ کہ حضرت مریمؑ کی والدہ نے عہد کیا تھا کہ مریمؑ بیت المقدس کی خدمت کرے گی اور تارکہ رہے گی۔ نکاح نہ کرے گی۔ خود مریمؑ نے بھی یہ عہد کیا تھا کہ وہ ہیکل کی خدمت کرے گی لیکن باوجود ان عہدوں کے کیا آفت اُن پر پڑی کہ یہ سارے عہد توڑ ڈالے گئے اور مریمؑ کا نکاح کر دیا گیا۔ اُن تواریخ کی کتابوں میں جو یہودی مصنفین نے لکھی ہیں۔ علاوہ اور باتوں کے یہ لکھا ہے۔ کہ یوسف نجار کو مجبور کیا گیا۔ کہ وہ مریمؑ سے نکاح کرلے اور اسرائیلی بزرگوں نے اُس پر زور دیا۔ کہ اُسے ضرور نکاح کرنا پڑیگا۔ اسی ایک واقعہ پر کس قدر اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔ اوّل تو یہ کہ جب عہد باندھا گیا تھا۔ کہ مریم کا نکاح نہیں کیا جائیگا بلکہ وہ تارکہ رہے گی۔ تو خداوند کی نافی اور ماں نے اپنے عہد کو کیوں توڑا۔ دوم جب کہ عیسائیوں کے نزدیک کثرت ازدواجی زناکاری ہے۔ تو وہ اسبات کا کیا جواب رکھتے ہیں۔ کہ یوسف کی پہلی بیوی کی موجودگی میں مریم کا نکاح کیوں اُس سے کر دیا گیا۔ کیا وہ ایسا الزام مقدس کنواری پر لگانے کو تیار ہیں۔ سوم جبکہ مقدس کنواری کو حمل ہو چکا تھا۔ تو پھر حمل کی حالت میں نکاح کیوں کیا گیا؟ یہ تین نہایت زبردست اعتراضات ہیں جو اس واقعہ پر عائد ہوتے ہیں۔ دیگر امور کو اگر چھوڑ بھی دیا جائے مثلاً یہ کہ جب فرشتہ نے آکر مریمؑ کو بشارت دی تھی کہ اُسکے پیٹ میں سے خدا نکلیگا۔ تو اُسے چاہیئے تھا کہ شور و غل مچا دیتی۔ اور دنیا کو آگاہ کرتی کہ وہ خدا کا استقبال کرنے کے لئے تیار ہو جائے جو اُس کے پیٹ میں سے نکلنے والا تھا۔ پھر اسے چھپایا کیوں گیا؟ ہم اس قسم کے اعتراضات کو سردست چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن جو تین زبردست اعتراضات اوپر لکھے جا چکے ہیں۔ اُن کا حقیقی جواب عیسائی صاحبان کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ اصل بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ مریمؑ کو ہیکل میں حمل ہو گیا تھا۔ اسلئے اُس نے یہ سمجھا۔ کہ اگر لوگوں کو بتایا گیا۔ کہ اُسے فرشتہ نے آکر لڑکا پیدا ہونے کی بشارت دی تھی۔ تو لوگ ٹھٹھا کریں گے اور کہیں گے۔ کہ اسے بیاہ کے خواب آتے ہیں۔ اور کوئی بدکار ٹھہرائے گا۔ اور کوئی کچھ۔ لیکن جب حمل پوشیدہ نہ رہ سکا اور عام چرچا ہونے لگا۔ تو سب کو حقیقی ہیکل کو فکر پڑ گئی۔ کیونکہ اگر وہ اُسی وقت بتا دیتی جب کہ فرشتہ نے آکر بشارت دی تھی

تو اتنا شور و غل نہ ہوتا۔ لیکن اُس وقت انہوں نے یہی سمجھا۔ کہ اگر اس وقت اس بات کو شہرت دی گئی۔ تو معترض کہینگے۔ کہ یہ خاوند مانگتی ہے کیونکہ یہ قاعدہ ہے۔ کہ اگر کنواری لڑکی اس قسم کا ذرا سا بھی ذکر کر بیٹھے تو عوام اُس کی نسبت یہی نتیجہ نکال لیتے ہیں۔ اس لئے مریمؑ ڈرتی رہی۔ اور خاموش رہنے ہی میں بہتری سمجھی۔ لیکن کچھ عرصہ بعد جب حمل کے آثار ظاہر ہونے شروع ہو گئے اور وہ چھپ نہ سکا۔ تو پھر ہیکل کے بزرگوں کو معلوم ہو گیا کہ وہ حاملہ تھی۔ اس لئے اُنہیں فکر پیدا ہوئی۔ اور جیسا کہ قاعدہ ہے کہ اگر کسی شریف خاندان کی لڑکی کو حمل ہو جائے۔ تو بے عزتی کے اظہار کے خیال سے جھٹ پٹ اُس کا نکاح کر دیتے ہیں قدرتاً ان بزرگوں کو بھی یہی فکر پیدا ہو گئی چونکہ وہ اصل واقعہ سے بے خبر تھے۔ اس لئے انہوں نے اسبات کی بھی ذرہ پرواہ نہ کی کہ اس نکاح سے عہد شکنی کا ارتکاب ہوگا یا دوسری شادی کر دینے کی وجہ سے بقول یسوع زناکاری ٹھہریگی۔ یا حاملہ ہونے کی صورت میں نکاح ہی ناجائز تھا۔ عزیز و اقربا نے بھی یہی مناسب سمجھا۔ کہ اگر ایسی صورت میں خاموشی اختیار کی گئی اور نکاح نہ کیا گیا۔ تو ناک کٹ جائیگی۔ اس لئے جتنی جلدی ہو سکا یہ نکاح کر دیا گیا جس پر اسقدر اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔ لیکن غور طلب یہ امر ہے۔ کہ ان اناجیل نویسوں نے کیوں دیانتداری کے ساتھ اس واقعہ پر روشنی نہیں ڈالی؟ ایک انجیل نویس ایک جگہ لکھتا ہے۔ کہ یسوع نے اسقدر کام کئے۔ کہ اگر وہ سارے کے سارے لکھے جاتے تو دنیا میں نہ سما سکتے لیکن اس عقلمند کی عقل پر افسوس آتا ہے۔ کہ اُس کے اس ایک ہی جملہ نے انجیل کی ساری حقیقت کھولدی۔ کہ اسمیں جو کچھ لکھا گیا ہے ایسی ہی مبالغہ آمیز باتیں ہیں۔ کیونکہ یہ کس قدر ہنسی کی بات ہے۔ کہ جو کام یسوع نے تین برس کے اندر کئے وہ دنیا میں ہی سما نہ سکیں جب وہ سارے کے سارے ایک محدود زمانہ میں سما گئے تو پھر مکانی طور پر کیوں محدود نہیں ہو سکتے؟ عیسائی مذہب کا پھوڑا اس قسم کے ردی مواد سے بھرا ہوا ہے۔ جس طرح سے پھوڑوں کے پھوٹنے کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ اسی طرح سے عیسائی مذہب کے پھوڑے کے پھوٹنے کا بھی اب وقت آگیا ہے جو اندر سے پیپ سے بھرا ہوا ہے۔ لیکن باہر سے خوب چمکتا ہے۔ اور وقت بہت قریب ہے۔ کہ اُسکی اندرونی غلاظت ظاہر ہو جائے تھوڑا ہی زمانہ سکھوں کی سلطنت کو گذرے ہوا ہے جسمیں شائستگی بالکل جاتی

رہی تھی۔ علم باعمل مفقود تھے۔ اگر کسی شخص کو کسی امر میں شُبہ پڑتا۔ اور وہ اسکے بارہ میں سوال کر بیٹھتا تھا۔ تو اُسے واجب القتل ہونے کا فتوےٰ دے دیا جاتا تھا۔ وہ زمانہ ہی ایسا ہو گیا تھا۔ لیکن اب خدا تعالےٰ کے فضل سے ایک مہذب۔ شائستہ۔ علم دوست گورنمنٹ ہم پر حکمران ہے۔ جو نہائیت عدل اور انصاف کے ساتھ ہم پر حکومت کر رہی ہے۔ اور مذہبی آزادی کی برکت سے سب اقوام کو مستفید کیا۔ اِس لئے اب وہ وقت ہے۔ کہ مذہب کے متعلق سوال کرنے والوں سے کسی قسم کی کوئی سختی نہیں کی جاتی۔ اور ہر ایک سائل کو سوال کا جواب دیا جاتا ہے۔ جب زمانہ نے یہاں تک ترقی کر لی اور اشاعت حق کے سارے سامان اور ذرائع پیدا ہو گئے تو اللہ تعالےٰ نے اسلام کو جملہ ادیان پر غالب کرنے کے لئے مامور کر کے بھیجا۔ جس زمانہ میں اُس نے آنحضرتؐ کو بھیجا اُس وقت دنیا کی کل خشکی و تری فساد سے بھر چکی تھی۔ آپؐ نے آتے ہی بگڑے ہوؤں کو درست کر دیا۔ یہ ایک معمولی بات نہیں اور نہ اس قابل ہے۔ کہ اسے سرسری طور پر دیکھا جائے بلکہ اسمیں بڑے بڑے حقائق موجود ہیں۔ جن سے حضرت نبی کریمؐ کی عظمت اور بزرگی کا پتہ لگتا ہے۔ کیونکہ بجز اعلےٰ درجہ کے مقدس اور راستباز شخص کے کوئی دوسرا آدمی ایسی مکمل اصلاح نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ اُسکی اپنی قوت قدسی کمال کے درجہ تک نہ پہنچی ہوئی ہو۔ اور اُسمیں ایسی قوت نہ پیدا ہو چکی ہو۔ جو ہر قسم کی ناپاکیوں کے بُرے اثرات کو زائل کر دے۔ یوں تو ہر ایک نبی نے اپنے اپنے وقت میں اپنی قوم کی اصلاح کی اور اُسے درست کیا۔ لیکن جس شان اور مرتبہ کی اصلاح نبی کریمؐ نے کی ہے اُس کے برابر کسی دوسرے پیغمبر کی اصلاح نہیں پہنچتی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے۔ کہ وہ اُس کے مقابلہ پر ہیچ نظر آتی ہیں حضرت موسےٰؑ اپنی ٹیڑھی قوم کو پورے طور پر درست نہ کر سکے اسی طرح حضرت مسیحؑ بھی اپنے چند حواریوں میں سچی تبدیلی پیدا نہ کر سکے لیکن ان کے مقابلہ پر حضرت نبی کریمؐ کی قوت قدسی کو دیکھا جائے تو صاف طور پر اقرار کرنا پڑتا ہے کہ ایک ہی ہے۔ جس نے لاکھوں اور کروڑوں مُردوں کو زندہ کیا۔ محی اگر ہے۔ تو وہ محمدؐ ہی ہے۔ جھوٹے ہیں وہ لوگ جو کہتے ہیں۔ کہ مسیح مُردے زندہ کیا کرتا تھا۔ بھلا جس نے اپنے چند حواری بھی زندہ نہ کئے اور وہ اُسکے پاس رہ کر مُردہ ہی رہے۔ اُس نے مُردے کیا زندہ کرنے ہیں۔ میں ہمیشہ حیران ہوا کرتا ہوں اور حقیقت میں یہ حیران ہونیکی ہی بات ہے کہ وہ حیات کیسی ہے جسکے ساتھ فنا لگی ہوئی ہے یہ مسئلہ ہی غلط

ہے۔ جو شخص کہ یہ کہے۔ کہ فلاں شخص مُردوں کو زندہ کیا کرتا ہے۔ اگر زندہ کرنیکا مفہوم اور مطلب اور نہ ہوتا۔ تو خدا کیوں فیمسک التی قضیٰ علیہا الموت فرماتا اس سے معلوم ہوا کہ یہ محاورہ ہی اور ہے ورنہ اس سے تو تناقض لازم آتا ہے کہ ایک طرف تو کہے۔ کہ مُردہ زندہ نہیں ہوا کرتا اور دوسری طرف کہدے کہ وہ زندہ ہو جایا کرتا ہے۔ اگر مسیح سچ مچ مُردوں کو زندہ کیا کرتا تھا۔ تو قرآن شریف ضرور اس بارہ میں فرماتا۔ کہ یحییٰ المتوفی۔ کیونکہ توفی کا لفظ اُسجگہ استعمال کیا جاتا ہے جہاں قبض روح ہو۔ موت تو اس سے پہلے بھی آسکتی ہے۔ اور توفی کا لفظ اس لئے استعمال کیا ہے۔ کہ ثابت ہو کہ مرنے کے بعد بھی روح باقی رہتی ہے جو اللہ تعالےٰ کے قبضہ میں آجاتی ہے کس قدر حیرت اور افسوس کا مقام ہے۔ کہ معجزات مسیح پر بحث کرتے ہوئے لوگ پوری توجہ نہیں کرتے۔ ایسے لوگ اگر قرآن شریف کو غور و تدبر سے پڑھ لیتے۔ اور سنت اللہ پر نظر ڈالتے تو یہ مسئلہ اُنکی سمجھ میں آجاتا۔ اور پھر کوئی مشکل نہ رہتی۔ صحیح تواریخ ایک عمدہ معلم ہے جس سے پتہ لگ جاتا ہے۔ کہ ہر نبی کے معجزات اُسی رنگ کے ہوا کرتے ہیں جس قسم کی باتوں کا زور اور چرچا اُسکے زمانہ میں ہوتا ہے حضرت موسےٰ کے وقت سحر کا بڑا زور تھا۔ اسلئے اُنہیں جو معجزہ دیا گیا۔ وہ سحر کو باطل کرنے کا تھا۔ ہمارے نبی کریم کے وقت میں فصاحت و بلاغت کا بڑا زور تھا۔ اسلئے آپکو قرآن کریم کا معجزہ اُسی قسم کا دیا گیا یہ رنگ اسلئے اختیار کیا گیا۔ کہ شعر اجادو بیان سمجھے جاتے تھے اور اُنکی زبان میں اسقدر اثر تھا کہ وہ جس کام کو کرانا چاہتے تھے۔ چند شعر پڑھ کر کروالیا کرتے تھے جس طرح آج کل جوش دلانے کے لئے انگریزوں نے باجا وغیرہ رکھا ہوا ہے۔ اُن لوگوں کے پاس زبان تھی۔ جو دلیری اور حوصلہ پیدا کر دیتی تھی۔ اور ہر ایک جنگ میں وہ اشعار سے کام لیا کرتے تھے۔ اور فی کل وادٍ یہیمون کے مصداق تھے اسلئے ضروری تھا۔ کہ اُس وقت اللہ تعالےٰ اپنا ایسا کلام بھیجتا۔ پس اُس نے اپنا کلام نازل فرمایا اور اسی کلام کے رنگ میں اپنا معجزہ پیش کر دیا۔ جبکہ مخالفین کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ان کنتم فی ریب مما نزلنا علےٰ عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ الخ یعنی تم لوگ جو اپنی زباندانی کا دم مارتے اور لاف زنی کرتے ہو اگر کوئی قوت اور حوصلہ ہے تو اس کلام کے معجزہ کے مقابل کچھ زبان کا جوہر پیش کر کے دکھاؤ۔ لیکن زبان دانی کے مدعی ہونیکے باوجود وہ کچھ نہ دکھا سکے۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ ساتھ ہی تحدی بھی کر دی گئی تھی۔ کہ تم ہرگز ہرگز نہ بنا سکو گے اگر وہ لوگ کچھ بھی بنا کر دکھا دیتے اور پیش

کرتے تو تواریخ ضرور اسکی شہادت دیتی۔ لیکن کوئی شخص ثابت نہیں کر سکتا۔ کہ کسی شخص نے اس تحدی کا کچھ بھی جواب دیا ہو۔ پس خدا تعالےٰ نے اسوقت اسی رنگ کا معجزہ دکھایا۔ ایسا ہی یہودیوں میں سلب امراض کا نسخہ چلا آتا تھا۔ جو اسوقت ہندوؤں۔ مسلمانوں عیسائیوں میں بھی ہے۔ خصوصاً انگریزوں میں تو آجکل یہ علم بہت ترقی کر گیا ہے اس علم سے نبوت کا ثبوت نہیں ہوتا۔ اور نہ نبوت سے اسے کچھ تعلق ہے۔ کیونکہ یہ صرف مشق پر منحصر ہے۔ اور ہر شخص خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو مشق کرنے سے اس میں مہارت پیدا کر سکتا ہے۔ اس لئے سلب امراض کو نبوت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک معمولی بات ہے۔ حضرت مسیح کے زمانہ میں چونکہ اس کا زور تھا۔ اس لئے اللہ تعالےٰ نے اسی رنگ کا معجزہ حضرت مسیح کو دیدیا۔ یہ خاصیت ہر ایک انسان میں موجود ہے کہ جو شخص توجہ کرے تو توجہ کرنے کے ساتھ ہی ایک چیز اُسکے دل سے اُٹھکر پڑتی ہے۔ چنانچہ مسیح نے کہا۔ کہ کس نے مجھے چھوا ہے کہ میری قوت نکلی ہے۔ سلب امراض والے بھی یہی کہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ مسیح کے معجزات اس رنگ میں آکر بہت ہی کمزور اور ضعیف ہو جاتے ہیں۔ اسکے علاوہ مسیح کے معجزات پر ایک اور بڑا اعتراض بھی ہے اور وہ یہ کہ انجیل میں لکھا ہے کہ ایک تالاب ایسا تھا۔ کہ لوگ اس کے پانی کے ہلنے کا انتظار کیا کرتے تھے (الحکم جلد ۶ نمبر ۱۵) اور وہ مانتے تھے کہ اُسے فرشتہ ہلاتا تھا۔ اسلئے جو شخص سب سے پہلے اسمیں اُترتا تھا۔ وہ تندرست ہو جایا کرتا تھا۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ مسیح اُس تالاب پر اکثر جایا کرتا تھا۔ پھر اسمیں کونسی تعجب کی بات ہے کہ مسیح نے بیماریوں کے علاج کا کوئی نسخہ اس تالاب کی مٹی وغیرہ سے ہی تیار کیا ہو۔ تالاب کے اس قصہ نے جو اناجیل میں درج ہے مسیحی معجزات کی حقیقت کو اور بھی مشتبہ کر دیا ہے اور اُنکی ساری رونق کو دور کر دیا ہے۔ اسی لئے پادری عماد الدین جیسے عیسائیوں کو ماننا پڑا ہے۔ کہ تالاب والا قصہ الحاقی ہے۔ لیکن اناجیل کے ایسے نادان دوستوں نے اتنا خیال نہیں کیا۔ کہ اس باب کو محض الحاقی کہدینے سے مسیحی معجزات کی گئی ہوئی رونق واپس نہیں آسکتی۔ بلکہ اس سے انجیل اور بھی مشتبہ قرار پاتی ہے۔ کیونکہ اگر ایسا مان بھی لیا جائے تو پھر اس اعتراض کا کیا جواب ہے۔ کہ جس انجیل کا ایک باب الحاقی ثابت ہو گیا ہے۔ تو دیگر باب الحاقی نہ ہوں۔ پھر جبکہ مسیح کے نسب نامہ کو الحاقی ماننے والے عیسائی موجود ہیں۔ اس تالاب کی طرح خاصیت رکھنے

والے چشمے دیگر ممالک میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اور خود یورپ کے اکثر ممالک میں ایسے چشمے بکثرت ہیں جن کا پانی استعمال کرنے سے بہت سے لوگ اکثر امراض سے شفا پا لیتے ہیں ملک کشمیر میں بھی بعض چشموں کے پانی میں یہی خاصیت ہے جن میں گندھک۔ نمک وغیرہ کے اقسام کے اجزا ملے ہوئے ہوتے ہیں پس وہ معجزنما تالاب مسیح کے سارے معجزات پر پانی پھیرتا ہے خصوصاً ایسی صورت میں کہ مسیح کا اُس تالاب پر جانا اور اُس کی مٹی کو آنکھوں پر لگانا اور اپنے پاس رکھنا بھی بیان کیا جاتا ہے۔ باوجود ان باتوں کے عماد الدین اُسے الحاقی قرار دیتا ہے۔ لیکن تعجب یہ ہے۔ کہ اُسکا ایک حصہ الحاقی مانکر پھر بھی ایسی کتاب کو آسمانی کہے جانا شرم کی بات ہے۔

موجودہ اناجیل مسیح کی لکھی ہوئیں نہیں نہ ہی حواریوں کی زبان عبرانی تھی۔ پھر ساتھ اسکے بقول عماد الدین اسمیں الحاق بھی ہے اور تعلیم بھی اسمیں ادھوری اور ناقص اور نامعقول ہے پھر ایسے دنیا کے سامنے بطور الہامی کتاب کے پیش کیا جاتا اور نجات کا اصل ذریعہ بتایا جاتا ہے معجزات مسیح کا تو یہ حال ہے اب اُسکی پیشگوئیوں کو لو اس قسم کی پیشگوئیاں ہر ایک مدبر شخص تو درکنار عوام بھی کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ لڑائیاں ہونگی قحط پڑیں گے۔ مُرغ بانگ دیگا۔ الیشع کو بیوقوف بچے بے اختیار ہنسی آتی ہے بھلا ایسی پیشگوئیوں کو یہودی لوگ کیسے مسیح کی خدائی کا ثبوت مان سکتے تھے خدائی منوانے کے لئے تو وہ جبروت اور جلال درکار ہے جو خدا تعالےٰ کے حسب حال ہے۔ لیکن یسوع تو اپنی عاجزی اور ناتوانی میں ضرب المثل تھا۔ یہاں تک کہ ہوائی پرندوں اور لومڑیوں سے بھی ادنےٰ درجہ پر اپنے آپکو رکھتا تھا۔ اب کوئی شخص بتائے۔ کہ کس بنا پر اُس کی خدائی کو تسلیم کیا جائے۔ اور کس بات کو اُسکی خدائی کے ثبوت میں پیش کیا جائے۔ ایک صلیب کا واقعہ ہی ایسا امر ہے جو اُسکی خدائی اور نبوت پر پانی پھیرنے کے لئے کافی ہے۔ کہ جب وہ مصلوب ہو کر ملعون ہو گیا تو اُسکے کاذب ہونے میں کیا شک رہا یہودی مجبور تھے۔ کیونکہ اُنکی کتابوں میں کاذب کا یہی نشان تھا۔ وہ اسے صادق کیسے تسلیم کر لیتے؟ جو شخص صلیب پر مر کر خود ملعون یعنی خدا سے دور ہو گیا وہ دوسروں کے گناہ کیسے اٹھائیگا۔ عیسائی صاحبان کی اس خوش اعتقادی پر سخت افسوس آتا ہے۔ کہ جب ملعون کا دل ہی ناپاک ہو گیا تو آسمان باقی کیا رہا

اور وہ دوسروں کو کیا نجات دیگا۔ اگر ان لوگوں کو کچھ بھی شرم ہوتی اور عقل و فکر سے کام لیتے تو مسیح کے مصلوب اور ملعون ہونے کے عقیدے کو پیش کر کے مسیح کی خدائی منوانے سے اُن پر موت آجاتی۔ اِس زمانہ میں کسرِ صلیب کے سامان بہت کثرت سے پیدا ہو گئے ہیں۔ اور عیسائیت کے باطل ہونیکا مسئلہ بالکل بدیہی ہو گیا ہے جسطرح سے کہ ایک چور جب چوری کرتے ہوئے پکڑا جاتا ہے۔ تو پہلے پہل وہ اپنے جرم کا کبھی اقرار نہیں کرتا۔ اور کچھ پتہ نہیں دیتا۔ لیکن جب پولیس کی تفتیش کامل ہو جاتی ہے۔ تو پھر اُس کے دیگر ہمراہی بھی نکل آتے ہیں پھر عورتوں اور بچوں کی شہادت بھی کافی ہو جاتی ہے۔ کچھ کچھ مال بھی برآمد ہو جاتا ہے۔ اسکے بعد اُسے نہایت بیحیائی سے اپنی چوری کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ یہی حال عیسائی مذہب کا ہوا ہے۔ صلیب پر جان دینا یسوع کو کاذب ٹھہراتا ہے اور صلیب کی لعنتی موت دل کو گندہ کرتی اور خدا سے قطع تعلق کرتی ہے۔ پھر اسکا اپنا قول کہ یونسؑ کے معجزہ کے سوا اور کوئی معجزہ نہ دکھایا جائے گا۔ اُسکے باقی معجزات کو رد کر دیتا ہے۔ کیونکہ وہ صلیب پر سے زندہ اُتر آنے کو معجزہ قرار دیتا ہے علاوہ ازیں عیسائی اِس بات کو تسلیم کرتے ہیں۔ کہ اناجیل میں کچھ حصہ الحاقی بھی ہے۔ یہ جملہ باتیں مل ملا کر ایک خاصہ ذخیرہ اِس بات کی تردید کے لئے جمع ہو گیا ہے۔ کہ وہ یسوع مسیح کی خدائی کی رہتل دیوار کو دھڑام سے گرا دے۔ پھر سرینگر ملک کشمیر میں اُس کی قبر نے صلیب کو بالکل ہی توڑ ڈالا ہے۔ اور مرہم عیسےٰ اس کے لئے ایک شاہد ہو گئی ہے غرض جب یہ ساری باتیں ایک دانشمند اور سلیم الطبع انسان کے سامنے ایک ترتیب کے ساتھ پیش کی جائیں تو اُسے صاف طور پر اقرار کرنا پڑتا ہے۔ کہ مسیح ہرگز صلیب پر نہیں مرا اسلئے کفارہ جو مذہب عیسویت کا اصل الاصول ہے۔ بالکل باطل قرار پاتا ہے پس خوب یاد رکھو کہ یہ وہ حقیقتیں ہیں۔ جو اللہ تعالےٰ نے اپنے خاص فضل و کرم سے اِس زمانہ میں مسیح موعودؑ پر کھولے ہیں۔ اور میں تحدی سے اور بڑے زور سے کہتا ہوں۔ کہ اب وہ وقت آگیا ہے۔ جس کے بارہ میں حضرت نبی کریمؐ نے قبل از وقت خبر دی تھی۔ کہ مسیح موعودؑ آکر صلیب کو توڑ دیگا جس سے آنحضرتؐ کی یہ مراد نہ تھی۔ کہ وہ آکر لکڑی اور پتھر کی صلیبیں توڑتا پھریگا۔ کیونکہ اگر یہ ظاہری صلیبیں توڑ ڈالنے سے ہی کوئی شخص مسیح موعودؑ ہو سکتا تھا۔ تو پھر حضرت عمرؓ اور سلطان صلاح الدینؒ کے زمانہ میں بہت سی صلیبیں

ٹوٹیں۔ علاوہ بریں صلیبوں کے اس طرح توڑ ڈالنے سے کوئی فائدہ بھی نہیں۔ کیونکہ اگر لکڑی کی ایک صلیب توڑ ڈالی جائے۔ تو اُسکے بدلے اور دس بن سکتی ہیں۔ اسی طرح چاندی سونے کی بھی بن سکتی ہیں۔ لیکن نہیں اللہ تعالےٰ نے مسیح موعودؑ کے لئے جو کسرِ صلیب مقرر کر رکھا تھا۔ تو اس سے مراد لکڑی اور پتھر کی صلیبوں کا توڑنا نہ تھا۔ کیونکہ اس سے وہ ظالم قرار دیا جا سکتا تھا۔ بلکہ مسیح موعودؑ کی کسرِ صلیب سے مراد یہ تھی۔ کہ مذہب عیسوی کے اصولوں کو دلائل و براہین سے توڑ دیا جائے۔ اسلئے جو لوگ یہ اعتقاد رکھتے ہیں۔ کہ لکڑی اور پتھر کی صلیبیں توڑتے پھرنا مسیح موعودؑ کا کام ہوگا وہ دین کو بدنام کرتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے مسیح موعودؑ کو اس قسم کی جسمانی جنگ سے بری رکھا ہے۔ اور اسکے لئے یہ مقرر کیا کہ یضع الحرب کریگا یعنی جسمانی لڑائیاں بند کر دیگا۔ تاکہ دین کے دودھ میں مکھی نہ پڑ جائے مسیح موعودؑ دنیا میں آیا ہے۔ تاکہ دین کے نام پر تلوار اٹھانے کے خیالات کو دور کرے اور حجج اور براہین کے ذریعہ سے ثابت کر دکھائے۔ کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو اپنی اشاعت میں تلوار کی مدد کا ہرگز محتاج نہیں ہے۔ بلکہ اُسکی تعلیم کی ذاتی خوبیاں اور اُس کے حقائق و معارف و حجج و براہین اور خدا تعالےٰ کی زندہ تائیدات و نشانات اور اُس کا ذاتی جذب ایسی چیزیں ہیں جو ہمیشہ سے اُسکی ترقی اور اشاعت کا موجب ہوئی ہیں۔ اِسلئے وہ تمام معترضین آگاہ رہیں۔ جو اسلام کے بزور شمشیر پھیلائے جانے کا اعتراض کرتے ہیں۔ کہ وہ اپنے اس دعوے میں جھوٹے ہیں۔ اسلام کی تاثیرات اپنی اشاعت کے لئے کسی قسم کے جبر کی محتاج نہیں ہیں۔ اگر کسی شخص کو شک ہو۔ تو وہ میرے پاس کچھ عرصہ رہ کر آزما لے اور بچشم خود دیکھ لے کہ اسلام اپنی زندگی کا ثبوت براہین اور نشانات سے دیتا ہے یا نہیں۔ اب خدا تعالےٰ چاہتا ہے۔ اور اُسنے ارادہ فرمایا ہے کہ ان تمام اعتراضوں کو اسلام کے پاک وجود سے دور کر دے جو ناپاک اور خبیث طبع لوگوں نے اِس پر کئے ہیں۔ تلوار کے ذریعہ سے اسلام کی اشاعت کا اعتراض کرنے والے اب سخت شرمندہ ہونگے۔ یہ کہنا کہ سرحدی لوگ جہاد کے خیال سے آئے دن فساد کرتے رہتے ہیں۔ ایک بیہودہ بات ہے اور ایسے لوگوں کو غازی کا خطاب دینا سراسر نادانی اور جہالت ہے۔ اور اگر کوئی جاہل مسلمان اِن لوگوں کے اِس خیال سے ہمدردی رکھتا ہے۔ کہ وہ جہاد کرتے ہیں تو میں سچ سچ کہتا ہوں۔ کہ ایسا شخص

اسلام کا دشمن ہے جو فسادی لوگوں کو غازی کا خطاب دیتا ہے اور اسلام کے بدنام کرنے والوں کی تعریف کرتا ہے۔ یہودی قوم کے لئے اللہ تعالےٰ نے جو مسیح پیدا کیا تھا۔ اُس کی غرض بھی یہی تھی۔ کہ یہودیوں کی اُس آلائش کو دھو ڈالے۔ جو جبر کے ساتھ اشاعت مذہب کی اُن کی طرف منسوب کی گئی تھی۔ بعینہٖ اُسی طرح پر چودھویں صدی میں جو مسیح خدا تعالےٰ نے اسلام کو دیا ہے۔ اس کی بھی اصل غرض اور مقصود یہی ہے کہ اسلام کو اِس اعتراض سے پاک وصاف کرے کہ وہ جبر کے ذریعہ سے پھیلایا گیا ہے۔ اس لئے اس کا پہلا کام یہی ہے۔ کہ وہ لڑائیاں نہ کرے گا۔ انگلستان۔ فرانس۔ و دیگر ممالک یورپ میں اسلام پر یہ الزام بڑے زور شور سے لگایا گیا ہے۔ کہ وہ جبر کے ساتھ بذریعہ تلوار پھیلایا گیا ہے لیکن افسوس اور سخت افسوس کا مقام ہے۔ کہ وہ یہ نہیں دیکھتے۔ کہ اسلام کا اکراہ فی الدین کی تعلیم دیتا ہے اور اُنہیں یہ معلوم نہیں کہ جو مذہب فاتح ہو کر بھی گرجے نہ گرانے کا حکم دیتا ہے کیا وہ جبر کی تعلیم دے سکتا تھا۔ لیکن افسوس سے کہا جاتا ہے۔ کہ اِن سب اعتراضات کی اصل یہ ہے۔ کہ اسلام کے نادان دوست مُلّانوں نے یہ سب فساد ڈال رکھا ہے اور اپنے ناواجب افعال سے اس اعتراض کو پختہ کر دیا ہے انہوں نے خود تو اسلام کی حقیقت کو سمجھا ہی نہیں اور اپنے خیالی عقائد کی بنا پر دوسروں کو اعتراضات کا موقع دیا۔ جو عقائد ان احمق لوگوں نے بنا رکھے ہیں اُن سے عیسائیوں کو خوب مدد ملتی ہے۔ اگر یہ لوگ جہاد کی صورت میں دھوکا نہ دیتے یا نہ کھاتے۔ تو کسی مخالف کو اعتراضات کا موقعہ ہی نہ ملتا۔ لیکن اب اللہ تعالےٰ نے ارادہ کیا ہے کہ وہ اسلام کے پاک اور روشن چہرہ سے یہ سب گرد و غبار دور کرے اور اُس کی خوبیوں اور حُسن و جمال سے دنیا کو اطلاع بخشے چنانچہ اِسی غرض کے لئے اِس وقت جبکہ اسلام دشمنوں کے نرغہ میں ایک یتیم و بیکس کی طرح پھنسا ہُوا ہے اللہ تعالےٰ نے اپنا یہ سلسلہ قائم کیا ہے اور مجھے بھیجا ہے تا میں عملی سچائیوں اور خدا کے نشانات کے ساتھ اسلام کو دیگر ادیان پر غالب کروں (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۱۶) اسلام کے اِن نادان دوستوں نے اپنی راؤں اور خیالات کو داخل کر کے اصل امر کو بد نما بنانے کی کوشش کی ہے اور ان کی وہی مثال ہے۔ مادل علی موتہٖ الا دابۃ الارض یعنی سلیمان کی موت پر دلالت کرنے والا کوئی امر نہ تھا یہ ساری شرارت گویا دابۃ الارض کی تھی۔ کہ اُس نے

عصا کو کھا لیا۔ اور وہ گر پڑا۔ خدا تعالےٰ نے اِس آیت میں جو کچھ فرمایا ہے وہ بالکل سچ ہے۔ قرآنی قصص محض داستانیں اور کہانیاں نہیں ہیں بلکہ یہ حقائق اور معارف ہیں اسلام راستی کا عصا تھا۔ جو اپنے سہارے کھڑا تھا۔ اور اُس کے سامنے کوئی مخالف مذہب آریہ ہندو۔ عیسائی۔ یہودی۔ دہریہ دم نہ مار سکتا تھا۔ لیکن جب سے یہ دابۃ الارض پیدا ہوئے ہیں اور اُنہوں نے قرآن کو چھوڑ کر موضوع روایتوں پر اپنا انحصار رکھا ہوا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہر طرف سے اسلام پر حملے شروع ہو گئے ہیں۔ دابۃ الارض کے اصل معنے دیمک کے ہیں۔ جسمیں کوئی خیر نہیں اور وہ لکڑی اور مٹی وغیرہ کو اندر سے کھا جاتی ہے اسمیں فناہ کا مادہ ہے۔ اور اچھی چیز کو فنا کر دیتی ہے یعنی اُس کا مادہ آتشی ہے۔ اب اس آیت کا مطلب صاف ہے۔ کہ دابۃ الارض سے مراد اس وقت کے علماء ہیں جو قرآنی آیات کے غلط اور جھوٹے معنے کرتے ہیں۔ اور اس طرح اسلام پر جھوٹے الزام لگاتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت مسیح کی عظمت کو حد سے بڑھانا اور اُسے خدا تعالےٰ کی صفات سے متصف گردانتا اور پھر اُسے محی۔ شافی۔ عالم الغیب اور غیر متغیر ماننا۔ ایسا ہی اسلام پر یہ الزام لگانا کہ وہ تلوار کے بدوں نہیں پھیلا وغیرہ وغیرہ۔ بھوپال کے ایک مُلّا بشیر نامی نے مجھے دجّال کہا۔ حالانکہ یہ لوگ خود دجّال ہیں جو مجھے کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ خود حق کو چھپاتے اور اسلام کو بدنام کرتے ہیں غرض آیت کا مطلب یہ ہے کہ عصائے اسلام جس کے ساتھ اسلام کی شوکت اور رُعب تھا۔ اور جس کے ساتھ امن اور سلامتی تھی۔ اِس دابۃ الارض نے گرا دیا ہے۔ پس جیسے وہ دابۃ الارض تھا۔ یہ لوگ اُس سے بدتر ہیں اُس سے تو صرف مُلک میں فتنہ پڑا تھا لیکن ان لوگوں کے ذریعہ سے دین میں فتنہ و فساد برپا ہوا۔ اور کئی لاکھ مسلمان اسلام چھوڑ کر مرتد ہو گئے۔ ایک وہ وقت تھا۔ کہ اگر ایک شخص اسلام سے مرتد ہو جاتا تھا۔ تو قیامت بپا ہو جاتی تھی۔ یا اب یہ حال ہے۔ کہ کئی لاکھ مرتد ہو گئے اور کسی کو خیال بھی نہیں آتا۔ کئی کروڑ کتابیں اسلام کے خلاف حضرت نبی کریمؐ کی توہین اور ہجو میں لکھی گئی ہیں۔ لیکن کسی مسلمان کو خبر تک بھی نہیں۔ کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ہر ایک اپنے عیش و عشرت میں مشغول ہے اور دین کو ایک ایسی چیز سمجھ رکھا ہے جس کا نام بھی مہذب سوسائٹی میں لیا جانا گناہ سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اسلام پر جو اعتراضات طبعی اور فلسفہ کے رنگ میں کئے جاتے ہیں اُن کے جوابات یہ لوگ نہیں دے سکتے۔

اور اسلام کے حقائق کچھ بھی نہیں بتا سکتے۔ حالانکہ جو اعتراضات عیسائی لوگ اسلام پر کرتے ہیں وہ خود اُن کے اپنے مذہب پر بھی وارد ہوتے ہیں۔ سب سے بڑا اعتراض جہاد پر کیا جاتا ہے۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اعتراض خود عیسائی مسلمات پر بھی پڑتا ہے۔ اسلام نے جہاد کو دور کیا اسلئے اُسپر کوئی اعتراض نہیں پڑتا۔ ہاں حضرت موسےٰؑ کی لڑائیوں پر بڑے زور سے اعتراضات پڑتے ہیں جن کا جواب عیسائیوں کے پاس کچھ بھی نہیں۔ پھر خود عیسائیوں میں جو مذہبی لڑائیاں ہوئیں اور ایک فرقہ نے دوسرے کو قتل کیا آگ میں جلایا۔ اور نیز دیگر اقوام و مذاہب کے لوگوں پر ظلم و ستم توڑے جیسا کہ مسلمانوں پر سپین میں۔ ان اعتراضات کے جوابات عیسائی صاحبان قیامت تک نہیں دے سکتے۔

یہ بات بالکل سچ ہے کہ اسلام اپنی ذات میں کامل بے عیب اور پاک مذہب ہے۔ لیکن نادان دوست اچھا نہیں ہوتا۔ اس دابۃ الارض نے اسلام کا نادان دوست بن کر جو صدمہ اور نقصان اسے پہنچایا ہے۔ اُسکی تلافی بہت ہی مشکل ہے۔ لیکن اب اللہ تعالےٰ نے ارادہ فرمایا ہے کہ اسلام کا نور دنیا پر ظاہر ہو۔ اور دنیا کو معلوم ہو جائے کہ سچا اور کامل مذہب جو انسان کی نجات کا متکفل ہے وہ صرف اسلام ہی ہے۔ اسی لئے اللہ تعالےٰ نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا۔ بخرام کہ وقتِ تو نزدیک رسید و پائے محمدیاں بر منار بلند تر محکم افتاد۔ لیکن ان ناعاقبت اندیش نادان دوستوں نے خدا تعالےٰ کے اس سلسلہ کی کوئی قدر نہ کی۔ بلکہ اسی کوشش میں ہے کہ یہ نور نہ چمکے یہ لوگ اسے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ خوب یاد رکھیں۔ کہ خدا تعالےٰ وعدہ کر چکا ہے واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون۔ یہ لوگ مجھے گالیاں دیتے ہیں لیکن مجھے ان کی گالیوں کی پرواہ نہیں اور نہ اُن پر افسوس ہے۔ کیونکہ وہ اِس مقابلہ سے عاجز آ گئے ہیں۔ اور اپنی عاجزی اور درماندگی کو بجز اسکے نہیں چھپا سکتے۔ کہ مجھے گالیاں دیں۔ کفر کے فتوے لگائیں۔ جھوٹے مقدمات بنائیں۔ اور قسم قسم کے افترا اور بہتان باندھیں۔ وہ اپنی ساری طاقتوں کو کام میں لا کر میرا مقابلہ کر لیں۔ اور دیکھ لیں۔ کہ آخری فیصلہ کس کے حق میں ہوتا ہے۔ میں اُن کی گالیوں کی اگر پرواہ کروں تو وہ اصل کام جو خدا تعالےٰ نے میرے سُپرد کیا ہے رہ جاتا ہے۔ اس لئے جہاں میں اُنکی گالیوں کی پرواہ نہیں

کرتا۔ میں اپنی جماعت کو نصیحت کرتا ہوں۔ کہ اُن کے لئے بھی مناسب ہے۔ کہ اُن کی گالیاں سُنکر برداشت کریں۔ اور ہرگز ہرگز گالی کا جواب گالی سے نہ دیں۔ کیونکہ اس طرح پر برکت جاتی رہتی ہے۔ اُنہیں چاہیئے۔ کہ صبر اور برداشت کا نمونہ ظاہر کریں اور اپنے اخلاق دکھائیں۔ یقیناً یاد رکھو۔ کہ عقل اور جوش کے درمیان خطرناک دشمنی ہے۔ جب جوش اور غصہ آجاتا ہے تو عقل قائم نہیں رہ سکتی۔ لیکن جو شخص صبر کرتا ہے اور بردباری کا نمونہ دکھاتا ہے اُسے ایک نور دیا جاتا ہے جس سے اُسکی عقل اور فکر کی قوتوں میں ایک نئی روشنی پیدا ہو جاتی ہے اور پھر نور سے نور پیدا ہوتا ہے۔ غصہ اور جوش کی حالت میں چونکہ دل و دماغ تاریک ہوتے ہیں اس لئے تاریکی سے پھر تاریکی پیدا ہوتی ہے۔

میں پھر اصل مطلب کی طرف رجوع کرکے کہتا ہوں۔ کہ اسلام کی حالت اس وقت ہو رہی ہے۔ اور یہ مختلف فرقہ ہندیاں جو آئے دن ہوتی رہتی ہیں اور مخالف اس پر دلیر ہو رہے ہیں اور نہایت بیباکی سے اُس پر حملے کرتے اور اعتراضات کی بوچھاڑ برساتے ہیں یہ سب اسی دابۃ الارض کا فساد ہے۔ اُنہوں نے ہی اپنے غلط خیالات سے عیسائیوں کو مدد دی ہے۔ لیکن اب خدا کا شکر ادا کرو۔ کہ اُس نے عین وقت پر دستگیری فرمائی ہے۔ اور اس سلسلہ کو قائم کیا۔ اسلئے تمہیں مناسب ہے کہ اس فضل کو جو تمہیں دیا گیا ہے ضائع نہ کرو اور ادب کی نگاہ سے دیکھو۔ اور اس مدد اور نصرت کی جو تمہیں دی گئی ہے قدر کرو۔ یقیناً یاد رکھو۔ کہ خدا کی مدد کے بغیر اور اُس کے بلائے بغیر کوئی شخص راستی سے اور پوری قوت سے ایک امر کو بیان نہیں کر سکتا اور بغیر اُس کے خاص فضل کے دلائل ملتے ہی نہیں۔ اور نہ طرز بیان عطا ہوتا ہے۔ اور پھر یہ بھی خدا کا خاص فضل ہوتا ہے کہ اس طرز بیان اور مدلل گفتگو سے نیکی کی قوت رکھنے والے شخص کو جو خدا کی قوت اور طاقت پاکر روح القدس سے بھر کر بولتا ہے شناخت کر لیا جاتا ہے۔ پس تم پر بھی یہ خدا تعالےٰ کا خاص احسان ہے کہ اُس نے تمہیں یہ قوت عطا کی اور شناخت کی آنکھ دی اگر وہ یہ فضل نہ کرتا۔ تو جیسے دوسرے لوگ غفلت کے پردوں میں پڑے گالیاں دیتے ہیں تم بھی اُن میں ہی ہوتے۔ جس چیز نے تمہیں اس گمراہی سے باہر نکال دیا ہے وہ محض خدا کا فضل ہے۔ جیسے میاں عبدالحق صاحب (نومسلم) کو ہی دیکھو۔ کہ اگر خدا کا فضل ان کی دستگیری نہ کرتا۔ تو یہ کیونکر اُس

عیش کی جگہ سے نکل سکتے تھے خصوصاً ایسی حالت میں کہ اُسکے پاس گئی ناصح بھی جمع ہو گئے۔ اور انہوں نے قادیان آنے سے انہیں منع بھی کیا بلکہ ایک نے گالی بھی دی۔ حالانکہ گالی دینا ان کے مذہب میں منع ہے اور عام طور پر تہذیب اور شائستگی کے بھی خلاف ہے۔ لیکن ان تمام باتوں پر خدا کا فضل غالب آیا۔ اور انہیں یہاں کھینچ لایا۔ اور انہیں بدی کے اسباب میسر ہی نہ آئے ورنہ اگر یہ بیوی کر لیتے تو پھر ابتلا پیش آجاتا۔ لیکن خدا نے ہر طرح سے انہیں بچا لیا۔ خدا کا فضل مستحدث نہیں ہوتا۔ جس پر وہ کرم کرتا ہے اُسے ہر طرح سے بچا لیتا ہے یہ خیال مت کرو۔ کہ ہم مسلمان ہیں۔ اسلام بڑی نعمت ہے اسکی قدر کرو اور شکر کرو۔ اسکے اندر فلاسفی ہے جو زبان سے کہدینے سے حاصل نہیں ہوتی۔ اسلام اللہ تعالےٰ کے تمام تصرفات کے نیچے آجانے کا نام ہے اور اس کا خلاصہ خدا کی سچی اور کامل اطاعت ہے مسلمان وہ ہے جو اپنا سارا وجود خدا تعالےٰ کے حضور رکھدیتا ہے بدوں کسی امید یا داش کے۔ من اسلم وجہہ للہ فھو محسن" (الحکم جلد ۶ نمبر ۱) یعنی مسلمان وہ ہے جو اپنے تمام وجود کو اللہ تعالےٰ کی رضا کے حاصل کرنے کے لئے وقف کر دے اور اپنے آپ کو اُس کے سپرد کر دے اور اعتقادی اور عملی طور پر اُس کا مقصود اور غرض اللہ تعالےٰ ہی کی رضا اور خوشنودی ہو۔ اور تمام نیکیاں اور اعمال حسنہ جو اُس سے صادر ہوں۔ وہ مشقت اور تکلف کی راہ سے نہ ہوں۔ بلکہ اُنمیں ایک لذت اور حلاوت کی کشش ہو۔ جو ہر قسم کی تکلیف کو راحت سے تبدیل کر دے حقیقی مسلمان اللہ تعالےٰ سے پیار کرتا ہے۔ یہ سمجھ کر اور مان کر کہ وہ میرا محبوب و مولا پیدا کرنے والا اور محسن ہے۔ اسلئے اُسکے آستانہ پر سر رکھدیتا ہے۔ ایک سچے مسلمان کو اگر کہا جائے کہ ان اعمال کے بدلے میں اُسے کچھ نہ ملے گا اور نہ کوئی بہشت ہے نہ دوزخ۔ نہ آرام نہ لذت۔ تب بھی وہ اپنے اعمال صالحہ اور محبت الٰہی کو ہرگز ہرگز چھوڑ نہیں سکتا۔ کیونکہ اُسکی عبادات اور اللہ تعالےٰ سے تعلق اور اُسکی فرمانبرداری اور اطاعت میں قضائیت کسی اجر یا ثواب کی بنا اور امید پر نہیں ہے۔ بلکہ وہ اپنے وجود کو ایسی چیز سمجھتا ہے۔ کہ وہ فی الحقیقت اللہ تعالےٰ ہی کی شناخت اور اُسکی محبت و اطاعت کے لئے بنائی گئی ہے۔ اور بجز اسکے اُسکا کوئی مقصد اور غرض ہے ہی نہیں اس لئے وہ اپنی تمام خداداد قوتوں کو جب ان اغراض اور مقاصد کے لئے صرف کرتا

ہے۔ تو اُسے اپنے محبوب حقیقی کا ہی چہرہ نظر آتا ہے۔ بہشت دوزخ عذاب ثواب پر اُسکی نظر نہیں ہوتی۔ بس سچ سچ کہتا ہوں۔ کہ اگر مجھے اس امر کا یقین دلا دیا جائے کہ خدا تعالےٰ سے محبت کرنے اور اُسکی اطاعت میں سخت سے سخت سزا دیجائیگی۔ تو میں قسم اٹھا کر کہتا ہوں۔ کہ میری فطرت ایسی واقع ہوئی ہے۔ کہ وہ اِن تمام تکلیفوں اور بلاؤں کو لذت اور محبت کے جوش اور شوق کے ساتھ برداشت کرنے کو تیار ہے۔ اور باوجود ایسے یقین کے جو عذاب اور دُکھ کی صورت میں دلایا جائے کبھی خدا کی اطاعت اور فرمانبرداری سے ایک قدم باہر نکلنے کو ہزار بلکہ لاانتہا موت سے بڑھکر درد دُکھوں اور مصائب کا مجموعہ فرار دیتی ہے۔ جس طرح سے کہ اگر کوئی بادشاہ اِسبات کا عام اعلان کرادے کہ اگر کوئی ماں اپنے بچے کو دودھ نہ دے گی۔ تو بادشاہ اُس سے خوش ہوکر انعام دے گا۔ لیکن تاہم ایک ماں اِسبات کو گوارا نہیں کرسکتی۔ کہ انعام کی لالچ اور خواہش کی خاطر اپنے بچے کو ہلاک کر ڈالے۔ اسی طرح سے ایک سچّا مسلمان خدا تعالےٰ کے احکام سے باہر ہونا اپنے لئے ہلاکت کا موجب سمجھتا ہے خواہ اُسے اِس نافرمانی میں کتنی ہی آسائش اور آرام کا وعدہ دیا جائے پس حقیقی مسلمان ہونے کیلئے ضروری ہے کہ اس قسم کی فطرت حاصل کی جائے جسمیں خدا تعالےٰ کی محبت اور اطاعت کسی جزا اور سزا کی امید اور خوف پر مبنی نہ ہو۔ بلکہ فطرت کے طبعی خاصہ اور جزو کی طرح سے ہو۔ ایسی محبت بجائے خود مومن کے لئے ایک بہشت پیدا کر دیتی ہے۔ اور یہی انسان کی حقیقی بہشت ہے۔ اور کوئی انسان اس بہشت میں داخل نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اس راہ کو اختیار نہ کرے۔ اِس لئے میں تم کو جو میرے ساتھ تعلق رکھتے ہو۔ اسی راہ سے بہشت میں داخل ہونیکی تعلیم دیتا ہوں کیونکہ بہشت پانے کی حقیقی راہ یہی ہے۔ خدا تعالےٰ نے جو اتمام نعمت کی ہے۔ وہ یہی دین ہے جس کا نام اسلام رکھا ہے۔ پھر اس نعمت میں جمعہ کا دن بھی ہے۔ جس روز اتمام نعمت ہوا یہ اِسبات کی طرف اشارہ تھا۔ کہ دوبارہ اتمام نعمت جو لیظہرہ علی الدین کلہ کی صورت میں ہوگا وہ بھی ایک عظیم الشان جمعہ ہوگا۔ سو وہ جمعہ اب آگیا ہے۔ کیونکہ خدا تعالےٰ نے وہ جمعہ مسیح موعودؑ کے ساتھ مخصوص کر رکھا تھا۔ اِسلئے کہ اتمام نعمت کی دراصل دو ہی صورتیں ہیں۔ اوّل تکمیل ہدایت۔ دوم تکمیل اشاعت ہدایت اب تم غور کرکے دیکھ لو۔ کہ تکمیل ہدایت تو آنحضرتؐ کے زمانہ میں کامل طور پر ہوچکی۔ لیکن خدا تعالےٰ نے

مقدر کر رکھا تھا کہ تکمیل اشاعت ہدایت کا دوسرا زمانہ ہو جبکہ آنحضرتؐ بروزی رنگ میں ظہور فرمائیں۔ اور وہ زمانہ مسیح موعودؑ اور مہدی کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لیظہرہ علی الدین کلہ اسکی شان میں فرمایا گیا۔ جملہ مفسرین نے بالاتفاق اس امر کو تسلیم کیا ہوا ہے۔ کہ یہ آیت مسیح موعودؑ کے زمانہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے۔ کہ اظہار دین اُسی وقت ہو سکتا ہے۔ جبکہ کُل مذاہب میدان میں نکل آئیں اور اشاعت مذہب کے تمام ذرائع پیدا ہو جائیں سو وہ زمانہ خدا کے فضل سے آگیا ہے۔ چنانچہ اس زمانہ میں چھاپہ خانہ کی طاقت سے کتابوں کی اشاعت اور طبع میں جو جو سہولتیں میسّر آگئی ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ڈاکخانہ کے ذریعہ سے ساری دنیا میں تبلیغ ہو سکتی ہے۔ اخبارات کے ذریعہ سے تمام دنیا کے حالات سے اطلاع ملسکتی ہے۔ ریلوے اور جہازوں نے بری اور بحری سفر آسان کر دئے ہیں غرض جس قدر نئی نئی ایجادات ہوتی جارہی ہیں اُسی قدر عظمت کے ساتھ مسیح موعودؑ کے زمانہ کی تصدیق ہوتی جاتی ہے۔ اور اظہار دین کی صورتیں نکلتی آتی ہیں۔ اسلئے یہ وقت وہی وقت ہے جس کی پیشگوئی حضرت نبی کریمؐ کے ذریعہ سے لیظہرہ علی الدین کلہ کہہ کر فرمائی تھی۔ یہ وہی زمانہ ہے جو الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی کی شان کو بلند کرنے والا اور تکمیل اشاعت ہدایت کی صورت میں دوبارہ اتمام نعمت کا زمانہ ہے اور پھر یہ وہی وقت اور جمعہ ہے جسمیں وآخرین منھم لما یلحقوا بھم کی پیشگوئی پوری ہوتی ہے اس وقت رسول اللہؐ کا ظہور بروزی رنگ میں ہوا ہے۔ اور ایک جماعت صحابہؓ کی پھر قائم ہوئی ہے۔ اتمام نعمت کا وقت آپہنچا ہے۔ لیکن تھوڑے ہیں جو اس سے آگاہ ہیں اور بہت ہیں جو ہنسی اور ٹھٹھا کرتے ہیں لیکن وہ وقت بہت قریب ہے کہ خدا تعالےٰ اپنے وعدہ کے مطابق تجلی فرمائے اور اپنے زور آور حملوں سے دکھادے کہ اس کا نذیر سچا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں۔ کہ یہ ایک تقریب ہے جو اللہ تعالےٰ نے سعادت مندوں کیلئے پیدا کر دی ہے مبارک وہی ہیں جو اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ تم لوگ جنہوں نے میرے ساتھ تعلق پیدا کیا ہے اِس بات پر ہرگز ہرگز مغرور نہ ہو جاؤ کہ جو کچھ تم نے پانا تھا پالیا۔ سچ ہے کہ تم لوگ اُن منکروں کی نسبت قریب تر بہ سعادت ہو۔ جنہوں نے اپنے شدید انکار اور توہین سے خدا تعالےٰ کو ناراض کر دیا اور یہ بھی سچ ہے۔ کہ تم نے حسن ظن سے کام لے کر خدا تعالےٰ کے غضب سے اپنے آپکو بچانے کی فکر کی۔ لیکن سچی بات یہی ہے۔ کہ تم اس چشمہ

کے قریب آپہنچے ہو جو اس وقت خدا تعالےٰ نے ابدی زندگی کے لئے پیدا کیا ہے ہاں اب اسمیں سے پانی پینا ابھی باقی ہے۔ پس اللہ تعالےٰ سے اُسکے فضل کی توفیق مانگو کہ تمہیں اس چشمہ سے سیراب کرے کیونکہ بدوں اُسکے فضل کے کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ یہ میں یقیناً جانتا ہوں کہ جو شخص اِس چشمہ سے پانی پیئے گا وہ ہرگز ہلاک نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ پانی حیات جاودانی بخشتا ہے۔ اور ہلاکت سے بچاتا ہے۔ اور شیطان کے حملوں سے محفوظ کر دیتا ہے۔ اِس چشمہ سے سیراب ہونے کا کیا طریق ہے؟ یہی کہ خدا تعالےٰ نے جو دو حقوق تم پر قائم کئے ہیں اُن کو بجا لاؤ اور اُنہیں پورے طور پر ادا کرو۔ اُن میں سے پہلا حق تمہیں خدا تعالےٰ کا ہے۔ اور دوسرا اُسکی مخلوق کا۔ اپنے خدا تعالےٰ کو وحدہٗ لاشریک سمجھو۔ جیسا کہ اس شہادت کے ذریعہ سے تم اقرار کرتے ہو۔ اشھد ان لا الٰہ الا اللہ یعنی مَیں شہادت دیتا ہوں کہ کوئی محبوب مطلوب اور مطاع اللہ تعالےٰ کے سوا نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا پیارا جملہ ہے کہ اگر یہودیوں عیسائیوں یا دیگر مشرک بُت پرستوں کو سکھایا جاتا اور وہ اُسے سمجھ لیتے تو ہرگز ہرگز تباہ و ہلاک نہ ہوتے۔ اسی ایک کلمہ کے نہ ہونے کی وجہ سے اُن پر تباہی اور مصیبت آئی اور اُن کی روح مجذوم ہوکر ہلاک ہوگئی (الحکم جلد ۶ نمبر ۱۲) ایسا ہی فرمایا۔ قل ھو اللہ احد اللہ الصمد لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفوا احد۔ یعنی کہدو کہ وہ اللہ ایک ہے۔ وہ بے نیاز ہے۔ نہ کھانے پینے کی اُسکو ضرورت نہ زمان یا مکان کی اُسے حاجت نہ کسی کا باپ نہ بیٹا اور نہ کوئی اُس کا ہمسر ہے۔ یہ قرآن شریف کی ایک چھوٹی سی سورۃ ہے جو صرف ایک سطر میں آجاتی ہے۔ لیکن دیکھو کس طرح اس میں کس خوبی اور عمدگی کے ساتھ ہر قسم کے شرک سے اللہ تعالےٰ کی تنزیہہ کی گئی ہے۔ حصر عقلی میں شرک کی جس قدر اقسام آسکتی ہیں اُن سے اللہ تعالےٰ کو پاک بیان کیا ہے۔ آسمان و زمین کے اندر جو اشیاء ہیں وہ ایک تغیر کے نیچے ہیں صرف اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے بری ہے۔ اب یہ کیسی صاف اور ثابت شدہ صداقت ہے دماغ اسی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ نورِ قلب جسکی شریعت دل میں ہے اسپر شہادت دیتا ہے۔ قانونِ قدرت اسی کا مؤید و مصدق ہے یہاں تک کہ دنیا کا ایک ایک ذرہ اور درختوں کا ایک ایک پتہ اسپر گواہی دیتا ہے۔ پس اس کو شناخت کرنا ہی بڑی عظیم الشان بات ہے۔ اللہ تعالےٰ نے جو یہ چھوٹی سی سورۃ قرآن میں بیان فرمائی ہے یہ ایسی ہے کہ اگر توریت کے اتنے بڑے دفتر کی بجائے اسمیں

صرف اسی قدر تعلیم ہوتی جتنی اس سورۃ میں ہے۔ تو یہود تباہ نہ ہوتے۔ اور اناجیل کے اتنے مجموعے کی بجائے اگر اتنی ہی توحید کی تعلیم دی جاتی۔ تو آج دنیا کا ایک بڑا حصّہ مردہ پرست قوم نہ بنجاتا۔ لیکن یہ اللہ تعالےٰ کا خاص فضل ہے جو اسلام کے ذریعہ سے مسلمانوں کو ملا جسے حضرت نبی کریمؐ لیکر آئے جس پہلو سے بھی دیکھو مسلمان کے لئے بڑے فخر اور ناز کا موقعہ ہے مسلمانوں کا خدا پتھر۔ درخت حیوان ستارہ یا کوئی اور مردہ انسان نہیں ہے بلکہ وہ قادر مطلق خدا ہے جس نے زمین و آسمان اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے پیدا کیا وہ حیّ قیوم ہے پھر مسلمانوں کا رسول وہ رسول ہے جسکی نبوت اور رسالت کا دامن قیامت تک دراز ہے آپؐ کی رسالت مُردہ رسالت نہیں ہے۔ بلکہ اُسکے ثمرات اور برکات ہر زمانہ میں تازہ بتازہ پائے جاتے ہیں جو اُسکی صداقت اور نبوت کی ہر زمانہ میں دلیل ٹھہرتے ہیں چنانچہ اس وقت بھی خدا تعالےٰ نے اِن ثبوتوں اور برکات و فیوض کو جاری کر رکھا ہے اور مسیح موعودؑ کو بھیجکر نبوت محمدیہ کا ثبوت آج بھی دیدیا ہے۔ اور پھر اُسکی دعوت ایسی عام ہے کہ جو کل دنیا کے لئے ہیں جیسا فرمایا قل یاایہا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعاً اور پھر فرمایا وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین۔ کتاب دی تو ایسی کامل اور ایسی محکم اور یقینی کہ لاریب فیہ۔ اور فیہ کتب قیمۃ اور آیات محکمات۔ قول فصل میزان۔ مہیمن وغیرہ۔ غرض ہر طرح سے کامل اور مکمل دین مسلمانوں کا ہے جسکے لئے الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دنیا کی ٹھہرا لگ چکی ہے۔ پھر کسقدر افسوس ہے مسلمانوں پر کہ وہ ایسا کامل دین جو رضا الٰہی کا موجب اور باعث ہے رکھکر بھی بے نصیب ہیں اور اس دین کے برکات اور ثمرات سے حصّہ نہیں لیتے۔ بلکہ خدا تعالےٰ نے جو ایک سلسلہ ان برکات کو زندہ کرنے کے لئے قائم کیا۔ تو اُنمیں سے اکثر انکار کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے اور لست مرسلا اور لست مومنا کی آوازیں بلند کرنے لگے۔ خوب یاد رکھو۔ کہ محض خدا تعالیٰ کی توحید کا اقرار ان برکات کو جذب نہیں کر سکتا۔ جو اس اقرار اور اسکے دیگر لوازمات یعنی اعمال صالحہ سے پیدا ہوتے ہیں یہ سچ ہے۔ کہ توحید اعلیٰ درجہ کی چیز ہے۔ جو ایک سچے مسلمان اور خدا ترس انسان کو اختیار کرنی چاہیئے۔ لیکن توحید کی تکمیل کیلئے ایک دوسرا پہلو یعنی محبت الٰہی بھی ہے یعنی اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا۔ قرآن شریف کی تعلیم کا اصل مقصد اور مدعا یہی ہے۔ کہ جیسے خدا تعالےٰ وحدہٗ لاشریک ہے ایسا ہی محبت کے رو سے بھی اُسکو

وحدہٗ لاشریک یقین کیا جائے۔ اور کل انبیاءؑ کی تعلیم کا اصل منشاء بھی ہمیشہ یہی رہا ہے چنانچہ لا الٰہ الا اللہ جس طرح ایک طرف توحید کی تعلیم دیتا ہے ساتھ ہی اسکے توحید کی تکمیل یعنی محبت کی بھی ہدایت دیتا ہے اور جیسا کہ مَیں نے ابھی کہا ہے۔ یہ ایک ایسا پیارا پُر معنی جملہ ہے جسکی نظیر تورات و انجیل میں نہیں پائی جاتی۔ اور نہ دنیا کے کسی اور مذہب نے ایسی کامل تعلیم دی ہے الٰہ کے معنی ہیں ایسا محبوب اور معشوق جسکی پرستش کیجائے گویا اسلام کی تعلیم محبت کے اصل مفہوم کو پورے اور کامل طور پر ادا کرتی ہے۔ یاد رکھو کہ توحید کی تعلیم بدوں محبت کے ناقص اور ادھوری ہے اللہ تعالےٰ کے ساتھ محبت کرنے کے کیا معنی ہیں؟ یہی کہ اپنے والدین۔ جورو۔ اپنی اولاد اور اپنے نفس۔ غرض ہر ایک دنیاوی چیز پر اللہ تعالےٰ کی رضا کو مقدم کر لیا جائے۔ چنانچہ قرآن شریف میں آیا ہے۔ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَذِکْرِکُمْ آبَاءَکُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِکْرًا یعنی اللہ تعالےٰ کو ایسا یاد کرو کہ جیسا تم اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ اور سخت درجہ کی محبت کے ساتھ یاد کرو۔ اب یہاں پر یہ امر بھی غور طلب ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ نے یہ تعلیم نہیں دی کہ تم خدا کو باپ کہا کرو۔ بلکہ یہ اسلئے سکھایا ہے کہ نصاریٰ کی طرح دھوکا نہ لگے اور اُسے باپ کر کے ہی پکارنے لگو۔ اگر کوئی شخص یہاں پر یہ اعتراض کرے کہ پھر باپ سے کم درجہ کی محبت ہوئی؟ تو اس اعتراض کے رفع کرنے کے لئے فرمایا اَوْ اَشَدَّ ذِکْرًا۔ اگر یہ الفاظ نہ ہوتے تو کچھ اعتراض ہو سکتا تھا لیکن ان الفاظ نے مدعا کو صاف کر دیا۔ جو لوگ خدا کو باپ کہتے ہیں وہ کیسے گر گئے ہیں۔ کہ ایک عاجز انسان کو خدا بنا بیٹھے۔

یاد رکھو کہ بعض الفاظ ابتلا کے لئے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ کو نصاریٰ کا ابتلا یعنی آزمانا منظور تھا۔ اس لئے اُنکی کتب میں انبیاء کی یہ اصطلاح ٹھہر گئی لیکن چونکہ وہ علیم و حکیم ہے۔ اسلئے پہلے ہی سے لفظ اب کو کثیر الاستعمال کر دیا لیکن نصاریٰ کی بدقسمتی کہ جب مسیح نے یہ لفظ بولا تو اُنہوں نے حقیقت پر محمول کر لیا۔ اور دھوکا کھا گئے حالانکہ مسیح نے یہ کہکر کہا کہ تمہاری کتابوں میں لکھا ہے۔ تم الٰہ ہو۔ اس شرک کو مٹانا چاہا۔ لو اُنہیں سمجھانا چاہا لیکن نادانوں نے پرواہ نہ کی اور حضرت مسیح کی اِس تعلیم کی موجودگی میں بھی اُسے ابن اللہ قرار دے دیا۔ یہودیوں کو بھی اِسی قسم کا ابتلا آیا چونکہ یہ موذی قوم تھی اِنکی درخواست پر من و سلویٰ نازل ہوا کیونکہ اس سے طاعون پیدا کرنے کا مقصد تھا اللہ تعالےٰ

کو علم تھا۔ کہ وہ حد سے زیادہ نکل جائیں گے جسکی سزا طاعون تھی اس لئے پہلے سے ہی ایسے سامان رکھدئے۔ میں پھر اصل مکالمہ کی طرف آتا ہوں کہ اصل توحید کو قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت سے پورا حصہ لو۔ اور یہ محبت ثابت نہیں ہو سکتی جبتک کہ عملی حصّہ میں کامل نہ ہو۔ صرف زبان سے اسکا ثبوت نہیں مل سکتا۔ مثلاً جس طرح کوئی شخص صرف مصری کا نام لیتے لیتے شیریں کام نہیں ہوتا یا اگر زبان سے کسی شخص کی دوستی کا اعتراف کرے اور مصیبت اور وقت پڑجانے پر اُسکی امداد و دستگیری کرنے سے پہلو تہی کرے۔ تو وہ دوست صادق نہیں ٹھہر سکتا۔ اسی طرح پر اگر خدا تعالےٰ کی توحید کا نرا زبانی ہی اقرار ہو۔ اور اُسکے ساتھ محبت کا بھی محض زبانی ہی اقرار موجود ہو تو اس کا کچھ فائدہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ حصّہ زبانی اقرار کی بجائے عملی حصّہ کو زیادہ درکار ہے۔ اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ زبانی اقرار کوئی چیز نہیں ہے میری غرض یہ ہے کہ زبانی اقرار کیلئے عملی تصدیق لازمی ہے اسلئے ضروری ہے۔ کہ خدا کی راہ میں اپنی زندگیاں وقف کرو اور یہی حقیقی اسلام ہے اور یہی وہ غرض ہے جسکیلئے کہ میں بھیجا گیا ہوں۔ جو شخص اس چشمہ کے قریب نہیں آتا جو خدا تعالےٰ نے اس غرض کیلئے جاری کیا ہے۔ وہ یقیناً بے نصیب رہتا ہے اگر کچھ لیتا ہے اور مقصد کو حاصل کرتا ہے۔ تو طالب صادق کو چاہیئے کہ وہ چشمہ کی طرف بڑھے اور آگے قدم رکھے۔ اور اس جاری چشمہ کے کنارے پر اپنا مُنہ رکھدے۔ اور یہ ہو نہیں سکتا۔ جبتک کہ خدا تعالےٰ کے سامنے غیریت کا چولہ اُتار کر آستانہ الوہیت پر نہ گر پڑے اور یہ عہد نہ کرے کہ خواہ دنیا کی وجاہت جاتی رہے اور مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں۔ تو بھی وہ خدا کو نہیں چھوڑے گا۔ اور اُسکی راہ میں ہر قسم کی قربانی کرنے پر تیار رہوگا۔ حضرت ابراہیمؑ کا یہی بڑا اخلاص تھا کہ خدا کی رضا کیلئے بیٹا قربانی کرنے کیلئے تیار ہوگیا۔ اسلام کا منشا بھی یہی ہے۔ کہ بہت سے ابراہیم بنائے پس تم میں سے ہر ایک کو کوشش کرنی چاہیئے کہ ابراہیم بنے میں تمہیں تاکید کرتا ہوں۔ ولی پرست نہ بنو بلکہ ولی بنو۔ اور پیر پرست نہ بنو بلکہ پیر بنو۔ تم ان راہوں سے آؤ بیشک وہ تنگ راہیں ہیں۔ لیکن ان سے داخل ہوکر راحت اور آرام ملتا ہے۔ مگر یہ ضروری ہے۔ کہ اس دروازہ سے بالکل ہلکا ہوکر گذرنا پڑے گا۔ اگر بہت بڑی گٹھڑی سر پر ہوگی تو بہت مشکل ہے کہ اس دروازہ سے گذرنا چاہتے ہو۔ تو اس گٹھڑی کو جو دنیا کے تعلقات اور دنیا کو دین پر مقدم کرنیکی ہے پھینکدو۔ ہماری جماعت اگر خدا کو خوش کرنا چاہتی ہے تو اُسے چاہیئے کہ اس گٹھڑی کو

فوراً پھینک دے۔ تم یقیناً یاد رکھو۔ کہ اگر تم میں وفاداری اور اخلاص نہ ہو۔ تو تم جھوٹے ٹھہرو گے۔ اور اللہ تعالےٰ کے حضور راستباز نہیں بن سکتے۔ ایسی صورت میں دشمن سے پہلے وہ دوست ہلاک ہو گا جو وفاداری کو چھوڑ کر غداری کی راہ اختیار کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ فریب نہیں کھا سکتا۔ اور نہ کوئی اُسے فریب دے سکتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ تم سچا اخلاص اور صدق پیدا کرو تم پر خدا تعالیٰ کی حجت سب سے بڑھ کر پوری ہوئی ہے۔ تم میں سے کوئی بھی نہیں ہے۔ جو یہ کہہ سکے۔ کہ اُس نے کوئی نشان نہیں دیکھا پس خدا تعالیٰ کے الزام کے نیچے ہو۔ اسلئے ضروری ہے۔ کہ تقویٰ اور خشیت تم میں سب سے زیادہ پیدا ہو۔ خدا تعالےٰ نے قرآن شریف میں مختلف طریقوں اور پہلوؤں سے اس سلسلہ کی حقانیت کو ثابت کیا ہے۔ اور بتایا ہے۔ یہاں تک کہ ہر ایک قصہ میں اُسکی طرف اشارہ کیا ہے مثلاً ذوالقرنین کا قصہ ہے۔ اسمیں اسی کی پیشگوئی ہے چنانچہ قرآن شریف کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین مغرب کی طرف گیا۔ تو اُسے آفتاب غروب ہوتا نظر آیا یعنی تاریکی پائی۔ اور ایک گدلا چشمہ اُس نے دیکھا۔ وہاں پر ایک قوم تھی۔ پھر مشرق کی طرف چلتا ہے تو دیکھا کہ ایک ایسی قوم ہے جو کسی اوٹ میں نہیں ہے۔ اور وہ دھوپ سے جلتی ہے۔ تیسری قوم ملی جس نے یاجوج ماجوج سے بچاؤ کی درخواست کی۔ اب یہ بظاہر تو قصہ ہے۔ لیکن حقیقت میں ایک عظیم الشان پیشگوئی ہے۔ جو اس زمانہ سے متعلق ہے۔ خدا تعالیٰ نے بعض حقائق تو کھولدئے ہیں۔ اور بعض مخفی رکھے ہیں اس لئے کہ انسان اپنے قوائے سے کام لیں۔ اگر انسان نرے منقولات سے کام لے تو وہ انسان نہیں ہو سکتا۔ ذوالقرنین اس لئے نام رکھا کہ وہ دو صدیوں کو پائیگا۔ اب جس زمانہ میں خدا تعالےٰ نے مجھے بھیجا ہے۔ سب صدیوں کو بھی جمع کر دیا۔ کیا یہ انسانی طاقت میں تھا۔ کہ اسطرح پر جملہ اقوام کی دو صدیاں جمع ہو جائیں ہندوؤں۔ عیسائیوں وغیرہ سب کی دو دو صدیاں پائیں مفتی صاحب نے تو کوئی ۱۶ یا ۱۷ صدیاں جمع کر کے دکھائی تھیں۔ غرض ذوالقرنین کے معنی ہیں۔ دو صدیاں پانیوالا اب خدا تعالےٰ نے اُسکے لئے تین قوموں کا ذکر کیا ہے پہلی قوم سے مراد یہ ہے کہ وہ قوم جو مغرب میں ہے اور آفتاب وہاں غروب ہوتا ہے اور وہ تاریکی کا چشمہ ہے یہ عیسائیوں کی قوم ہے جس کا آفتاب صداقت غروب ہو گیا۔ اور آسمانی حق اور نور اُن کے پاس نہیں رہا۔ دوسری قوم اُسکے مقابل میں وہ ہے جو آفتاب کے پاس ہے مگر آفتاب سے فائدہ نہیں اٹھا سکتی یہ مسلمان کی قوم ہے جن کے پاس آفتاب صداقت قرآن شریف اس وقت موجود ہے۔ مگر دابۃ الارض نے اُنکو بیخبر بنا دیا ہے اور وہ اس سے اُن فوائد کو حاصل نہیں کر سکتے جو جلنے اور دکھ اٹھانے کے ظاہر پر سنی کیوجہ سے اُنہیں

آیا پس یہ قوم اسطرح پر بے نصیب ہوگئی۔ اب ایک تیسری قوم ہے۔ جسنے ذوالقرنین سے التماس کی کہ یاجوج ماجوج کے لئے بند کردے تاکہ وہ اُن کے حملوں سے محفوظ ہوجائیں۔ وہ ہماری قوم ہے جس نے اخلاص اور صدق دل سے قبول کیا۔ خدا تعالیٰ کی تائیدات سے بس اُن حملوں سے اپنی قوم کو محفوظ کر رہا ہوں۔ جو یاجوج ماجوج کر رہے ہیں۔ پس اس وقت خدا تعالےٰ تم کو تیار کر رہا ہے اس لئے تمہارا فرض ہے کہ سچی توبہ کرو۔ اور اپنی سچائی اور وفاداری سے خدا تعالیٰ کو راضی کرو تاکہ تمہارا آفتاب غروب نہ ہو۔ اور تاریکی کے چشمہ کے پاس جانے والے نہ ٹھہرو۔ اور نہ تم اُن لوگوں میں سے بنو جنہوں نے آفتاب سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا پس تم اس آفتاب سے پورا فائدہ حاصل کرو اور پاک چشمہ سے پانی پیو۔ تا خدا تم پر رحم کرے۔ وہ انسان بدقسمت ہوتا ہے جو خدا تعالیٰ کے وعدوں پر ایمان لاکر وفاداری اور صبر کے ساتھ ان کا انتظار نہیں کرتا۔ اور شیطان کے وعدوں کو یقینی سمجھ بیٹھتا ہے۔ اس لئے تم لوگ کبھی بے دل نہ ہوجاؤ اور تنگی اور عسر کی حالت میں گھبراؤ نہیں خدا تعالیٰ رزق کے معاملہ میں خود ہی قرآن شریف میں فرماتا ہے وفی السماء رزقکم وما توعدون انسان جب خدا کو چھوڑتا ہے تو پھر شیطان کا غلام بنجاتا ہے۔ وہ انسان ایک بڑی ذمہ واری کے نیچے ہوتا ہے۔ جو خدا تعالےٰ کی آیات اور نشانات کو دیکھ چکا ہو۔ پس کیا تم میں سے کوئی ہے جو یہ کہے کہ اُس نے کوئی نشان نہیں دیکھا؟ بعض نشان اس قسم کے ہیں کہ لاکھوں کروڑوں انسان ان کے گواہ ہیں پس جو شخص ان نشانوں کی قدر نہیں کرتا اور اُن کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے وہ اپنی جان پر ظلم کرتا ہے خدا تعالےٰ اُسکو دشمن سے پہلے ہلاک کردیگا۔ کیونکہ وہ شدید العقاب بھی ہے۔ جو شخص اپنے آپکو درست نہیں کرتا۔ وہ نہ صرف اپنی جان پر ظلم کرتا ہے بلکہ اپنی بیوی بچوں پر بھی ظلم کرتا ہے۔ کیونکہ جب وہ خود تباہ ہوجائیگا تو اُسکے بیوی بچے بھی تباہ وخوار و ہلاک ہوجائیں گے۔ خدا تعالیٰ اُسی کی طرف اشارہ کرکے فرماتا ہے ولا یخاف عقبٰھا مرد چونکہ الرجال قوامون علے النساء کا مصداق ہے۔ اسلئے اگر وہ لعنت لیتا ہے تو اُس لعنت کا حصّہ اپنی بیوی بچوں کو بھی دیتا ہے۔ اور اگر برکت پاتا ہے تو ہمسایوں اور شہر والوں کو بھی دیتا ہے۔ اس وقت کل مُلک میں طاعون کی آگ لگ رہی ہے۔ وہ لوگ غلطی کر رہے ہیں جو اسکو ملعون کہتے ہیں یہ خدا تعالےٰ کا ایک فرشتہ ہے جو اسوقت ایک خاص کام کے لئے مامور کیا گیا ہے اس کا علاج خدا تعالےٰ نے مجھے یہی بتایا ہے ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتٰی یغیروا ما بانفسھم۔ یہ طاعون بدکاریوں اور فسق وفجور اور میرے انکار و استہزاء کا نتیجہ ہے۔ اور یہ نہیں رُک سکتا جبتک

کہ لوگ اپنے اعمال میں پاک تبدیلی نہ کریں اور سب و شتم سے اپنی زبانوں کو نہ روکیں پھر خدا فرماتا ہے اذ لا اوی القریۃ یعنی اس گاؤں کو پریشانی اور انتشار سے حفاظت میں لے لیا کیا اس گاؤں میں ہر قسم کے لوگ چور ہڑے۔ چمار۔ دہریہ اور شراب پینے والے اور بیچنے والے اور دیگر اقسام کے لوگ نہیں رہتے مگر خدا نے میرے وجود کے باعث سارے گاؤں کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ اور اس افراتفری اور موت الکلاب سے اسے محفوظ رکھا جو دوسرے قصبوں میں ہوتی ہے۔ غرض یہ خدا تعالےٰ کے نشان ہیں ان کو عزت اور عبرت کی نگاہ سے دیکھو اور اپنی ساری قوتوں کو خدا تعالیٰ کی مرضی کے نیچے استعمال کرو۔ توبہ اور استغفار کرتے رہو۔ تا خدا تم پر اپنا فضل کرے والحکم جلد ۶ نمبر ۱۹)

۲۸ دسمبر ۱۹۰۱ء مرشد اور مرید کے تعلقات اُستاد اور شاگرد کی مثال سے سمجھ لینے چاہئیں جس طرح سے کہ شاگرد اپنے اُستاد سے فائدہ اٹھاتا ہے اُسی طرح سے مرید اپنے مرشد سے فائدہ حاصل کرتا ہے۔ لیکن شاگرد اگر اپنے اُستاد سے تعلق تو رکھے لیکن اپنی تعلیم میں ترقی نہ کرے تو فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔ یہی حال مرید کا ہے۔ پس اس سلسلہ میں تعلق پیدا کر کے اپنی معرفت اور علم کو بڑھانا چاہیئے۔ طالب حق کو ایک مقام پر پہنچکر ہرگز ٹھہر نہ جانا چاہیئے ورنہ شیطان لعین دوسری طرف توجہ کو پھیر دیگا۔ اور جس طرح سے کہ بند پانی میں عفونت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح سے اگر مومن اپنی ترقیات کیلئے سعی نہ کرے تو وہ گر جاتا ہے۔ پس سعادت مند کا فرض ہے۔ کہ وہ طلب دین میں لگا رہے۔ ہمارے نبی کریم سے بڑھکر کوئی دوسرا انسان کامل نہیں گذرا۔ لیکن آپ کو بھی رب زدنی علماً کی دعا تعلیم ہوئی تھی۔ پھر دوسرا کون شخص ہے جو اپنی معرفت اور علم پر کامل بھروسہ کر کے ٹھہر جائے۔ اور آئندہ ترقی کی ضرورت نہ سمجھے جوں جوں انسان اپنے علم اور معرفت میں ترقی کریگا اسے معلوم ہوتا جائیگا کہ ابھی بہت سی باتیں حل طلب باقی ہیں۔ بعض امور جنکو وہ ابتدائی نگاہ میں (اُس بچے کیطرح جو اقلیدس کے اشکال کو محض بیہودہ سمجھتا ہے) بالکل بیہودہ سمجھتے تھے آخر وہی امور صداقت کی صورت میں اُنہیں نظر آئے۔ اسلئے کسقدر ضروری ہے کہ اپنی حیثیت کو بدلنے کیساتھ ہی علم کو بڑھانے کے لئے ہر بات کی تکمیل کی جائے۔ تم لوگوں نے بہت سی بیہودہ باتوں کو چھوڑ کر اس سلسلہ کو قبول کیا ہے۔ اسلئے اگر تم اسکے بارہ میں پورا پورا علم اور بصیرۃ حاصل نہیں کرو گے تو اس میں شامل ہونے سے تمہیں کیا فائدہ حاصل ہوگا تمہارے یقین اور معرفت میں کیونکر قوت پیدا ہوگی

اور ذرہ ذرہ سی بات پر شکوک اور شبہات پیدا ہونگے۔ اور آخر تمہارے قدم کو ڈگمگا جانیکا خطرہ ہے
دیکھو دنیا میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں ایک تو وہ جو اسلام قبول کر کے دنیا کے کاروبار
اور تجارتوں میں مصروف ہو جاتے ہیں شیطان اُنکے سر پر سوار ہو جاتا ہے۔ اس سے میرا یہ
مطلب نہیں ہے کہ تجارت کرنی منع ہے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ کیونکہ صحابہؓ تجارتیں بھی کرتے تھے
لیکن وہ ہر حال میں دین کو دنیا پر مقدم رکھتے تھے۔ انہوں نے جب اسلام کو قبول کیا تو اسلام
کے متعلق وہ سچّا علم جو یقین سے اُن کے دلوں کو لبریز کر دے۔ انہوں نے حاصل کیا یہی وجہ تھی
کہ وہ کسی میدانِ آزمائش میں شیطان کے حملے سے نہیں ڈگمگائے۔ اور کوئی امر انہیں حق کے
اظہار سے روک نہ سکا اس سے میرا مطلب یہ ہے۔ کہ اوّل قسم کے لوگ بالکل دُنیا ہی کے بندے
اور غلام ہو جاتے ہیں اور اسی کے پرستار بن جاتے ہیں ایسے لوگوں پر شیطان اپنا غلبہ اور قابو پا
لیتا ہے۔ دوسری قسم کے وہ لوگ ہوتے ہیں جو رات دن دین کی ترقی کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔
اور یہ وہ گروہ ہوتا ہے جو حزب اللہ کہلاتا ہے اور جو شیطان اور اُسکے لشکر پر فتح پاتے ہیں مال
چونکہ تجارت سے بڑھتا ہے اسلئے خدا تعالےٰ نے بھی طلب دین اور ترقی دین کی خواہش کو ایک
تجارت ہی قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے ھل ادلکم علےٰ تجارۃ تنجیکم من عذاب الیم سب
سے عمدہ تجارت دین کی ہے جو دردناک عذاب سے نجات دیتی ہے۔ پس میں بھی خدا تعالےٰ کے
انہیں الفاظ میں تمہیں یہ کہتا ہوں کہ ھل ادلکم علےٰ تجارۃ تنجیکم من عذاب الیم
میں زیادہ امید اُن پر رکھتا ہوں جو دینی ترقی اور شوق کو کم نہیں کرتے اور جو لوگ اس شوق کو کم کر
دیتے ہیں مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ شیطان اُن پر قابو نہ پالے اسلئے کبھی سُست نہیں ہونا
چاہیئے۔ بلکہ ہر ایک امر کو جو سمجھ میں نہ آئے پوچھ لینا چاہیئے۔ تاکہ معرفت میں زیادتی ہو۔ پوچھنا حرام
نہیں۔ بلکہ بحیثیت انکار کے بھی پوچھنا چاہیئے۔ اور نیز عملی ترقی کیلئے بھی۔ جو شخص عملی ترقی چاہتا
ہے اُسے چاہیئے۔ کہ قرآن شریف کو غور سے پڑھے اور جہاں سے سمجھ میں نہ آئے دریافت کر
لے۔ اور اگر بعض معارف سمجھ نہ سکے تو دوسروں سے دریافت کر کے فائدہ پہنچائے۔ قرآن شریف
ایک دینی سمندر ہے۔ جسکی تہ میں بڑے بڑے نایاب اور بے بہا گوہر موجود ہیں۔ جب تم کسی
غیبائی سے ملو گے تو دیکھو گے کہ اُن میں نقالوں اور تمسخر کرنیوالوں کی طرح دیانت مفقود
نظر آئیگی۔ یوں تو اُن میں سے بعض ایسے ہیں جو ترجمہ قرآن سے واقفیت کے مدعی ہیں۔ لیکن
گو انہوں نے اسمیں مشق کی ہے تاہم اُنمیں روحانیت نام کو نہیں۔ اور اسکا ہمیں بارہا تجربہ ہوا

ہے جب بھی اُنہیں مقابلہ کیلئے پکارا گیا انہوں نے گریز کی راہ اختیار کی۔ اگر واقعی جیسا کہ وہ دعوے کرتے ہیں اُن میں روحانیت ہے اور اُنکی معرفت اور علم الیقین کے درجہ تک پہنچا ہُوا ہے۔ تو پھر کیا وجہ کہ وہ ہمارے مقابلہ سے گریز کرتے ہیں دیکھو لاہور کے بشپ صاحب نے لاہور میں تین بڑے اہم مضامین پر لکچر دئے۔ اور اپنی قرآن اور حدیث دانی پر بڑے بڑے دعوے کئے لیکن جب اُسے ہم نے مقابلہ کی دعوت دی تو باوجودیکہ اخبار پائونیر نے بھی شرمندگی دلائی لیکن وہ یہ کہہ کر کہ ہمارا دشمن ہے مقابلہ سے بھاگ گیا۔ ہمیں نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بشپ صاحب کو مسیح کی تعلیم کا کامل نمونہ ہونا چاہیئے تھا۔ اور انجیلی تعلیم اپنے دشمنوں سے پیار کرو پر اُسکو پورا پورا عمل کرنا چاہیئے تھا اگر بالفرض میں اُسکا دشمن بھی ہوتا۔ حالانکہ میں سچ سچ کہتا ہوں اور خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ نوع انسان کا سب سے بڑھکر خیر خواہ اور دوست میں ہوں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ میں اُن تعلیمات کا دشمن ہوں جو انسان کی روحانی دشمن ہیں۔ اور اُسکی نجات کی دشمن ہیں غرضیکہ بشپ صاحب کو کئی بار اخبارات نے اس معاملہ میں شرمندہ بھی کیا لیکن اُنہوں نے میرے مقابلہ پر نہ نکلنا تھا سو نہ نکلے۔ عیسائی صاحبان کی یہ عادت ہے۔ کہ اگر کسی شخص کو سادہ دیکھتے ہیں تو اگر وہ چھوٹا ہے تو بیٹا بنا کر اور اگر بڑا ہے تو باپ بنا کر اُسکے اندر دخل پیدا کرتے ہیں۔ اور اگر دیکھتے ہیں۔ کہ وہ ہر طرح باخبر آدمی ہے تو پھر اُس سے بغض کرتے ہیں۔ وجہ یہ کہ جب وہ خدا تعالےٰ سے تعلق توڑ بیٹھے ہیں تو اُنکے دل میں اُسکی مخلوق کیلئے سچی ہمدردی کیسے ہو سکتی ہے۔ لیکن ہماری جماعت ایک خاص جماعت ہے اُسے عام مسلمانوں کی طرح نہ سمجھ بیٹھیں۔ دوسرے مسلمان دابۃ الارض ہیں اِسلئے اُسکے مخالف ہیں۔ جو آسمان سے آیا ہے۔ کیونکہ جو شخص زمینی بات کرتا ہے وہی دابۃ الارض ہے اللہ تعالےٰ نے ایسا ہی فرمایا تھا۔ روحانی امور کو وہی دریافت کرتے ہیں جنمیں کوئی روحانی مناسبت ہو۔ چونکہ ان لوگوں میں کوئی روحانی مناسبت نہ تھی۔ اِسلئے انہوں نے عصائے دین کو کھا لیا ہے۔ جیسے حضرت سلیمانؑ کے عصا کو کھا لیا تھا اس آیت کے بعد قرآن شریف میں لکھا ہے۔ کہ جب جنوں کو پتہ لگا تو انہوں نے سرکشی اختیار کی اسی طرح پر عیسائی قوم نے جب اسلام کی یہ حالت دیکھی یعنی جب اس دابۃ الارض نے اس عصاء راستی کو کمزور کر دیا۔ تو ان اقوام کو اسلام پر وار کرنے کا موقعہ مل گیا جن وہ ہے۔ جو چھپ کر وار کرے اور پیار کے رنگ میں دشمنی کرے۔ ویسا ہی پیار جیسا کہ سنخاس نے حوّا سے کیا تھا۔ ایسے پیار کا نتیجہ بھی وہی ہونا چاہیئے تھا جو ابتدا میں ہوا تھا۔ اور

جس سے آدم پر مصیبت آئی تھی۔ اُسوقت شیطان گویا خدا سے بڑھکر خیر خواہ بنگیا تھا۔ اسی طرح پر عیسائی لوگ بھی وہی حیات ابدی پیش کرتے ہیں جو شیطان نے آدم وحوّا کے سامنے پیش کی تھی۔ اِسلئے قرآن شریف نے اوّل و آخر کو اُسی پر ختم کیا۔ اُسمیں یہ بھید تھا۔ کہ نا بتایا جائے کہ ایک آدم آخر میں بھی آنیوالا ہے۔ قرآن شریف کے شروع یعنی سورہ فاتحہ کو ولا الضالین پر ختم کیا۔ اور یہ امر سارے مفسرین بالاتفاق مانتے ہیں کہ ولا الضالین سے مراد عیسائی ہیں اور قرآن شریف جہاں ختم ہُوا وہ یہ ہے۔ قل اعوذ برب الناس۔ ملک الناس۔ الٰہ الناس من شر الوسواس الخناس الذی یوسوس فی صدور الناس من الجنۃ والناس۔ اس سے پہلے قل ھو اللہ میں خدا تعالیٰ کی توحید بیان فرمائی اور اسطرح پر گویا تثلیث کی تردید کر دی۔ پھر اُسکے بعد سورۃ الناس کا بیان کرنا صاف ظاہر کرتا ہے۔ کہ یہ عیسائیوں کی طرف اشارہ ہے۔ اسلئے قرآن شریف نے آخری وصیت یہ فرمائی کہ شیطان سے بچتے رہو۔ یہ شیطان وہی نخاش ہے جسکو اس سورۃ میں خناس فرمایا ہے اور جس سے بچنے کی ہدایت فرمائی۔ اور یہ جو فرمایا۔ کہ رب کی پناہ میں آؤ جس سے معلوم ہُوا۔ کہ یہ جسمانی امور نہیں ہیں۔ بلکہ روحانی امور ہیں یعنی خدا کی معرفت معارف وحقائق پر پختہ ہو جاؤ۔ تو شیطان سے بچ جاؤ گے۔ اِس آخری زمانہ میں شیطان اور آدم کی آخری جنگ کا خاص ذکر ہے۔ شیطان کی لڑائی خدا اور اُسکے فرشتوں سے آدم کے ذریعہ سے ہوتی ہے اِسلئے اللہ تعالےٰ اسکے ہلاک کرنے کیلئے پورے سامان کے ساتھ نزول کریگا۔ اور خدا کا مسیح اُسکا مقابلہ کریگا۔ اصل میں یہ لفظ مشیح ہے جسکے معنے عربی اور عبرانی میں خلیفہ کے ہیں احادیث میں مسیح آیا ہے اور قرآن میں خلیفہ کا لفظ اسکے لئے استعمال ہُوا ہے۔ غرض اُسکے لئے مقدر تھا کہ اِس آخری جنگ میں خاتم الخلفاء چھٹے ہزار کے آخر میں پیدا ہو کامیاب ہو سورہ العصر میں دنیا کی تاریخ موجود ہے جسپر خدا تعالےٰ نے اپنے الہام سے مجھکو اطلاع دی ہے۔ اور یہ اصلی اور سچی تاریخ ہے۔ جس سے پتہ لگتا ہے۔ کہ ہمارے نبی کریمؐ تک کسقدر زمانہ گذرا تھا۔ پس اس حساب سے اب ساتویں ہزار سے کچھ سال گذر چکے ہیں اور خاتم الخلفاء چھٹے ہزار کے آخر میں پیدا ہُوا۔ تاکہ اوّل را بہ آخر نسبتے دارد کا مصداق ہو۔ آدم بھی چھٹے دن پیدا ہُوا تھا اللہ تعالےٰ کے نزدیک ایکدن ایک ہزار سال کا ہوتا ہے اسطرح سے چھ دن کے چھ ہزار سال ہوئے۔ اور پھر آدم کی پیدائش چھٹے دن کے آخر میں ہوئی تھی۔ اِسلئے خاتم الخلفاء بھی چھٹے ہزار سال کے آخر میں پیدا ہُوا۔ اور ساتویں ہزار سال میں جنگ ہے اس جنگ سے توپ و تفنگ

کی لڑائی مراد نہیں۔ بلکہ یہ عیسائیت اور الٰہی دین کی آخری جنگ ہے عیسائیت نے زمینی خدا بنالیا ہے اور یہ وہی خدا یا خیالی خدا ہے جیسے بہت سی عورتیں ایک وہمی حمل رجا کا کر لیتی ہیں۔ یہانتک کہ پیٹ میں وہمی طور پر حرکت بھی معلوم ہوتی ہے اور پیٹ بڑھتا بھی جاتا ہے اسی طرح پر مسیح فرضی خدا بنالیا گیا ہے۔ جسے خدا سمجھا جاتا ہے۔ غرض سچے مسیح کے مقابل وہ جھوٹا خدا کھڑا ہے۔ اب یہ لڑائی اُن میں شروع ہے۔ اور خدا اسمیں اپنا چمکتا ہوا ہاتھ دکھائیگا۔ چالیس کروڑ سے زیادہ انسان عیسائی ہو چکے ہیں جب اوّل ہی اوّل یہ لوگ ہمارے ممالک میں آئے تو مولوی لوگ ان کے حملوں اور اعتراضوں سے محض ناواقف تھے۔ نہ اُنہیں ان کے اعتراضات کا پورا علم تھا اور نہ وہ قرآن کے حقائق ہی سے آگاہ تھے۔ اسکے خلاف عیسائی پادریوں کے پاس اقبال اور تالیف قلوب کے ذرائع موجود تھے۔ اسی لئے اُنکی ترقی ہوتی گئی۔ لیکن اب ان میں ایک بھی نہیں جو اسکے تنزل کو نہ دیکھ سکے۔ اب ان کا دور ختم ہونے والا ہے اور ہر ایک شخص ان کے فرضی جعلی خدا کی حقیقت کو سمجھ لے گا۔ اصل بات تو یہ ہے۔ کہ عیسائیوں کا تانا بانا آریہ اور سناتن دھرمیوں سے بھی بودا ہے۔ کیونکہ انہوں نے ساری بنیاد اپنے مذہب کی حیات مسیح پر رکھی ہوئی ہے۔ جس کے ٹوٹنے کے ساتھ ہی اُنکی ساری عمارت گر جاتی ہے یہ بات اس زمانہ میں کہ وہ زندہ آسمان پر چلا گیا ہے۔ کوئی مان نہیں سکتا خصوصاً جبکہ دلائل قطعیۃ الدلالت کے ساتھ یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے۔ کہ وہ طبعی موت مر گیا ہے اور پھر اس سے بڑھکر یہ کہ اب تو اُسکی لاش تک کو دکھا دینے کی نوبت پہنچ گئی۔ کیونکہ سرینگر کشمیر میں اُسکی قبر واقعات صحیحہ کی بنا پر ثابت ہو گئی۔ ان ساری باتوں کی موجودگی میں کون عقلمند قبول کر سکتا ہے کہ وہ ابھی تک زندہ آسمان پر موجود ہے اُسکی موت کے ساتھ ہی صلیبی موت کفارہ۔ لعنت وغیرہ ساری باتیں علوم یقینیہ کی طرح غلط ثابت ہو جائیں گی۔ ان کے علاوہ یہ مذہب ایسا کمزور ہے کہ جو پہلو اس نے اختیار کیا ہے وہی سخت بودا ہے۔ ایک لعنت کے ہی پہلو کو دیکھو۔ اگر وہ اس پہلو کو اختیار نہ کرتے تو بہتر ہوتا کیونکہ جب یہ بات یقینی ہے۔ کہ لعنت کا تعلق دل سے ہے جسکا مفہوم یہ ہے کہ ملعون خدا کا ..... دشمن بن جائے اور خدا کا اُس سے کوئی تعلق نہ رہے اور وہ خدا سے برگشتہ ہو جائے تو پھر باقی کیا رہ گیا۔ ایک کتاب میں لکھا ہے۔ کہ مسیح کو شیطان لئے پھرا۔ اگر جسمانی طور پر شیطان لئے پھرتا تو مسیح تماشا دیکھا سکتے تھے۔ اسکا کوئی معقول جواب تو نہیں دے سکے

کسی یہودی کو شیطان کہہ دیا۔ اور پھر لکھا ہے۔ کہ مسیح کو تین مرتبہ شیطانی الہام ہوا۔ غرض کہ اب عیسائی مذہب کے خاتمہ کا وقت آپہنچا ہے۔ پس تم اپنی ہمت اور سرگرمی میں سست نہ ہو بہت سے لوگ مسلمان کہلا کر دنیاوی امور میں منہمک ہو جاتے ہیں لیکن تم خدا سے ڈرو اور اپنے اندر سچی اور پاک تبدیلی پیدا کرو تقوے اور طہارت پیدا کرو۔ اس راہ میں سست ہونا شیطان کو نقب لگا کر متاع ایمان چھین کر لیجانے کا موقعہ دینا ہے۔ اس وقت وہی خدا جو آدم پر ظاہر ہوا تھا۔ اور دیگر انبیاء پر ظاہر ہوتا رہا ہے۔ وہی مجھ پر ظاہر ہوا ہے۔ اسوقت خدا نے تمہیں موقعہ دیا ہے۔ کہ اپنے معلومات کو بڑھا سکو۔ اسلئے جو بات تمہاری سمجھ میں نہ آئے اُسے فوراً دریافت کر لینا چاہیئے جو آدمی سمجھنے سے پہلے ہی کہہ دیتا ہے۔ کہ اُس نے سمجھ لیا ہے اُسکے دل پر ایک چھالا سا پڑ جاتا ہے۔ جو آخر میں ناسور ہو کر لہہ نکلتا ہے بس اِس بات سے ہرگز نہیں تھکنا خواہ کوئی شخص ایک سال تک مجھ سے پوچھتا رہے۔ پس اس موقعہ کی قدر کرو۔ میری باتوں کو سنو۔ سمجھو اور اُن پر عمل کرو۔ پھر خادم دین بنو۔ اور سچائی کو دنیا پر ظاہر کرو۔ خدا سے محبت کرنا اور مخلوق سے ہمدردی کرنا یہ دونوں باتیں دین کا اصل ہیں۔ ان پر عمل کرو۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۵)

سنہ ۱۹۰۱ء۔ حافظ معین الدین صاحب جو حضرت مسیح موعودؑ کی خدمت میں رہا کرتے تھے ایک دن اُنہوں نے بیان کیا۔ کہ ایک زمانہ میں جب کہ وہ آپ کی خدمت میں رہتے تھے اُنہیں کئی قسم کی ضروریات تنگ کرتیں۔ تو وہ حضرت صاحب سے شکایت کیا کرتے جس پر آپ فرمایا کرتے کہ حافظ جی! صبر کرو۔ استقامت رکھو۔ ایک زمانہ خدا کے وعدوں کے پورا ہونے کا آنے والا ہے اور وہ مبارک ایام اللہ آیا چاہتے ہیں کہ سب ضرورتیں انشاء اللہ گھر بیٹھے بٹھائے پوری ہو جائیں گی (الحکم جلد ۶ نمبر ۱۶)

سنہ ۱۹۰۱ء۔ ایک دن حضرت مسیح موعودؑ سیر کرنے کے لئے گاؤں سے باہر تشریف لے گئے واپسی پر آپ نے دیکھا۔ کہ بکریوں سے سارا میدان بھرا ہوا ہے۔ اور اس کثرت سے دودھ کے خریدار تھے۔ کہ ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے۔ اور یہاں تک اُنکو استغراق تھا کہ کسی کو حضرت صاحب کی تشریف آوری کی خبر نہ ہوئی حضرت صاحب کی ہمرائیوں اور خریداران دودھ کے جمگھٹے نے آپکے چلنے کا راستہ روک دیا۔ جس پر آپ نے دریافت فرمایا۔ کہ یہ کیا ہے؟ ہمراہی دوستوں نے عرض کی کہ حضرت بکریاں آئی ہوئی ہیں۔ اور ہمارے بھائی دودھ خرید

رہے ہیں جس پر آپ نے فرمایا۔ کہ ہاں خرید دو۔ اور ہمیں بھی خریداری میں ساتھ ملالو۔ کہ ہم بھی تمہارے ساتھ شریک ہو جائیں۔ اچھا دو پیسے کا دودھ ہمیں بھی لے دو۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۱۶)

۱۹۰۱ء۔ ایک دن حضرت مسیح موعودؑ نے فرمایا۔ کہ آپ نے کشف میں دیکھا۔ کہ قادیاں ایک بڑا عظیم الشان شہر بن گیا۔ اور انتہائی نظر سے بھی پرے تک بازار نکل گئے اونچی اونچی دو منزلی چو منزلی یا اس سے بھی زیادہ اونچے اونچے چوباروں والی دکانیں عمدہ عمارت کی بنی ہوئی ہیں اور موٹے موٹے سیٹھ بڑے بڑے پیٹ والے جن سے بازار کو رونق ہوتی ہے بیٹھے ہیں اور اُن کے آگے جواہرات . . . اور موتیوں اور ہیروں اور روپیوں اور اشرفیوں کے ڈھیر لگ رہے ہیں۔ اور مختلف قسم کی دکانیں خوبصورت اسباب سے جگمگا رہی ہیں یکے۔ بگیاں۔ ٹمٹم۔ فٹن۔ پالکیاں۔ گھوڑے۔ فیکرم۔ اور پیدل لوگ اس کثرت سے بازار میں آتے جاتے ہیں۔ کہ مونڈھے سے مونڈھا بھڑ کر چلتا ہے۔ اور راستہ بمشکل ملتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قادیاں ایک بڑا عجیب اور عظیم الشان شہر بن جائیگا۔ پھر فرمایا کہ جو لوگ بڑے لوگوں اور عزیزوں کی یادگاریں بناتے ہیں کیا خدا اپنے پیارے کی یادگار قائم نہ کریگا۔ ضرور کرے گا۔ اور فرمایا۔ کہ آجکل جو طاعون کا سخت زور شور ہو رہا ہے اور ساٹھ اور سو برس تک اس کا دورہ رہتا ہے۔ اور ایسا ہوتا ہے۔ کہ یا تو یہ مرض گناہ کو نگل جاتا ہے۔ یا گنہ گاروں کو کھا جاتا ہے۔ اور مرسلین و مامورین کے زمانوں میں تو یہ آتا ہی رہا ہے اور یہ لوگوں کی بداعمالیوں کا نتیجہ ہوتا ہے اور وہ لوگ جو مامورین پر جھوٹے طعن کرتے ہیں وہ اُلٹے طاعون میں گرفتار ہوتے ہیں۔ پس جب اسکا اسقدر لمبا دورہ رہا۔ تو لوگ امن کی جگہ تلاش کریں گے تو کیا عجب ہے کہ ہمارا کشف اسی طرح پورا ہو جائے کہ لوگ ہلاکت اور طاعون زدہ مقامات . . . . کو چھوڑ کر قادیاں میں آ بسیں (الحکم جلد ۶ نمبر ۱۶)

۱۹۰۲ء

جنوری ۱۹۰۲ء۔ سیر کو جاتے ہوئے حضرت مسیح موعودؑ نے ذیل کی تقریر فرمائی اللہ تعالےٰ چاہتا تو انسان کو ایک حالت میں رکھ سکتا تھا۔ لیکن بعض مصالح اور امور ایسے ہوتے ہیں کہ انسان پر بعض عجیب و غریب اوقات اور حالتیں وارد ہوتی رہتی ہیں۔ اُن میں سے ایک ہم و غم کی بھی حالت ہے۔ ان اختلاف حالات اور تغیر و تبدیل اوقات سے اللہ تعالےٰ

کی عجیب و غریب قدرتیں اور اسرار ظاہر ہوتے رہتے ہیں کسی نے کیا اچھا کہا ہے ؎ اگر دنیا بیک دستور ماند ۔ بسا اسرار ہا مستور ماند ۔ جن لوگوں کو دنیا میں ہم و غم نہیں پہنچا اور جو اس وجہ سے اپنے آپ کو بڑے ہی خوش قسمت اور خوشحال سمجھتے ہیں ۔ جیسا کہ مدارس میں سلسلہ تعلیم کے ساتھ یہ بھی لازمی رکھا گیا ہے کہ ایک خاص وقت تک تمام لڑکے ورزش بھی کیا کریں ۔ اس ورزش اور قواعد سے جو بچوں کو سکھائی جاتی ہے ۔ سررشتہ تعلیم کے افسروں کا یہ مدعا و منشا تو ہو نہیں سکتا ۔ کہ انہیں کسی لڑائی کیلئے تیار کیا جائے اور نہ یہ کہ انکا وقت ضائع کیا جائے ۔ بلکہ اس کا اصل مدعا و منشا یہ ہوتا ہے ۔ کہ وہ اعضاء جو حرکت کو چاہتے ہیں اگر انہیں بالکل بیکار چھوڑا جائے تو انکی تمام طاقتیں اور نشو و نما زائل اور ضائع ہو جاتا ہے ۔ جسے ورزش کے ذریعہ سے پورا کیا جاتا ہے ۔ ورزش کرنے سے گو بظاہر اعضاء کو تکلیف اور تکان ہوتی ہے لیکن آخر کار وہی انکی پرورش اور صحت کا موجب ثابت ہوتی ہے اسی طرح پر فطرت انسانی کچھ ایسی واقع ہوئی ہے ۔ کہ وہ تکلیف کو بھی چاہتی ہے ۔ تاکہ اسکے جملے قوی کی تکمیل ہو جائے ۔ اسی وجہ سے یہ اللہ تعالے کا فضل و احسان ہوتا ہے ۔ جبکہ وہ انسان کو بعض وقت ابتلا میں ڈال دیتا ہے ۔ جس کے ذریعہ سے انسان کی رضا بالقضاء اور صبر کی قوتیں بڑھتی ہیں جن لوگوں کو اللہ تعالے پر یقین نہیں ہوتا انکی یہ حالت ہوتی ہے ۔ کہ ذرا سی تکلیف پہنچنے پر وہ گھبرا جاتے ہیں ۔ اور خودکشی کرنے میں آرام دیکھتے ہیں ۔ لیکن انسانی روح کی تکمیل اور تربیت چاہتی ہے ۔ کہ اس پر مختلف قسم کے ابتلا آئیں تاکہ اسکا اللہ تعالے پر یقین بڑھے ۔ اللہ تعالی ہر ایک چیز پر قادر ہے ۔ تاہم جن لوگوں کو اپنی عمر میں کسی قسم کی تکلیف اور ابتلا کا سامنا نہیں پڑتا ۔ انکا یہ حال ہوتا ہے ۔ کہ وہ بالکل دنیا اور اس کی خواہشات میں منہمک ہوتے ہیں ۔ اور انکا سر کبھی اوپر کی طرف نہیں اٹھتا ۔ اور خدا تعالی کا کبھی بھول کر بھی انہیں خیال نہیں آتا ۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو انسانیت کی اعلی درجہ کی خوبیوں کو ضائع کر دیتے اور انکی بجائے ادنے سی باتیں حاصل کر لیتے ہیں ۔ کیونکہ مصائب کے اندر ایمان اور ایقان کی ترقی انکے لئے وہ راحت اور اطمینان کے سامان پیدا کرتی جو دنیا کے اموال و لذات میں کبھی بھی حاصل نہیں ہو سکتے ۔ لیکن افسوس ہے ۔ کہ دنیا دار لوگ بچوں

کی طرح آگ کے انگارہ پر خوش ہو جاتے ہیں۔ لیکن اُسکی سوزش اور نقصان رسانی سے آگاہ نہیں ہوتے۔ لیکن جو لوگ ابتلاؤں کی حالت میں استقامت سے کام لیتے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ اپنے خاص فضل سے ایمان اور یقین کی دولت سے مالا مال کر دیتا ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں۔ کہ اُن پر کوئی ابتلا نہیں آیا۔ وہ ایک وجہ سے بدقسمت ہیں۔ کیونکہ وہ ناز و نعمت کی زندگی بسر کر کے خدا سے غافل اور بہائم کی سی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اُنکی زبان ہوتی ہے لیکن اُس سے حق نہیں بول سکتے۔ اور اُنکی زبان پر خدا کی حمد و ثنا کبھی جاری نہیں ہوتی۔ وہ صرف فسق و فجور کی باتیں کرنے اور ذائقہ چکھنے کیلئے ہوتی ہے۔ اُنکی آنکھیں ہوتی ہیں لیکن نظارۂ قدرت دیکھنے کیلئے نہیں بلکہ بدکاری کیلئے۔ پھر ایسے لوگوں کو خوشی اور راحت کیسے میسر آسکتی ہے کسی شخص کو ہم و غم میں مبتلا دیکھ کر یہ مت سمجھو۔ کہ وہ بدقسمت ہے۔ نہیں بلکہ اگر وہ اس ہم و غم میں خدا کو نہ بھولے۔ تو وہ اس سے پیار کرتا ہے اور اسپر بڑی بڑی رحمتیں نازل کرتا ہے۔ اسکی مثال یوں سمجھو۔ کہ جس طرح پر کسی بیمار اعضاء پر مرہم لگانے سے پیشتر اُس کا چیرنا اور عمل جراحی کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح پر خدا کی برکات کے نزول سے پہلے اُس کی راہ میں ہم و غم آنا ضروری ہوتا ہے۔ غرض یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ شناخت کرنا چاہتا ہے۔ کہ دنیا کی اصل حقیقت کیا ہے۔ اور اسمیں ترقی کرنے کیلئے کسقدر بلیات اور آفات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ ابتلا کی حالت میں ہی دعاؤں کے عجیب و غریب خواص اور اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ اور سچی بات تو یہ ہے۔ کہ ہمارا خدا تو دعاؤں سے ہی پہچانا جاتا ہے۔ دنیا میں جسقدر مختلف مذاہب ہیں۔ اُن میں سے سوائے اسلام کے کسی ایک نے بھی ایسا خدا نہیں منوایا جو دعاؤں کو سنتا اور اُن کا جواب دیتا ہو۔ کیا ایک ہندو۔ پتھر درخت یا بیل کے سامنے کھڑا ہو کر کہہ سکتا ہے۔ کہ وہ اسکی دعاؤں کو سنتے اور جواب دے سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ کیا ایک عیسائی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اُسنے جس خدا یسوع کو مانا ہے وہ اُسکی دعاؤں کو سنتا اور اُن کا جواب دے سکتا ہے؟ ہرگز نہیں سننے اور بولنے والا خدا صرف ایک ہی ہے۔ جو اسلام کا خدا ہے اور جسے قرآن نے پیش کیا ہے جس نے خود فرمایا ادعونی استجب لکم یعنی تم مجھے پکارو میں تم کو جواب دونگا۔ اور یہ بالکل سچی بات ہے کہ اگر کوئی شخص جسے اللہ تعالےٰ پر کامل ایمان ہو۔ وہ ایک عرصہ تک سچی نیت اور صفائی قلب کے ساتھ مجاہدہ کرے اور دعاؤں میں لگا رہے۔ تو اُسکی دعاؤں کا جواب اسے ضرور دیا جائیگا

قرآن شریف میں ایک مقام پر ایسے لوگوں کے لئے جو گوسالہ پرستی کرتے اور اُسے خدا بناتے ہیں آیا ہے لا یرجع الیھم قولا۔ کہ وہ اُنکی بات کا کوئی جواب نہیں دیتا جس سے ثابت ہوا۔ کہ جو معبود بولتے نہیں ہیں وہ گوسالہ کے ہی مانند ہیں۔ ہم نے بارہا عیسائیوں سے دریافت کیا ہے۔ کہ اگر فی الحقیقت تمہارا معبود ایسا ہی ہے جو تمہاری دعاؤں کو سنتا اور اُن کے جواب دیتا ہے۔ تو بتاؤ کہ تم میں سے وہ کس شخص سے بولتا ہے؟ تم جو یسوع کو اپنا معبود ٹھہراتے ہو۔ اُسے بلا کر بھی تو دکھاؤ میں بڑے زور سے دعویٰ کرتا ہوں۔ کہ اگر ساری دنیا کے عیسائی مجتمع ہو کر یسوع کو پکاریں تو وہ کبھی جواب نہیں دے سکتا کیونکہ وہ تو انسان تھا جو مر گیا ہوا ہے۔ اسلئے عیسائی قوم کو ملزم کرنے کے لئے اس سوال سے بڑھکر اور کوئی ہتھیار نہیں۔ ہمیشہ اُن سے پہلا سوال یہی ہونا چاہیئے۔ کہ کیا اُنکا خدا ناطق ہے یا غیر ناطق؟ اگر وہ غیر ناطق ہے تو اُسکا گونگا ہونا ہی اُس کے ابطال پر دلیل ہے۔ لیکن اگر وہ ناطق ہے تو اُسے ہمارے مقابل پر بلا کر دکھاؤ۔ اور اُس سے وہ بولیاں بلواؤ جن سے ثابت ہو۔ کہ وہ انسان کی طاقت اور مقدرت سے بالاتر ہیں یعنی عظیم الشان پیشگوئیاں اور آئندہ کی خبریں۔ لیکن وہ پیشگوئیاں اس قسم کی نہ ہونی چاہئیں جیسی یسوع اپنی زندگی میں کرتا رہا۔ کہ مرغ بانگ دیگا۔ لڑائیاں ہونگی قحط پڑیں گے بلکہ ایسی پیشگوئیاں ہوں جنمیں قیافہ اور فراست کا کوئی دخل نہ پایا جائے اور وہ صریحاً انسانی طاقت اور فراست سے ۔ ۔ ۔ ۔ بالاتر معلوم ہوں۔ میں پھر دعوے سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ کوئی بھی عیسائی پادری جرأت نہیں رکھ سکتا کہ اللہ تعالےٰ کے مقابل پر ایک عاجز اور ضعیف انسان یسوع کی اقتداری پیشگوئیاں پیش کر سکے۔

غرض یہ مسلمانوں کی بڑی خوش قسمتی ہے کہ اُنکا خدا دعاؤں کا سُننے والا ہے۔ کبھی ایسا بھی اتفاق ہوتا ہے۔ کہ ایک طالب دعا نہایت رقت اور درد کے ساتھ دعائیں کرتا ہے۔ لیکن اُسکی دعاؤں کے نتائج میں تاخیر اور توقف واقع ہوتا ہے۔ تو اُسکی وجہ کیا ہوتی ہے؟ دعاؤں کی قبولیت کی تاخیر کے وقت یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ اول تو دنیا کے تمام کاروبار تدریجاً ہوتے ہیں۔ مثلاً دیکھو ایک انسان کے بچہ کو پورا جوان بننے کے لئے کسقدر مراحل اور منازل طے کرنے پڑتے ہیں۔ پھر ایک بیج سے درخت بننے کیلئے کسقدر توقف ہوتا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح پر اللہ تعالےٰ کے قدرتی امور کا نفاذ بھی تدریجاً ہوتا ہے۔ پھر اس توقف میں یہ مصلحت الٰہی بھی ہوتی ہے۔ کہ انسان اپنے عزم اور عقد ہمت میں پختہ ہو جائے۔ اور اُسے

معرفت الٰہی میں استحکام اور پورا پورا رسوخ حاصل ہو۔ کیونکہ قاعدہ کی بات ہے۔ کہ انسان جسقدر اعلےٰ مراتب اور مدارج کو حاصل کرنا چاہتا ہے اُسی قدر اُسے زیادہ اور سخت محنت اور وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ پس استقلال اور ہمت ایک ایسی عمدہ چیز ہے۔ کہ اگر یہ نہ ہو۔ تو انسان کامیابی کی منازل کو طے نہیں کرسکتا۔ اسلئے ضروری ہوتا ہے۔ کہ پہلے مشکلات میں ڈالا جائے اِنَّ مع العسر یسرًا۔ اسی لئے فرمایا ہے۔ دنیا کی کوئی کامیابی اور راحت ایسی نہیں ہے۔ کہ جس کے شروع میں کسی قسم کا رنج اور مشکل نہ ہو اور اُس سے فائدہ وہی اٹھاتے ہیں جو باہمت اور مستقل مزاج ہوں بے ہمت اور متلون مزاج راستہ میں ہی تھک کر رہجاتے ہیں پنجابی میں کسی نے کہا ہے ؎ ایہو ہیگی کمیا جے دن تھوڑے ہو۔ پس جب اللہ تعالےٰ پر سچا اور پکا ایمان ہو۔ کہ وہ ہماری دعاؤں کو سننے والا ہے۔ تو ایسا ایمان سخت سے سخت مشکلات میں بھی ایک لذت دیتا ہے اور ہموم وغموم میں ایک اعلیٰ درجہ کا سہارا ہوتا ہے۔ کیونکہ ایسی حالت میں اگر کوئی پناہ نہ ہو۔ تو انسان کا دل کمزور ہوجاتا ہے جس سے آخرکار وہ مایوس ہوکر ہلاکت کے قریب ہوجاتا ہے۔ اور خودکشی کرنے تک آمادہ ہوجاتا ہے۔ بلکہ یورپ کے ممالک میں تو خصوصاً کثرت سے ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو ذرا سی ناکامی اور نامردی پر بندوق مار کر اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا خودکشی کرنا ان کے ایمان کی کمزوری اور ان کے مذہب کا بودا پن ہے۔ اگر ان کے مذہب میں کوئی قوت اور طاقت ہوتی۔ تو وہ اپنے پیروؤں کو ایسی ناکامی اور نامردی سے نکالنے کے لئے کوئی تدبیر بتاتا۔ اسلئے وہ لوگ جنہیں اللہ تعالےٰ پر ایمان ہے اور اس قادر مطلق ہستی پر کامل یقین ہے کہ وہ انسان کی دعاؤں کو سُنتا اور اُنکا جواب دیتا ہے۔ ان کے مشکلات کے وقت دلوں میں ایک طاقت اور ہمت پیدا کرتا ہے۔ ایسی دعائیں حقیقت میں بہت قابلِ قدر ہوتی ہیں اور اللہ تعالےٰ سے دعائیں کرنیوالا آخرکار کامیاب ہوجاتا ہے۔ ہاں یہ نادانی اور سوءِ ادب ہے۔ کہ انسان اللہ تعالےٰ کے ارادہ کے ساتھ لڑنا چاہے۔ مثلاً یہ دعا کرے۔ کہ رات کے پہلے حصہ میں سورج نکل آئے یا اور اسی قسم کی دعائیں مانگتا ہے۔ کیونکہ اس قسم کی دعائیں کرنا اللہ تعالےٰ کی جناب میں گستاخی میں داخل ہیں۔ علاوہ ازیں دعاؤں میں عجلت پسند اور گھبراجانیوالا بھی نقصان اٹھاتا اور ناکام رہتا ہے۔

میں نے ارادہ کیا ہوا ہے۔ کہ ایک دفعہ اور دعا کے مضمون پر شرح وبسط سے ایک

رسالہ لکھا جائے کیونکہ مسلمان دعا کی حقیقت سے بالکل ناواقف ہیں۔ بلکہ بعض تو ایسے ہیں کہ جنہیں دعا کرنے کے مواقع میسر آئے۔ لیکن صبر و استقلال سے کام نہ لینے کے باعث نامراد رہ گئے۔ اور اپنی بدقسمتی سے فلسفۂ دعا سے ہی منکر ہو کر سید احمد خانی مذہب اختیار کر لیا۔ کہ دعا کوئی چیز ہی نہیں اور نہ اس کا کوئی فائدہ ہے۔ ان لوگوں کو دھوکا اور غلطی اسی لئے لگتی ہے۔ کہ وہ حقیقت دعا سے ناواقف محض ہوتے ہیں اور اس کے اثر سے بالکل بے خبر۔ اسلئے اپنی خیالی امیدوں پر پانی پھرتا دیکھکر اور انہیں پورا نہ ہوتے ہوئے دیکھ کر کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ کہ دعا کچھ چیز نہیں ہے۔ اور اس طرح اس سے برگشتہ ہو جاتے ہیں۔

یاد رکھو۔ کہ دعا ربوبیت اور عبودیت کا ایک کامل رشتہ ہے۔ اگر دعاؤں میں اثر نہ ہوتا تو پھر اس رشتہ کا ہونا اور نہ ہونا برابر ہے۔ اللہ تعالےٰ کی شناخت کی یہ زبردست دلیل اور اسکی ہستی پر بڑی بھاری شہادت ہے۔ کہ محو و اثبات اسکے قبضۂ اختیار میں ہے یمحو اللہ ما یشاء و یثبت۔ دیکھو اجرام سماوی کتنے بڑے اور عظیم الشان نظر آتے ہیں جنہیں دیکھکر بعض نادان انکی پرستش شروع کر دیتے ہیں۔ اور ان میں صفات الٰہی ماننے لگ پڑتے ہیں۔ جس طرح سے کہ ہندو۔ گبر و دیگر عناصر پرست اقوام جو سورج وغیرہ کو اپنا معبود سمجھ کر اسکی پرستش کرتے ہیں۔ کیا ایسے لوگ یہ دعوے سے کہہ سکتے ہیں۔ کہ سورج اپنے اختیار سے چڑھتا اور غروب ہوتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اگر بالفرض وہ ایسا دعوےٰ کر بھی دیں۔ تو ان کے پاس کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ وہ ذرا سورج کے سامنے دعا کریں۔ کہ ایک دن وہ ظاہر نہ ہو۔ یا دوپہر کے وقت ہی غروب ہو جاوے جس سے اسکی طاقت اور ارادہ کی حقیقت معلوم ہو سکتی ہے۔ سورج کا پابندی کے ساتھ ایک خاص وقت پر طلوع و غروب ہونا صاف ظاہر کرتا ہے۔ کہ یہ تمام امور اسکے اپنے قبضۂ اختیار سے باہر ہیں۔ کوئی وجود اپنے ارادہ کا مالک تب ہی معلوم ہو سکتا ہے۔ جب کہ وہ دعاؤں کو سنے اور جو امور اس کی طاقت میں ہوں انہیں کر کے بھی دکھاوے۔

غرض اگر اسلام میں قبولیت دعا نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ کی ہستی پر ہی بہت سے شکوک پیدا ہو سکتے تھے۔ اور ضرور ہوتے اور جو مذہب قبولیت دعا کے قائل نہیں ہیں ان کے پاس خدا کی ہستی کی بھی کوئی دلیل نہیں۔ میرا اپنا تو یہ مذہب ہے۔ کہ جو شخص

دعا اور اُس کی قبولیت پر ایمان نہیں لاتا وہ جہنمی ہے۔ اور وہ خدا کی ہستی سے ہی منکر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شناخت کا یہی طریق ہے۔ کہ انسان اُس وقت تک دعا میں لگا رہے جب تک کہ خدا اُسکے دل میں پورا پورا یقین نہ بھر دے اور انا الحق کی آواز اُسے نہ آجائے۔ گو اسمیں ذرا بھی شک نہیں۔ کہ اس مرحلہ کو طے کرنے اور اس مقام تک پہنچنے کے لئے بہت سی مشکلات اور تکالیف ہیں۔ لیکن ان سب کا علاج صبر ہے حافظ نے کیا اچھا کہا ہے ؎ گویند سنگ لعل شود در مقام صبر آری شود ولیک بخون جگر شود۔ یاد رکھو کوئی شخص اپنی دعا سے فیض حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ پورے صبر اور استقلال کے ساتھ دعاؤں میں نہ لگا رہے۔ اور اللہ تعالےٰ پر کبھی اور کسی صورت سے بدظنی اور بدگمانی نہ کرے بلکہ اُسے تمام قدرتوں اور ارادوں کا مالک تصور کرے پھر صبر کے ساتھ دعاؤں میں لگا رہے۔ تو وہ وقت آجائیگا کہ اللہ تعالیٰ اُسکی دعاؤں کو سن لیگا۔ اور اُسے جواب دے گا۔ جو لوگ اِس نسخہ کو استعمال کرتے ہیں وہ کبھی محروم اور بے نصیب نہیں رہتے بلکہ وہ یقیناً اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی قدرتیں اور طاقتیں بے شمار ہیں۔ اُس نے انسانی تکمیل کے لئے عرصہ تک صبر سے کام لینے کا قانون رکھا ہوا ہے۔ جسے وہ بدلا نہیں کرتا۔ اسلئے جو شخص یہ خواہش رکھتا ہے کہ اُسکے لئے خدا تعالےٰ اپنے مقررہ قانون کو تبدیل کر دے وہ اُسکی جناب میں بے ادبی اور گستاخی کرتا ہے۔ پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ بعض لوگ بہت بے صبری سے کام لیتے اور مداری کی طرح چاہتے ہیں۔ کہ فوراً اُن کے کہتے ہی کام ہو جایا کرے یہ کمزوری ایمان کی علامت ہے۔ بے صبری کرنے سے خدا تعالیٰ کا کچھ نہیں بگڑتا۔ بلکہ انسان اپنا ہی نقصان کر لیتا ہے۔ بعض لوگوں نے قصّے اور فسانے بنا رکھے ہیں کہ فلاں فقیر نے پھونک مار کر یہ بنا دیا اور وہ کر دیا۔ میں ایسی باتوں کو ہرگز نہیں مان سکتا۔ اور یہ محض من گھڑت بنائی ہوئی باتیں ہیں۔ کیونکہ یہ خدا تعالیٰ کی سنّت کے خلاف اور قرآن شریف کی تعلیم کے بالکل مخالف ہیں۔ اور ایسا کبھی نہیں ہو سکتا اسلام کے ہر ایک امر کے لئے قرآن شریف کا معیار موجود ہے۔ دیکھو حضرت یعقوبؑ کا پیارا بیٹا یوسفؑ جب بھائیوں کی شرارت سے اُن سے علیحدہ ہو گیا تو چالیس ہی

برس تک آپ اُسکے لئے دعائیں کرتے رہے۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ وہ دعائیں حضرت یوسفؑ کی ملاقات کا باعث ہوگئیں لیکن اگر وہ جلد باز ہوتے۔ تو خاک نتیجہ برآمد نہ ہوتا اتنا لمبا عرصہ دعائیں کرتے رہنے پر بعض ملامت کرنیوالوں نے اعتراض بھی کیا کہ تو یوسفؑ کو بے فائدہ یاد کرتا ہے لیکن حضرت یعقوبؑ نے یہی جواب دیا۔ کہ میں خدا سے وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اور گو حضرت یعقوبؑ کو بھی ظاہراً کچھ خبر نہ تھی۔ لیکن خدا پر ایسا یقین تھا۔ کہ فرمایا انی لاجد ریح یوسفؑ۔ پہلے تو یہی معلوم تھا کہ دعاؤں کا سلسلہ لمبا ہوگیا ہے۔ اسلئے اگر خدا نے دعاؤں میں محروم کرنا ہوتا تو وہ جلد یہی جواب دے دیتا۔ لیکن اس سلسلہ کا لمبا ہونا ہی قبولیت کی دلیل تھا کیونکہ کریم اپنے سائل کو دیر تک بٹھا کر کبھی محروم نہیں رکھتا۔ بلکہ بخیل سے بخیل شخص بھی ایسا نہیں کرتا۔ اور اگر ایک بخیل بھی سائل کو دروازہ پر دیر تک انتظار میں بٹھائے تو آخر اُسے کچھ نہ کچھ دے ہی دیتا ہے۔ حضرت یعقوبؑ کی دعاؤں کے زمانہ کی درازی پر خود قرآن شریف کے الفاظ وابیضت عیناہ دلالت کر رہے ہیں۔ حاصل مطلب یہ کہ دعاؤں کے سلسلہ کے دراز ہونے سے کبھی گھبرانا اور بے صبر نہ ہونا چاہیئے۔ اللہ تعالےٰ ہر ایک نبی کی تکمیل بھی جُدا جُدا پیرایوں میں کرتا ہے۔ حضرت یعقوبؑ کی تکمیل اُسنے اِسی غم میں رکھی تھی۔ الغرض دعاؤں کا یہی اصول ہے۔ اور جو شخص قرآن سے واقف نہیں وہ نہائت خطرناک حالت میں پڑ جاتا ہے۔ لیکن جو شخص اس اصول کو بخوبی سمجھ لیتا ہے۔ اُسکا انجام نہائت مبارک ہوتا ہے۔ جو لوگ دنیا میں حیوانوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں جب اللہ تعالےٰ اُن سے گرفت کرتا ہے۔ تو اُن کی جان ہی لے لیتا ہے لیکن مومن کے ساتھ وہ ایسا سلوک نہیں کرتا۔ اُسکی تکالیف کا انجام نہائت اچھا ہوتا ہے۔ اور انجام کار متقی کے لئے ہی ہے جیسے فرمایا۔ والعاقبۃ عند ربک للمتقین۔ مومن کو جو تکالیف اور مصائب آتی ہیں وہ اُسکی ترقیوں کا ذریعہ بنتی ہیں اور اُن کا نتیجہ بڑھانے کیلئے ایسے واقعات انہیں پیش آتے ہیں اور آخر کار اللہ تعالیٰ اُن کے تکالیف کے ایام کو راحت سے بدل دیتا ہے۔ قاعدہ کی بات ہے کہ جس شخص کی خوش قسمتی کے دن آتے ہیں۔ تو اُسپر سے بہائمی زندگی کے سب اثرات دور ہو جاتے اور اُن پر ایک موت وارد ہو جاتی ہے۔ اسلئے خدا شناسی کے بعد بہائمی سیرت کے

لذت و ذوق اس میں نہیں رہتے۔ بلکہ اُن سے اُسے نفرت و کراہت پیدا ہو جاتی ہے اور پھر نیکیوں کی طرف توجہ کرنا اُس کی معمولی عادت میں داخل ہو جاتا ہے پہلے جو نیکیوں کے کرنے سے اُس کی طبیعت پر ایک قسم کی گرانی محسوس ہوتی تھی وہ نہیں رہتی۔ بلکہ عادتاً نیکی کرنے کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔ اس لئے خوب یاد رکھو۔ کہ جب تک نفسانی جوشوں کے ساتھ ملی ہوئی مرادیں ہوتی ہیں اُس وقت تک خدا تعالےٰ اُنہیں مصلحتاً جُدا رکھتا ہے اور جب وہ انسان کی طرف رجوع کرتا ہے۔ تو پھر وہ نفسانی حالت قائم نہیں رہتی۔ اِس بات کو کبھی مت بھولو۔ کہ دنیا روزے چند آخر کار باخداوند۔ اتنا ہی کام انسان کا نہیں۔ کہ کھا پی لیا اور حیوانوں کی طرح زندگی بسر کر لی۔ نہیں۔ بلکہ انسان اس دنیا میں بڑی بھاری ذمہ واریاں لے کر آیا ہے۔ اس لئے اُسے آخرت کی فکر کرنی چاہیئے۔ اور اُسی کے لئے پوری پوری تیار کرنی ضروری ہے۔ پھر اس تیاری میں جو تکالیف آئیں اُنہیں رنج اور تکلیف کے رنگ میں نہ سمجھو بلکہ یہ تکالیف اللہ تعالےٰ ایسے لوگوں پر بھیجا کرتا ہے۔ جنہیں دونوں بہشتوں کا مزہ چکھانا چاہتا ہے۔ ولمن خاف مقام ربہ جنتان۔ مصائب اس لئے آتے ہیں کہ وہ اُن عارضی امور کو جو تکلف کے رنگ میں ہوتے ہیں نکال دیں۔ مولوی رومیؒ نے کیا اچھا کہا ہے ؎ عشق اوّل سرکش و خونی بود۔ تا گریزد ہر کہ بیرونی بود۔ سید عبدالقادر جیلانیؒ بھی ایک مقام پر لکھتے ہیں۔ کہ جب ایک مومن مومن بننا چاہتا ہے تو ضرور ہے کہ اُس پر دُکھ اور ابتلا آئیں اور وہ یہاں تک آتے ہیں۔ کہ مومن اپنے آپ کو موت کے قریب سمجھتا ہے۔ اور جب ایسی حالت کو پہنچتا ہے۔ تو رحمت الٰہیہ جوش میں آتی ہے۔ اور اُس وقت قلنا یا نار کونی بردا و سلما کا حکم ہوتا ہے اصل اور آخری بات یہی ہے مگر نہ شنیدہ کہ خداداری چہ غم داری (الحکم جلد ۶ نمبر ۴۵-۴۶)

۱۵ جنوری ۱۹۰۲ء شب = احباب سے طاعون کی خبریں سُن کر حضرت مسیح موعودؑ نے فرمایا:۔ یہ خدا کی طرف سے کس قدر تنبیہ ہے۔ اگر اب بھی دل بیدار نہ ہوں اور اب بھی خدا سے صلح کا عہد باندھنے کیلئے مستعد نہ ہوں۔ تو کیسی بدقسمتی ہے افسوس ہے کہ لوگ اب بھی خدا تعالےٰ کی طرف توجہ نہیں کرتے اور فسق و فجور اور شوخیوں سے باز نہیں آتے۔ اگر کسی شخص کے عزیزوں اور اولاد پر آفت آجائے تو ساری

کی ساری باتیں رہ جائیں۔ پھر کس شیخی اور بھروسہ پر انسان خدا سے اس قدر سرکشی کرتا ہے؟ وہ خدا کی حکومت سے کہیں بھاگ کر نہیں جا سکتا۔ جب یہ حال ہے۔ تو سب سے بہتر اور محفوظ طریق عذاب الٰہی سے بچنے کا تو خود اُسی کی پناہ میں آنا ہے۔ وہ احمق ہے۔ جو خدا کی حدود کو توڑ کر نکلتا ہے اس لئے کہ امان پائے۔ وہ فی الحقیقت مصیبت کو بلاتا ہے اور عذاب کو جذب کرتا ہے۔ اب وقت ہے کہ مسلمان اپنے ایمان اور توبہ کی تجدید کریں۔ یہ وقت آیا ہے۔ کہ خدا اپنا وجود دکھانا چاہتا ہے۔ اور اپنی ہستی کو منوانا چاہتا ہے۔

آخر جنوری ۱۹۰۲ء۔ حافظ غلام مرتضےٰ خان صاحب ساکن ٹانک جو حضرت مولوی نور الدین صاحب سے طب اور حضرت مسیح موعودؑ سے بیعت و استفادہ روحانی حاصل کرنے کے لئے قادیان آئے ہوئے تھے بعارضہ بخار وفات پا گئے حضرت مسیح موعودؑ نے خود نمازِ جنازہ پڑھائی۔ حافظ صاحب پہلے تونسہ والوں سے تعلق بیعت رکھتے تھے (الحکم جلد ۶ نمبر ۴)

۱۲ فروری ۱۹۰۲ء۔ حضرت مسیح موعودؑ نے ارشاد فرمایا۔ کہ اخبار الحکم کے ذریعہ سے اپنے تمام دوستوں کو اطلاع دے دی جائے کہ چونکہ طاعون پنجاب کے اکثر حصوں میں زور کے ساتھ پھیل گیا ہے۔ اور پھیلتا جا رہا ہے ایسی صورت میں یہ امر قرینِ مصلحت نہیں کہ قادیان میں مجمع ہو جس میں دور دراز علاقوں کے لوگ بھی شامل ہوں۔ اس لئے عید الاضحیٰ پر جو تجویز امتحان کی قرار پائی تھی۔ وہ کسی دوسرے وقت کیلئے ملتوی کی جاتی ہے وہ لوگ جن کے شہروں اور دیہات میں طاعون شدت کے ساتھ پھیل گیا ہے اپنے شہروں سے دوسری جگہ نہ جائیں۔ اپنے مکانوں کی صفائی رکھیں۔ اور انہیں گرم رکھیں اور تمام قسم کی ضروری تدابیر حفظ ماتقدم کی عمل میں لائیں اور سب سے بڑھکر یہ کہ سچی توبہ کریں اور پاک تبدیلی کر کے خدا تعالےٰ سے صلح کریں راتوں کو اٹھ اٹھ کر نمازِ تہجد میں دعائیں مانگیں۔ ہر ایک قسم کے فسق و فجور خیانت اور غلط کاری کی راہ سے اپنے آپ کو بچائیں اپنی حالت کی سچی تبدیلی ہی ..... خدا کے اس عذاب سے بچا سکیگی۔ ولنعم ما قیل ؎

خونِ تاباں سیہ گشت است از بدکاریٔ مردم۔ زیں طاعون ہمیں آرد پئے تخویف و انذارے
یہ تشویش قیامت ماندایں تشویش گر بینی۔ علاجِ نیست بہر دفعِ آں جز حُسن کردارے

(الحکم جلد ۶ نمبر ۶)

وسط فروری ۱۹۰۲ء قضا اور دعا کے بارہ میں حضرت مسیح موعودؑ نے ذیل کی تقریر فرمائی:۔ قدر اور جبر پر بڑی بڑی بحثیں ہوئی ہیں۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ لوگ اس پر کیوں اتنی بحثیں کرتے ہیں۔ میرا مذہب یہ ہے۔ کہ قرونِ ثلاثہ کے بعد ہی ایسی نکمی باتوں پر بحثوں کی بنیاد پڑی ہے۔ ورنہ انسانیت کا تقاضا یہ تھا۔ کہ ایسے امور کی طرف توجہ ہی نہ کی جاتی۔ جب قوم میں سے روحانیت کم ہوگئی۔ تو اس قسم کی بحثوں کا بھی آغاز ہوگیا۔ جس شخص کا یہ ایمان نہ ہو۔ کہ انما امرہ اذا اراد شیئاً ان یقول لہ کن فیکون۔ میں سچ کہتا ہوں۔ کہ اُس نے خدا تعالیٰ پہنچانا ہی نہیں۔ اور ایسا ہی اُس شخص نے بھی خدا تعالےٰ کو شناخت نہیں کیا جو اُس کو علیم بذات الصدور و حیّ وقیّوم۔ اور کہ دوسری جملہ اشیاء کی حیات و قیام اُسی سے ہے اور کہ وہ مدبّر بالارادہ ہے اور مدبر بالطبع ہے۔ نہیں مانتا۔ اللہ تعالےٰ پر ایمان لانے وقت یہ بات قریب پہنچ جاتی ہے اگر یہ مانا جائے۔ کہ کوئی حرکت یا سکون یا ظلمت یا نور بدون خدا کے ارادہ کے ہو جاتا ہے۔ اِس پر سب سے اوّل ثبوت قانون قدرت ہے۔ انسان کو اللہ تعالےٰ نے دو آنکھیں دو کان اور ایک ناک دئے ہیں۔ اور اتنے ہی اعضا لیکر بچہ پیدا ہوتا ہے۔ پھر اسی طرح انسان اور ہر ایک چیز کی عمر ہے۔ اور پھر دیگر قویٰ جو سب کے سب ایک دائرہ کے اندر محدود ہیں۔ پھر بعض لوگوں کی اولاد نہیں ہوتی۔ بعض لوگوں کے ہاں صرف لڑکے ہی ہوتے ہیں اور بعضوں کے ہاں صرف لڑکیاں ہی۔ یہ جملہ امور خدا تعالےٰ کا قادر ہونا ثابت کرتے ہیں۔ پس ہمارا مذہب تو یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کی الوہیت اور ربوبیت دنیا کے ذرہ ذرہ پر محیط ہے اگرچہ احادیث میں آیا ہے کہ بدی شیطان یا نفس کی طرف سے ہوتی ہے لیکن ہم کہتے ہیں کہ وہ بدی جسے بدی سمجھا جائے لیکن بعض بدیاں ایسی ہیں کہ جن کے اسرار اور احکام و مفہوم سے ہم آگاہ نہیں ہو سکتے۔ مثلاً آدمؑ کا دانہ کھانا وغیرہ ہزارہا اسرار ہیں جو مستحدثات کا رنگ دکھانے کیلئے کر رکھے ہیں۔ قرآن شریف میں فرمایا ہے۔ ماکان لنفس ان تموت الا باذن اللہ۔ موت میں روحانی اور جسمانی اموات ہر دو رکھی ہیں۔ اسی طرح سے ہدایت اور ضلالت بھی خدا تعالےٰ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اس پر اعتراض ہو سکتا ہے۔ کہ اگر یہ بات ہے۔ تو انبیاء کا سلسلہ لغو ہو جاتا ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ کوئی ایسی فہرست پیش نہیں کی جا سکتی جس میں یہ لکھا ہو۔ کہ فلاں شخص شقی ہے۔ انبیاءؑ جب لوگوں کو دعوت دیتے ہیں تو اسکے

ساتھ بھی کوئی نہ کوئی اثر مترتب ہوتا ہے۔ ایسا ہی دعا مانگنے پر بھی اثر مترتب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قضاء و قدر کو دعا سے بدل دیتا ہے اور قبل از وقت اس تبدیلی کی اطلاع بھی دیدیتا ہے۔ ہماری طرف ہی دیکھو کہ جو رجوع لوگوں کا اس زمانہ میں ہمارے سلسلہ کی طرف ہے۔ براہین احمدیہ کے زمانہ میں کب تھا اُسوقت تو ہمیں کوئی جانتا بھی نہیں تھا میں نے عیسائی مذہب کی بہت سی کتابیں پڑھی ہیں لیکن اللہ تعالےٰ بہتر جانتا ہے کہ کبھی طرفۃ العین کیلئے بھی میرے دل میں عیسائی مذہب کی سچائی کا خیال نہیں گذرا۔ یہ لوگ قرآن شریف کی اس تعلیم پر کہ خدا تعالےٰ کے ہاتھ میں ضلالت اور ہدایت ہے۔ اعتراض کرتے ہیں۔ لیکن اپنی کتابوں کو نہیں پڑھتے جن میں لکھا ہے۔ کہ شریر لوگ جہنم کیلئے بنائے گئے ہیں۔ یا مثلاً بعض جگہ یہ لکھا ہے۔ کہ خدا نے فرعون کا دل سخت ہونے دیا اگر محض لفظوں پر ہی اعتراض کرنا ہے۔ تو عیسائی صاحبان ہمیں ان الفاظ کا جواب دیں ؎ ایک بد دیانت انسان سے تو ایک مُردار کُتے کی نسبت بھی زیادہ بدبو آتی ہے۔ پھر یہ لوگ کس طرح اسلام پر اعتراضات کرتے وقت دیانت اور امانت کو چھوڑ دیتے ہیں۔ میں دعوے سے کہتا ہوں۔ کہ پادری صاحبان کا کوئی بھی ایسا اعتراض اسلام پر نہیں۔ جو اُنکی موجودہ تورات و انا جیل کے ایک ایک ورق پر نہ ہوتا ہو یہی حال رگویدادر پارسیوں و ہندوں کی دیگر کُتب کا ہے۔ قرآن شریف نے اُن امور کو جن سے احمق معترضین نے جبر کی تعلیم نکالی ہے محض اس عظیم الشان اصول کو قائم کرنے کیلئے بیان کیا ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ صرف ایک ہے۔ اور دنیا کی ہر ایک چیز کا مبدء اور مرجع صرف اُسی کی ذاتِ واحد ہے۔ وہی علت العلل اور مسبب الاسباب ہے اور صرف محض توحید کی تعلیم دینے کی خاطر ہی قرآن شریف نے درمیانی وسائط کو اُٹھا کر خدا کے علت العلل ہونیکا ذکر فرمایا ہے۔ ورنہ اگر غور سے قرآن شریف کا مطالعہ کیا جائے تو بڑی صراحت کے ساتھ اُن اسباب کو بھی بیان فرما دیا ہے۔ جنکی وجہ سے انسان مکلّف ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں جبکہ قرآن شریف اعمال بد کی سزا مقرر کرتا ہے۔ اور اُن کی حدود قائم کرتا ہے۔ تو اگر قضاء و قدر میں کوئی تبدیلی ہونے والی نہ تھی اور انسان مطلقاً مجبور تھا۔ تو پھر ان حدود اور شرائع کے مقرر کرنیکی ضرورت ہی کیا تھی پس خوب یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ قرآن شریف دہریوں کی طرح تمام امور کو اسباب

طبیعیہ تک محدود نہیں رکھنا چاہتا۔ بلکہ خالص توحید تک پہنچانا چاہتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ لوگوں نے دعا کی حقیقت کو نہیں سمجھا اور نہ ہی قضا و قدر کے اُن تعلقات کو جو دعا کے ساتھ وابستہ ہیں۔ تدبر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ جو لوگ دعاؤں سے کام لیتے ہیں اللہ تعالےٰ اُن کیلئے تمام راستے کھول دیتا ہے۔ وہ اُنکی دُعا کو رد نہیں کرتا۔ ایک طرف دعا ہوتی ہے۔ تو دوسری طرف قضا و قدر۔ اللہ تعالےٰ نے اُنمیں سے ہر ایک کے لئے اوقات اور حدود مقرر کر رکھے ہیں اور ربوبیت کے حیثہ کو عبودیت میں پایا گیا ہے اور فرمایا ہے۔ ادعونی استجب لکم۔ مجھے پکارو میں جواب دونگا۔ اسی لئے ہی میں کہا کرتا ہوں۔ کہ ناطق خدا صرف مسلمان کا ہی ہے۔ لیکن ہندو اور عیسائیوں کا وہ خدا جس نے کوئی ذرہ پیدا نہیں کیا۔ اور جو خود یہود یوں کے ہاتھ سے خود ہی طمانچے کھاتے کھاتے سولی پر چڑھا کر مار ڈالا گیا وہ کیا جواب دے سکتا ہے ؎ تو کار زمین را نکو ساختی کہ با آسمان نیز پرداختی۔ جبر اور قدر کے مسئلہ کو اپنی خیالی اور فرضی منطق کے معیار پر پرکھنا دانشمندی میں داخل نہیں ہے۔ اور انسان ضعیف البیان کا اس سیر کے اندر داخل ہونیکی کوشش کرنا بیہودہ امر ہے۔ الوہیت اور ربوبیت کا کچھ تو لحاظ اور ادب رکھنا چاہیئے۔ اور یہ راہ ادب کے سراسر خلاف ہے۔ کہ انسان الوہیت کے اسرار کو سمجھنے اور اُن پر حاوی ہونیکی کوشش کرے الطریقۃ کلہا ادب۔ قضا و قدر کا دعا کے ساتھ بہت بڑا تعلق ہے۔ دعا کیساتھ معلق تقدیر ٹل جایا کرتی ہے جب انسان ..... مشکلات میں گھر جائے تو اُسکی دُعا ضرور اثر کرتی ہے جو لوگ دعا کے اثر سے منکر ہیں اُنہیں ایک دھوکا لگا ہوا ہے۔ قرآن شریف نے دعا کے دو پہلو بیان کئے ہیں۔ ایک پہلو میں اللہ تعالےٰ اپنی منوانی چاہتا ہے اور دوسرے پہلو میں بندے کی مان لیتا ہے۔ ولنبلونکم بشیئ من الخوف الخ میں تو اپنا حق رکھکر انسان سے منوانا چاہتا ہے۔ اور اس آیت میں جو نون ثقیلہ کے ذریعہ سے اظہار تاکید کیا ہے۔ اس سے اُس کا یہ منشا ہے۔ کہ جب قضائے مبرم کو ظاہر کرینگے تو اُس کا علاج انا للہ و انا الیہ راجعون ہی ہے۔ دوسرا وقت خدا تعالےٰ کے فضل و کرم کی امواج کے جوش کا ہے جسے ادعونی استجب لکم میں ظاہر فرمایا ہے۔ پس مومن کو ہر دو مقامات کا پورا پورا علم ہونا چاہیئے۔ صوفیاء کا قول ہے۔ کہ فقر کامل نہیں ہوتا جب تک کہ محل اور موقع کی شناخت

حاصل نہ ہو۔ بلکہ اُن کا یہاں تک خیال ہے۔ کہ صوفی دعا نہیں کرتا جب تک کہ وقت کو شناخت نہ کرے۔ سید عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں کہ دعا کے ساتھ شفی سعید کیا جاتا ہے بلکہ اُن کا تو یہاں تک قول ہے۔ کہ شدید الاختفا امور مشبہ بالمبرم بھی دعا کے ذریعہ سے دور کر دئے جاتے ہیں۔ الغرض دعا کی اس تقسیم کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ کبھی اللہ تعالےٰ اپنی بات منوانا چاہتا ہے اور کبھی بندے کی مان لیتا ہے۔ گویا یہ معاملہ دوستانہ ہے۔ ہمارے نبی کریم کو جتنی قبولیت دعاؤں کی بخشی گئی تھی۔ اُسی کے مقابل آپؐ رضا و تسلیم کے بھی اعلےٰ مقام پر تھے۔ چنانچہ آپؐ کے گیارہ بچے وفات گئے لیکن آپ نے کبھی اللہ تعالےٰ سے سوال نہ کیا۔ کہ کیوں؟ بعض لوگ فقرا اور اہل اللہ کے پاس محض آزمائش اور امتحان کے لئے آتے ہیں۔ اور چونکہ وہ دعا کی حقیقت سے بالکل ناآشنا ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ اُن سے فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔ لیکن عقلمند انسان جو دعا کی حقیقت سے واقف ہوتا ہے وہ ضرور فائدہ حاصل کر لیتا ہے سچی بات تو یہ ہے کہ اگر دعا نہ ہوتی۔ تو اہل اللہ تو مر ہی جاتے۔ جو لوگ دعاؤں کے فوائد سے محروم ہیں اُنہیں یہی دھوکا لگا ہوا ہے۔ کہ وہ دعا کی اس تقسیم سے بالکل ناواقف ہیں۔ جب میرا سب سے پہلا لڑکا فوت ہوا۔ تو اُسے سخت غشی کی حالت تھی۔ جب اُس کی والدہ نے ایسی نازک حالت دیکھی۔ تو کہا کہ امید نہیں کہ یہ جانبر ہو سکے۔ میں کیوں اپنی نماز ضائع کروں چنانچہ وہ نماز میں مصروف ہو گئیں۔ اور جب بعد فراغت مجھ سے دریافت کیا۔ تو چونکہ لڑکا انتقال کر چکا تھا میں نے کہا۔ کہ وہ وفات پا گیا ہے۔ اس پر انہوں نے پورے صبر اور رضا کے ساتھ انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھا۔ اللہ تعالےٰ جس امر میں مومن کو نامراد کرتا ہے۔ اس نامرادی پر صبر کرنیوالوں کو ضائع نہیں کرتا۔ اور میں سمجھتا ہوں۔ کہ اسی صبر کا نتیجہ تھا۔ کہ خدا نے ایک کی بجائے چار بیٹے عطا فرمائے۔ الغرض دعا بڑی دولت ہے۔ انسان کو چاہیئے۔ کہ بے صبر ہو کر دعا نہ کرے۔ بلکہ صبر اور استقامت کیساتھ دعاؤں میں لگا رہے یہاں تک کہ قبولیت دعا کا وقت آجائے۔

قرآن شریف کو سورۃ فاتحہ سے شروع کر کے غیر المغضوب علیہم ولا الضالین پر ختم کیا ہے۔ لیکن جب ہم مسلمانوں کے معتقدات پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو دجال کا فتنہ اسلام میں سب سے عظیم الشان فتنہ نظر آتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ ایسے عظیم الشان فتنہ کا ذکر

کرنا اللہ تعالےٰ قرآن شریف میں بھول گیا ہو۔ نہیں۔ بلکہ اصل بات یہ ہے۔ کہ دجال کا مفہوم سمجھنے میں لوگوں کو دھوکا لگا ہے سورہ فاتحہ میں جن دو فتنوں سے بچنے کے لئے دعا سکھائی گئی ہے۔ اوّل اُن میں سے غیر المغضوب علیہم والا فتنہ ہے۔ جس سے بالاتفاق مراد یہود ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ امت محمدیہ پر بھی ایک وقت ایسا آنیوالا ہے۔ جبکہ وہ یہود سے مماثلت پیدا کریگی اس لئے اُس سے بچنے کیلئے یہ دعا سکھائی گئی وہ زمانہ جسمیں امت محمدیہ یہود سے مشابہت پیدا کرلے گی۔ ظہور مسیح موعود کا زمانہ ہوگا یعنی جس طرح پہلے یہود قوم کو ایک مسیح دیا گیا تھا۔ اسی طرح یہودیوں کی مثیل قوم کو بھی ایک مسیح دیا جائے گا۔ اور جس طرح سے پہلے مسیح پر یہودیوں نے کفر کا فتویٰ لگا کر اُسے طرح طرح کی تکالیف دی تھیں۔ اسی طرح مثیل یہود قوم بھی مثیل مسیح پر کفر کا فتوے لگا کر اُسکے انکار پر زور دے گی۔ گویا کہ غیر المغضوب علیہم کی دعا میں یہ سکھایا گیا کہ یہودیوں کی طرح مسیح موعود کی توہین اور تکفیر سے ہمیں بچا۔ دوسرا عظیم الشان فتنہ جس کا ذکر سورۂ فاتحہ میں کیا گیا ہے اور جس پر اس سورۃ کو ختم کیا گیا ہے وہ نصاریٰ کا فتنہ ہے جسے ولا الضالین میں بیان فرمایا۔ اسی طرح جب ہم قرآن شریف کے آخر پر نظر ڈالتے ہیں تو وہاں بھی ہمیں ان ہر دو فتنوں کے متعلق کھلی کھلی شہادت ملتی ہے مثلاً غیر المغضوب کے مقابل پر سورہ تبت یدا ہے۔ مجھ پر بھی فتویٰ تکفیر لگنے سے پہلے یہ الہام ہوا تھا۔ اذ یمکر بک الذی کفروا او قد لی یا ھامان لعلی اطلع علی الٰہ موسیٰ۔ وانی لاظنہ من الکاذبین۔ تبت یدا ابی لہب وتب۔ ما کان لہ ان یدخل فیھا الا خائفاً وما اصابک فمن اللہ۔ یعنی وہ زمانہ یاد کر کہ جب مکفر تجھ پر کفر کا فتویٰ لگائیگا۔ اور اپنے کسی حامی کو جس کا لوگوں پر اثر پڑ سکتا ہو۔ کہے گا کہ میرے لئے اس فتنہ کی آگ بھڑکا تا میں دیکھ لوں۔ کہ یہ شخص جو موسےٰ کی طرح کلیم اللہ ہونے کا مدعی ہے خدا اس کا معاون ہے یا نہیں۔ اور میں تو اُسے جھوٹا خیال کرتا ہوں۔ ابی لہب کے دونوں ہاتھ ہلاک ہوگئے۔ اور آپ بھی ہلاک ہوگیا۔ کہ اسمیں دخل دینا مگر ڈر کر۔ اور جو رنج تجھے پہنچے گا وہ خدا کی طرف سے ہے غرض سورہ تبت میں غیر المغضوب علیہم کے فتنہ کی طرف اشارہ ہے۔ اور ولا الضالین کے مقابل قرآن شریف کے آخر میں سورۂ اخلاص ہے۔ اور اُس کے بعد کی ہر دو سورتیں۔ سورۃ الفلق اور الناس ان ہر دو کی تفاسیر ہیں جنمیں اس تیرہ وتار

زمانہ سے پناہ مانگی گئی ہے جبکہ مسیح موعود پر کفر کا فتوے لگا کر مغضوب علیہم کا فتنہ پیدا ہوگا اور عیسائیت کی ضلالت اور ظلمت دنیا پر محیط ہونے لگے گی۔ پس جس طرح سورۃ فاتحہ میں جو قرآن کی ابتدا ہے ان دونو بلاؤں سے محفوظ رہنے کی دعا سکھائی گئی ہے۔ اسی طرح پر قرآن شریف کے آخر میں بھی ان فتنوں سے محفوظ رہنے کی دعا تعلیم کی۔ تاکہ یہ بات ثابت ہو جائے کہ اوّل آخر نسبتے دارد۔ سورہ فاتحہ میں جو ان فتنوں کا ذکر ہے وہ میں کئی مرتبہ بیان کر چکا ہوں۔ مگر قرآن مجید کے آخر میں جو ان فتنوں کا ذکر ہے۔ اسکا ذکر بھی مختصر طور پر سمجھ لو۔ الضالین کے مقابل پر آخر کی تین سورتیں ہیں جن میں سے اصل تو سورۃ قل ھو اللہ ہے اور باقی ہر دو سورتیں اُسکی شرح ہیں۔ قل ھو اللہ کا ترجمہ یہ ہے کہ نصاریٰ سے کہہ دو۔ کہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے نہ اُس سے کوئی پیدا ہوا۔ اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا۔ اور نہ کوئی اُس کے برابر ہے۔ پھر سورہ الفلق میں اس فتنہ سے بچنے کیلئے یہ دعا سکھائی قل اعوذ برب الفلق یعنی تمام مخلوقات کے شر سے اُس خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ جو رب الفلق ہے یعنی صبح کا مالک ہے یا روشنی کا ظاہر کرنا اُسی کے قبضہ و اقتدار میں ہے۔ رب الفلق کا لفظ بتاتا ہے۔ کہ اس وقت عیسائیت کے فتنہ اور مسیح موعود کے تکفیر و توہین کے فتنہ کی اندھیری رات احاطہ کرلے گی اور پھر کھول کر فرمایا۔ کہ من شر غاسقٍ اذا وقب یعنی میں اس اندھیری رات کے شر سے جو عیسائیت کے فتنہ اور مسیح موعود کے انکار کے فتنہ کی شب تار ہے پناہ مانگتا ہوں۔ پھر فرمایا ومن شر النفاثات فی العقد یعنی زنانہ سیرت لوگوں کی شرارت سے پناہ مانگتا ہوں۔ جو گنڈوں پر پھونکیں مارتے ہیں عقد یعنی گرہوں سے مراد وہ معضلات اور مشکلات شریعت محمدیہ ہیں جن پر جاہل مخالف اعتراض کرتے ہیں۔ اور ان کو ایک پیچیدہ صورت میں پیش کر کے لوگوں کو دھوکا میں ڈالتے ہیں۔ اور یہ دو قسم کے لوگ ہیں اوّل تو پادری اور اُن کا پس خوردہ کھانے والے دوسرے لوگ دوم وہ ناواقف اور ضدی ملاں لوگ جو اپنی غلطی کو تو چھوڑتے نہیں۔ اور اپنی نفسانی پھونکوں سے اس صاف دین میں اور بھی مشکلات پیدا کر دیتے ہیں۔ اور ساتھ ہی اُسکے زنانہ خصلت بھی رکھتے ہیں۔ کہ خدا کے مامور اور مرسل کے سامنے نہیں آتے پس ایسے لوگوں کی شرارتوں سے بھی پناہ مانگنے کا حکم ہے۔ ایسا ہی

جن حاسدوں کے حسد سے جب وہ حسد کرنے لگیں۔ پناہ مانگنے کا حکم ہے۔ اور پھر آخر سورۃ میں شیطانی وسوسوں سے محفوظ رہنے کی دعا تعلیم فرمائی ہے۔ اور جیسے سورہ فاتحہ کو الضالین پر ختم کیا تھا۔ ویسے ہی آخری سورۃ کو خناس کے ذکر پر ختم کیا۔ تاکہ خناس اور الضالین کا باہمی تعلق معلوم ہو۔ آدم اول کے وقت میں بھی خناس جسے عبرانی زبان میں نحاش کہتے ہیں۔ جنگ کے لئے آیا تھا۔ اسی طرح اس وقت بھی مسیح موعودؑ کے زمانہ میں جو آدمؑ کا مثیل بھی ہے۔ ضروری تھا۔ کہ وہی نحاش ایک دوسرے لباس میں آتا اسی لئے عیسائیوں اور مسلمانوں ہر دو نے بالاتفاق یہ بات تسلیم کی ہے۔ کہ آخری زمانہ میں آدمؑ و شیطان کی ایک عظیم الشان جنگ ہوگی جسمیں شیطان ہلاک کیا جائے گا۔ اب ان تمام امور کو دیکھکر ایک خدا ترس آدمی ڈر جاتا ہے۔ کیا یہ جملہ واقعات میرے اپنے بنائے ہوئے ہیں۔ جو خدا تعالےٰ نے اس زمانہ میں جمع کر دئے ہیں۔ کس طرح پر اللہ تعالےٰ نے ایک دائرہ کی طرح اس سلسلہ کو رکھا ہوا ہے۔ والضالین پر سورہ فاتحہ کو جو قرآن کا آغاز ہے ختم کیا۔ اور پھر قرآن شریف کے آخر میں وہ سورتیں رکھیں جن کا تعلق سورۃ فاتحہ کے انجام سے ہے۔ ادھر مسیح اور آدمؑ کی مماثلت ٹھیرائی اور مجھے مسیح موعودؑ بنایا۔ تو ساتھ ہی اس کے آدمؑ بھی میرا نام رکھا۔ یہ معمولی باتیں نہیں ہیں۔ بلکہ ایک علمی سلسلہ ہے جسے کوئی بھی رد نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس کی بنیاد اللہ تعالےٰ نے اپنے ہاتھ سے رکھی ہے۔ شفیع کا لفظ شفع سے نکلا ہے۔ جس کے معنی جفت کے ہیں۔ اس لئے شفیع وہ ہو سکتا ہے۔ جو دو مقامات کا مظہر اتم ہو۔ یعنی مظہر کامل لاہوت اور ناسوت کا ہو۔ لاہوتی مقام کا مظہر کامل ہونے سے یہ مراد ہے۔ کہ اس کا خدا کی طرف صعود ہو۔ اور وہ ہر ایک فیض و برکت خدا سے حاصل کرے۔ اور ناسوتی مقام کا مظہر کامل ہونے سے یہ مراد ہے کہ مخلوق کی طرف اس کا نزول ہو۔ یعنی جو فیض و برکات وہ خدا تعالےٰ سے حاصل کرے انہیں مخلوق کو پہنچائے اور ان ہر دو مقامات کا کامل اور مکمل مظہر ہمارے نبی کریمؐ تھے۔ اور اسی کی طرف قرآن کی اس آیت میں اشارہ ہے۔ ثم دنیٰ فتدلیٰ فکان قاب قوسین او ادنیٰ ہم دعوے سے کہتے ہیں۔ کہ سوائے حضرت نبی کریمؐ کے مقام لاہوت کا کامل حصہ اور کسی نبی کو نہیں ملا۔ اور ناسوتی حصہ چاہتا ہے۔ کہ بشری لوازم کو بھی ساتھ رکھے۔ سو حضرت نبی کریمؐ میں یہ جملہ باتیں کامل طور پر پائی جاتی ہیں۔ آپؐ نے شادیاں بھی کیں بچے بھی پیدا ہوئے دوستوں کا زمرہ بھی تھا۔ فتوحات حاصل کر کے اختیاری قوتوں کی موجودگی میں انتقام چھوڑ کر دشمنوں پر

رحم کرکے بھی دکھا دیا۔ جب تک انسان میں جملہ اخلاقی قوائے مضبوط نہ ہوں وہ کسی سے پوری پوری ہمدردی نہیں کر سکتا مثلاً جس شخص نے شادی ہی نہیں کی وہ بیوی اور بچوں کے حقوق کی کیا قدر کر سکتا ہے۔ اور اُن پر اپنی شفقت اور ہمدردی کا کیا نمونہ دکھا سکتا ہے۔ رہبانیت ہمدردی کو دور کر دیتی ہے۔ اور اسی لئے اسلام نے رہبانیت کو جائز نہیں رکھا۔ غرض کامل شفیع وہی ہو سکتا ہے جس میں یہ دونوں حصے کامل طور پر پائے جائیں۔ چونکہ یہ ایک ضروری امر تھا۔ کہ شفیع ان دونوں مقامات کا مظہر ہو۔ اللہ تعالےٰ نے ابتدائے آفرینش سے ہی اس سلسلہ کا ظل قائم رکھا یعنی جب آدمؑ کو پیدا کیا۔ تو لاہوتی حصّہ تو اُس میں یوں رکھ دیا۔ جب فرمایا فاذا نفخت فیہ من روحی فقعوا لہ ساجدین۔ اور ناسوتی حصّہ یوں رکھا کہ حوّا کو اس سے پیدا کیا۔ یعنی جب روح پھونکی تو ایک جوڑا آدمؑ کا خدا تعالےٰ سے پیدا ہوا۔ اور جب حوّا نکالی تو دوسرا جوڑا مخلوق کے ساتھ ہونے کی وجہ سے ناسوتی ہو گیا۔ پس جب تک یہ دونو حصے کامل طور پر کامل انسان میں نہ پائے جائیں۔ وہ کبھی شفیع نہیں ہو سکتا۔

ایک شخص نے حضرت مسیح موعودؑ سے دریافت کیا۔ کہ تصویر کی وجہ سے نماز فاسد تو نہیں ہوتی؟ اُس کے جواب میں آپ نے فرمایا۔ کہ کفار کے تتبع پر تو تصویر ہی جائز نہیں۔ ہاں نفس تصویر میں حرمت نہیں بلکہ اس کی حرمت اضافی ہے۔ اگر نفس تصویر مفسد نماز ہو۔ تو میں پوچھتا ہوں۔ کہ کیا پھر روپیہ پیسہ نماز کے وقت پاس رکھنا مفسد نہیں ہو سکتا؟ اس کا جواب اگر یہ دو۔ کہ روپیہ پیسہ کا رکھنا اضطراری امر ہے۔ تو میں کہونگا کہ کیا اگر اضطرار سے پاخانہ آ جائے تو وہ مفسد نماز نہ ہوگا۔ اور پھر وضو نہ کرنا پڑے گا؟ اصل بات یہ ہے۔ کہ تصویر کے متعلق یہ دیکھنا ضروری ہے۔ کہ آیا اس سے کوئی دینی خدمت مقصود ہے یا نہیں؟ اگر یوں ہی بے فائدہ تصویر رکھی ہوئی ہے۔ اور اس سے کوئی دینی فائدہ مقصود نہیں۔ تو یہ لغو ہے اور اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ والذین ہم عن اللغو معرضون۔ لغو سے اعراض کرنا مومن کی شان ہے۔ اس لئے اس سے بچنا چاہیئے۔ لیکن اگر کوئی دینی خدمت اس ذریعہ سے بھی ہو سکتی ہو تو یہ منع نہیں ہے۔ کیونکہ خدا تعالےٰ محاورہ کو ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ مثلاً ہم نے ایک موقعہ پر اپنی ایک کتاب میں حیا نیوں کے مثلث خدا کی تصویر دی ہے جس میں روح القدس بشکل کبوتر دکھایا گیا ہے۔ اور باپ اور بیٹے کی بھی جُدا جُدا تصاویر دی ہیں۔ اس سے ہماری یہ غرض تھی۔ کہ تا عیسائیت کی تردید کر کے دکھائیں۔ اور کہ اسلام نے جو خدا پیش کیا ہے۔ وہی حقیقی خدا ہے

حی قیوم - ازلی و ابدی غیر متغیر اور تجسم سے پاک ہے - اس طرح پر اگر خدمت اسلام کے لئے کوئی تصویر ہو - تو شرع اس میں کلام نہیں کرتی ہے کیونکہ جو امور خادم شریعت ہیں - ان پر اعتراض نہیں ہے - کہتے ہیں کہ حضرت موسےٰ کے پاس جملہ انبیاء کی تصاویر تھیں - قیصر روم کے پاس جملہ انبیاء کی تصاویر تھیں - قیصر روم کے پاس جب صحابہ تشریف لے گئے تھے - تو انہوں نے آنحضرتؐ کی تصویر اُس کے پاس دیکھی تھی - خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ نفس تصویر کی حرمت نہیں - بلکہ اُس کی حرمت اضافی ہے - جو لوگ لغو طور پر تصویریں رکھتے اور بناتے ہیں - وہ حرام ہیں - شریعت ایک پہلو سے حرام کرتی ہے - اور ایک جائز طریق سے اسے حلال ٹھیراتی ہے - روزہ ہی کو دیکھو - ماہ رمضان میں حلال ہے - لیکن عید کے دن کا روزہ حرام ہے - گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی - حرمت دو قسم کی ہوتی ہے - ایک حرام النفس اور دوم حرام بالنسبت - حرام بالنفس جیسے خنزیر جو بالکل حرام ہے خواہ وہ جنگل کا ہو یا پالتو - سفید ہو یا سیاہ - چھوٹا ہو یا بڑا - اس کی ہر قسم حرام ہے - حرام بالنسبت کی مثال یہ ہے - کہ ایک شخص محنت کر کے کسب حلال سے روپیہ پیدا کرے - تو حلال ہے - لیکن اگر وہی روپیہ چوری نقب زنی یا قمار بازی سے حاصل کرے تو حرام ہوگا - بخاری کی پہلی ہی حدیث ہے - انما الاعمال بالنیات - ایک شخص خونی ہے - اگر اُسکی تصویر اس غرض سے لی جائے - کہ اس کے ذریعہ سے اسے شناخت کر کے اُسے گرفتار کیا جائے - تو یہ نہ صرف جائز ہوگی - بلکہ اس سے کام لینا فرض ہوگا - اسی طرح اگر کوئی شخص اسلام کی توہین کرنے والے شخص کی تصویر بھیجتا ہے - تو اُسے اگر کہا جائے کہ یہ حرام کام ہے تو ایسا کہنا موذی کا کام ہے - یاد رکھو - اسلام بُت نہیں ہے بلکہ زندہ مذہب ہے - مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے - کہ آجکل ناسمجھ مولویوں نے غلط فتوے دے دے کر لوگوں کو اسلام پر اعتراض کرنے کا موقعہ دے دیا ہے - آنکھوں میں ہر شے کی تصویر بنتی ہے - بعض پتھر ایسے ہیں کہ جانور اُٹھتے ہیں تو خود بخود ان پر تصویر اُتر آتی ہے - اللہ تعالےٰ کا نام مصوّر بھی ہے - یصوّرکم فی الارحام - پھر بلا سوچے سمجھے کیوں اعتراض کر دیا جاتا ہے - اصل بات یہی ہے - جو میں نے بیان کر دی ہے - کہ تصویر کی حُرمت غیر حقیقی ہے - کسی محل پر ہوتی ہے اور کسی پر نہیں - غیر حقیقی حرمت میں ہمیشہ نیّت کو دیکھنا چاہیئے - اگر نیّت شرعی ہے تو حرام نہیں ورنہ حرام ہے - حدیثوں پر ہی تکیہ نہ کر لو - اگر قرآن شریف پر حدیث کو مقدم کرتے ہو - تو پھر گویا

حضرت نبی کریمؐ پر الزام لگاتے ہو۔ کہ کیوں انہوں نے احادیث کو خود جمع نہیں کرایا کیونکہ آپؐ نے کوئی حکم حدیث کے جمع کرنے کے لئے نہیں فرمایا۔ حالانکہ قرآن شریف کو آپؐ خود لکھواتے اور سناتے تھے۔ بعض صحابہؓ نے احادیث کو اپنے طور پر جمع کیا۔ لیکن آخر انہوں نے جلا دیا جب سبب دریافت کیا گیا۔ تو یہی بتایا۔ کہ آخر راویوں سے سُنی ہیں۔ ممکن ہے اُن میں کمی بیشی ہو۔ اپنے ذمہ کیوں لو جھیلیں۔ پس قرآن کو مقدم کرو۔ اور حدیث کو قرآن پر عرض کرو حکم نہ بناؤ۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۹)

ہفتہ مختتمہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۲ء حضرت مسیح موعودؑ نے جماعت موجودہ قادیان کو مخاطب کر کے فرمایا۔ کہ چونکہ طاعون بشدت پھیلتا جاتا ہے جو خدا تعالےٰ کا قہری نشان ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ وہ لوگ جو میرے ساتھ رہتے ہیں۔ ذوالحجہ کے پہلے عشرہ میں ضرور ضرور تہجد کے لئے اٹھیں اور پورے خشوع اور خضوع کے ساتھ اللہ تعالےٰ کے حضور اس عذاب سے محفوظ رہنے کیلئے دعائیں مانگیں اور اپنی زندگی میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا کر لیں اور پھر کسی کو کوئی بشارت ہوئی ہو۔ تو وہ ہمیں سُنائے اور اگر کوئی مشکوک اور منذر رویا ہو۔ تو ضرور نہیں کہ ہمیں سُنائے بلکہ اپنے طور پر کثرت سے استغفار کرے اور اپنے گھر میں بھی ان امور کی تاکید کرے نیز طاعون زدہ مقامات یا متاثر علاقہ جات کے لوگ عید الفصیٰ پر قادیان آنے کا ہرگز ہرگز ارادہ نہ کریں (الحکم جلد ۶ نمبر ۱۰)

ہفتہ مختتمہ ۱۷ مارچ ۱۹۰۲ء عصمت اور شفاعت کے بارہ میں حضرت مسیح موعودؑ نے فرمایا:۔ تعجب ہے کہ عیسائی لوگ شفاعت کیلئے عصمت کا مطالبہ کیوں کرتے ہیں؟ کیونکہ اُن کے ہاں نری عصمت شفاعت کا موجب نہیں ہو سکتی بلکہ شفاعت تب ہو سکتی ہے۔ جبکہ شفیع معصوم ہو۔ اور پھر وہ ابن اللہ ہو۔ اور پھر صلیب پر لٹکایا جا کر ملعون ہو۔ جب تک یہ تثلیث عیسائی مذہب کے عقیدہ کے موافق قائم نہ ہو کوئی شخص شفیع نہیں ہو سکتا پھر وہ عصمت عصمت ہی کیوں پکارتے ہیں کیا اگر کوئی معصوم شخص اُن کے سامنے پیش کیا جائے یا ثابت کر دیا جائے تو وہ اُسے شفیع مان لیں گے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ عیسائی عقیدہ کے مطابق یہ بھی ضروری ہے کہ ایسا شخص خدا بھی نہ ہو بلکہ ابن اللہ ہو۔ اور وہ بھی جب تک مصلوب ہو کر ملعون نہ ہو لے ہرگز ہرگز شفیع نہیں ہو سکتا۔ پھر ایک اور بات قابلِ غور ہے۔ کہ جب یسوع خود خدا تھا۔ اور اس لئے وہ علت العلل تھا اور اُس نے کُل جہان

کے گناہ بھی اپنے ذمہ لے تھے۔ پھر وہ معصوم کیسے رہ گیا۔ دیگر گناہوں کا ذکر ہم چھوڑتے ہیں جو یہودی مورخوں اور آزاد خیالوں نے اناجیل کے رو سے اُسکی طرف منسوب کئے ہیں۔ لیکن جب اُس نے ساری دنیا کے گناہ خود اُٹھا لئے اور بوجہ علت العلل ہونے کے سارے گناہوں کا کرانے والا بھی وہی تھا۔ تو پھر اُسے معصوم ٹھہرانا عجیب دانشمندی ہے۔

پھر خدا کا نام معصوم نہیں۔ کیونکہ معصوم وہ ہوتا ہے۔ جسکا کوئی دوسرا عاصم ہو۔ خدا کا نام عاصم ہے۔ اس لئے جب شفاعت کے لئے انبیت کی ضرورت ہے۔ اور اُس کے لئے بھی معصومیت کی لعنت ضروری ہے تو یہ سارا تانا بانا ہی بنائے فاسد علی الفاسد کا مصداق ہے۔ حقیقی اور سچی بات یہ ہے جو میں نے پہلے بھی بیان کی تھی۔ کہ شفیع کے لئے ضروری ہے۔ کہ اوّل اُس کا تعلق خدا تعالےٰ سے کامل ہو۔ تاکہ وہ خدا تعالےٰ سے فیض کو حاصل کرے اور پھر اُس کا مخلوق سے بھی شدید تعلق ہو۔ تاکہ وہ فیض اور خیر جو وہ خدا تعالےٰ سے حاصل کرتا ہے۔ مخلوق کو پہنچائے۔ جب تک یہ دونو تعلقات شدید نہ ہوں۔ کوئی شخص شفیع نہیں ہو سکتا۔ پھر اسی مسئلہ پر تیسری بحث قابل غور یہ ہے۔ کہ جب تک نمونہ نہ دیکھا جائے کوئی مفید نتیجہ نہیں نکل سکتا اور ساری بحثیں فرضی ہیں۔ مسیح کے نمونہ کو دیکھ لو۔ کہ چند حواریوں کو بھی درست نہ کر سکا۔ ہمیشہ اُنہیں سُست اعتقاد کہتا رہا۔ بلکہ بعض کو شیطان بھی کہا۔ اور پھر انجیل کے رو سے اُس کا کوئی کامل نمونہ بھی ثابت نہیں ہوتا۔ اس کے بالمقابل ہمارے نبی کریمؐ ایک کامل نمونہ ہیں۔ کس طرح آپؐ نے اہل عرب کو روحانی اور جسمانی طور پر عذاب الیم سے چھڑایا اور گناہ کی زندگی سے نکال کر اُن کی کایا ہی پلٹ دی۔ اُسی طرح بنی اسرائیل کو حضرت موسےٰؑ سے بھی شفاعت کا فائدہ پہنچا۔ لیکن عیسائی جو مسیح کو مثیل موسےٰؑ قرار دیتے ہیں تو وہ یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ موسیٰؑ کی طرح اُس نے بھی قوم کو گناہ سے بچایا ہو۔ بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ مسیح کے بعد اُسکی قوم کی حالت بہت ہی بگڑ گئی۔ اور اگر ابھی تک مسیح کی قوم کے بارے میں کسی کو شک ہو۔ تو وہ لنڈن یا یورپ کے دوسرے شہروں میں جا کر دیکھ لے کہ آیا اُسکی تعلیم نے عیسائیوں کو گناہ سے چھڑا دیا ہے یا پھنسا دیا ہے اور یوں کہنے کو تو ایک مہتر بھی کہہ سکتا ہے۔ کہ بالمیک نے بھی لوگوں کو گناہ سے چھڑا دیا۔ لیکن یہ نرے دعوے ہی دعوے ہیں جن کے ساتھ کوئی واضح ثبوت نہیں ہے پس عیسائیوں کا بھی دعوے کرنا کہ مسیح گناہ سے چھڑانے کے لئے آیا تھا۔ ایک خیالی بات ہے خصوصاً جبکہ ہم دیکھتے ہیں

کہ اُن کے بعد اُن کی قوم کی حالت سخت بگڑ گئی۔ اور وہ روحانیت سے دور جا پڑی۔ ہاں سچا شفیع اور کامل شفیع آنحضرتؐ ہیں جنہوں نے اپنی قوم کو بُت پرستی اور ہر قسم کے فسق و فجور کی گندگیوں اور ناپاکیوں سے نکالکر اعلےٰ درجہ کی قوم بنا دیا۔ اور اُسکے ثبوت میں ہر زمانہ میں آپؐ کی پاکیزگی اور صداقت کے ثبوت کے لئے اللہ تعالیٰ ہر صدی میں نمونہ بھیجدیتا ہے۔

اس کے بعد استغفار کا مسئلہ بھی قابل غور ہے۔ عیسائیوں نے اپنی جہالت اور نادانی سے اس پاک اصول پر بھی نکتہ چینی کی ہے۔ حالانکہ یہ انسان کی طبعی منازل میں سے ایک منزل ہے۔

جاننا چاہیئے۔ کہ اللہ تعالےٰ کے قرآن شریف نے دو نام پیش کئے ہیں اوّل الحیّ دوم القیوم۔ الحیّ کے معنی ہیں خود زندہ اور دوسروں کو زندگی عطا کرنے والا۔ القیوم کے معنی ہیں۔ خود قائم اور دوسروں کے قیام کا اصلی باعث۔ دنیا کی ہر ایک چیز کا ظاہری اور باطنی قیام اور زندگی انہیں ہر دو صفات کے طفیل سے ہے۔ پس حیّ کا لفظ چاہتا ہے۔ کہ اسکی عبادت کی جائے۔ جیسا کہ اس کا مظہر سورۂ فاتحہ میں ایاک نعبد ہے اور القیوم چاہتا ہے۔ کہ اس سے سہارا طلب کیا جائے اور اس کو ایاک نستعین کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے۔ حیّ کا لفظ عبادت کو اس لئے چاہتا ہے کہ اُس نے تمام مخلوق کو پیدا کیا۔ اور پیدا کر کے چھوڑ نہیں دیا۔ جیسے مثلاً معمار جس نے ایک عمارت کو بنایا ہے۔ تو اُس کے مر جانے سے عمارت کا کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن مخلوقات کو خدا تعالےٰ کی ہر حال میں ضرورت لاحق رہتی ہے۔ اس لئے ضروری ہوا۔ کہ خدا تعالےٰ سے طاقت طلب کرتے رہیں۔ اور یہی استغفار ہے۔ اصل حقیقت تو استغفار کی یہی ہے۔ پھر اسے وسیع کر کے اس کا مفہوم گناہوں کے برے نتائج سے محفوظ رکھنا بھی لیا گیا۔ اور انسانی کمزوریوں سے بچنے کے لئے بھی اسے استعمال کیا گیا۔ پس جو شخص انسان ہو کر استغفار کی ضرورت نہیں سمجھتا وہ بے ادب و دہریہ ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۱۰)

۲۳ مارچ ۱۹۰۲ء بعد نماز مغرب اور ۲۴ مارچ ۱۹۰۲ء کو صبح کی نماز کے بعد سیر کے وقت حضرت مسیح موعودؑ نے قاضی نعمت علی صاحب بٹالوی کی تحریک پر کتاب اللہ و سنت اور حدیث کے بارہ میں تقریر فرمائی جس کا خلاصہ یہ تھا۔ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ جب کوئی نبی خدا کی طرف سے آتا ہے۔ تو وہ دو ذمہ داریاں لے کر آتا ہے۔ اور اس کا فرض ہوتا ہے۔ کہ وہ اُن کو

امانت کے طور پر پہنچا دے۔ اوّل کلام الٰہی۔ دوم کلام الٰہی کے مطابق عمل کر کے دکھا دینا۔ اور یہی دو باتیں اللہ تعالےٰ کے نزدیک اصل ہیں اور انہیں کو کتاب اور سنت کہتے ہیں۔ اور اب ایک تیسری بات ان دو کے ساتھ شامل کر لی گئی ہے۔ وہ حدیث ہے۔ ہمارا مذہب یہ ہے کہ وہ تیسری شے یعنی حدیث جب تک ان دونوں یعنی کتاب اور سنت کے موافق نہ ہو گی ہم نہیں مانیں گے بعض لوگوں نے دھوکہ دہی کے طور پر سُنّت اور حدیث کو مخلوط کر کے ایک بنا دیا ہے۔ حالانکہ وہ دو جُدا چیزیں ہیں۔ سُنت اور شے ہے۔ اور حدیث اور چیز۔ سُنت کے معنی طریق اور عمل کے ہیں۔ اور حدیث کا مفہوم صرف بات ہے یعنی وہ باتیں جو لوگوں نے اپنے اپنے الفاظ میں مدتوں بعد جمع کیں۔ آنحضرتؐ جو کچھ اللہ تعالےٰ سے پاتے تھے سنت کے طریق پر اسے کر کے بتا دیتے تھے۔ مثلاً نماز کا حکم ہوا۔ آپؐ نے نماز پڑھکر بتا دی۔ ایسا ہی زکوٰۃ اور اُسکے متعلق جملہ امور حج اور اُس کے ارکان۔ روزہ اور اُس کے متعلقات غرض تمام امور جو اللہ تعالےٰ سے آپؐ پاتے ان کو کر کے دکھا دیتے۔ آپؐ کے اس عمل کا نام ہی سنّت ہے۔ جو حدیث سے بالکل الگ ہے۔ اور قرآن شریف کی طرح سلسلہ تعامل میں یہ محفوظ ہے کیا اگر حدیث نہ ہوتی تو ہمارے مخالف کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان نماز نہ پڑھتے یا روزہ نہ رکھتے یا زکوٰۃ نہ دیتے یا حج نہ کرتے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ نماز روزہ زکوٰۃ اور حج و دیگر ضروریات دین اسی طرح ہوتیں جیسے اب ہیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ کہ حدیث کے زمانہ تک جو دو سو برس تک کا زمانہ ہے مسلمانوں میں ضروریات دین پر عمل نہ ہوتا تھا۔ اور جب تک بخاری اور مسلم مرتب نہ ہو گئیں مسلمان مسلمان نہ تھے۔ یہ تو قرآن اور آنحضرتؐ کی توہین ہے کہ آپؐ نے اس ذمہ واری کو پورا نہ کیا۔ جو لے کر آئے تھے۔ قرآن میں سب کچھ ہے۔ مگر نبوت کا استدلال لطیف ہوتا ہے۔ جبرئیل سے جو معصوم ہے آنحضرتؐ علم پا کر اپنے عمل سے دکھا دیتے پس اس بات سے کبھی دھوکا نہ کھاؤ۔ کہ حدیث اور سنت کو ایک قرار دو۔ حدیث وہ اقوال رطب و یابس ہیں جو پیچھے جمع ہوئے۔ اُن میں سے وہی قابل اعتبار اور صحیح ہیں جو کتاب اور سنت کے مخالف اور منافی نہیں ہیں۔

اگر کوئی شخص سوال کرے کہ قرآن شریف سے نماز کی رکعتیں دکھاؤ۔ تو اس کا جواب یہی ہے کہ یہ ہمیں حدیث سے نہیں بلکہ سنت سے معلوم ہوا ہے۔ اور اگر حدیثیں ایسی ہی تھیں۔ جیسے قرآن شریف تو پھر کیوں آنحضرتؐ نے اپنی ذمہ واری میں فرق ڈالا۔

نبی کریمؐ نے دو کام کئے۔ اوّل قرآن سُنا دیا۔ اور پھر اپنے عمل سے دکھا دیا۔ چنانچہ اوّل کے لئے خدا تعالےٰ نے فرمایا الیوم اکملت لکم دینکم اور دوسرے امر کے متعلق یعنی سنت کے لئے فرمایا اتممت علیکم نعمتی اور دونوں کے مجموعہ اور نتیجہ کا نام اسلام ہُوا۔

اب اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ مسیح کی وفات کے متعلق سنت دکھاؤ۔ تو اس کا جواب یہی ہے کہ سُنّت موجود ہے آنحضرتؐ نے خود مر کر دکھا دیا۔ ورنہ اگر اوپر آسمان پر چڑھ جانا سنت انبیاء تھا تو آسمان پر اُڑ جاتے مگر جیسا کہ قرآن شریف نے شہادت دی مسیح کی وفات پر اور آپؐ کی وفات پر۔ انک میت وانھم میتون۔ آپؐ نے مر کر دکھا دیا۔ اور ما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل کی تصدیق کر دی یہی وجہ ہے۔ کہ پہلا اجماع اُمت محمدیہ کا آپؐ کی وفات پر حضرت مسیح کی وفات کی نسبت ہُوا۔ حضرت ابوبکرؓ کا استدلال کیسا لطیف تھا۔ اور یہ خدا تعالےٰ کا قانون ہے۔ کہ جو خلیفہ ہونے والا ہوتا ہے۔ اس کو لطیف استدلال اور نبوت کے انوار کا حصّہ دیا ہے اور وہ ملکہ مخفی رہتا ہے۔ جب تک کہ وہ وقت نہ آجائے۔ جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ کے لئے ہُوا غرض خلاصہ کلام یہ ہے کہ کتاب سُنّت اور حدیث کو ہرگز ہرگز ملانا نہیں چاہیئے

(الحکم جلد ۶ نمبر ۱۱)

ہفتہ مختتمہ ۲۴ مارچ ۱۹۰۲ء حضرت مسیح موعودؑ کی ڈائری کا اقتباس حضرت مسیح موعود نے فرمایا۔ کہ مخالف جو ہمیں گالیاں دیتے ہیں۔ اور ہمارے خلاف گندے اور ناپاک اشتہار شائع کرتے ہیں۔ ہم کو اُن کا جواب گالیوں سے کبھی نہ دینا چاہیئے۔ ہم کو سخت زبانی کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ سخت زبانی سے برکت جاتی رہتی ہے۔ اس لئے ہم نہیں چاہتے کہ اپنی برکت کو کم کریں۔ اُن کو تو مخاطب کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ یہ لوگ بجائے خود واجب الرحم ہیں۔ ہاں فضول باتوں کو نکال کر اگر کسی معقول اعتراض کا جواب عوام کو دھوکہ سے بچانے کے لئے دیا جائے تو نامناسب نہیں۔ اگر ہم اُن کے مقابل پر سخت زبانی کا استعمال کریں۔ تو یہ تو اپنے مرتبہ کا بھی تذلل ہے اگر کبھی کوئی سخت لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ تو وہ حق کی لازمی مرارت ہے جو دوا کے طور پر ہے جس کی نظیر انجیل اور نبیوں کے کلام میں پائی جاتی ہے ریس اور تقلید کرنا انبیاء کا کام نہیں۔ نام تو وہی ہوتا ہے جو آسمان پر رکھا جاتا ہے۔ کسی کے ظالم

کافر کہنے سے کیا بنتا ہے۔ زمینی ناموں کا آخر خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور آسمانی نام ہی رہ جاتے ہیں۔ پس دنیا کے کیڑوں کے ناموں کی کیا پرواہ؟ اِس نام کی قدر کرو۔ جو آسمان پر نیک لکھا جائے۔

حضرت مسیحؑ کے دو زرد چادروں میں نزول کے بارہ میں اگر زرد چادروں سے وہی مراد ہو۔ جو ہمارے مخالف بیان کرتے ہیں۔ تو پھر عام ہندو جوگیوں اور حضرت مسیحؑ میں مابہ الامتیاز کیا ہوگا۔ اصل بات یہ ہے۔ کہ خدا کی چادر اپنے الگ معنی رکھتی ہے۔ اور وہ وہی ہے جو اللہ تعالےٰ نے مجھ پر کھولے ہوئے ہیں۔ کہ زرد چادروں سے مراد دو بیماریاں ہیں جو مجھے لاحق حال ہیں۔

دنیا میں تین قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔ عوام۔ متوسط درجے کے۔ امرا۔ عوام عموماً کم فہم ہوتے ہیں ان کی سمجھ موٹی ہوتی ہے۔ اس لئے اُن کو سمجھانا بہت ہی مشکل ہوتا ہے اسی طرح امرا کو بھی سمجھانا مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ نازک مزاج ہوتے ہیں اور جلد گھبرا جاتے ہیں۔ اور اُنکا تکبر اور تعلّی اور بھی سدراہ ہوتی ہے۔ اس لئے اُن کے ساتھ گفتگو کرنے والے کو چاہیئے کہ وہ اُن کے طرز کے موافق اُن سے کلام کرے یعنی مختصر مگر مطلب کو پورے طور پر ادا کرنے والی تقریر ہو۔ قلّ ودلّ۔

لیکن عوام کو تبلیغ کرنے کے لئے تقریر بہت ہی صاف اور عام فہم ہونی چاہیئے۔ رہے اوسط درجے کے لوگ زیادہ تر یہی گروہ اس قابل ہوتا ہے۔ کہ اُن کو تبلیغ کی جائے۔ دو بات کو سمجھ سکتے ہیں۔ اور اُن کے مزاج میں وہ تعلّی اور تکبّر اور نزاکت بھی نہیں ہوتی جو امرا کے مزاج میں ہوتی ہے۔ اس لئے ان کو سمجھانا بہت مشکل نہیں ہوتا۔

جب انبیاءؑ مامور ہو کر دنیا میں آتے ہیں۔ تو لوگ تین ذریعوں سے ہدایت پاتے ہیں۔ یہ اِس لئے کہ تین ہی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ظالم۔ مقتصد اور سابق بالخیرات اوّل درجے کے لوگ تو سابق بالخیرات ہوتے ہیں جن کو دلائل اور معجزات کی ضرورت ہی نہیں ہوتی وہ ایسے صاف دل اور سعید ہوتے ہیں کہ مامور کے چہرہ کو دیکھکر اس کی صداقت کے قائل ہو جاتے ہیں۔ اور اُس کے دعوے کو ہی سُنکر اِس کو برنگ دلیل سمجھ لیتے ہیں۔ اُن کی عقل ایسی لطیف واقع ہوتی ہے کہ وہ انبیاء کی ظاہری صورت اور اُن کی باتوں کو سُنکر قبول کر لیتے ہیں۔ دوسرے درجہ کے لوگ مقتصدین کہلاتے ہیں

جو ہوتے تو سعید ہیں۔ لیکن اُن کو دلائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور شہادت سے مانتے ہیں تیسرے درجہ کے لوگ جو ظالمین ہیں۔ اُن کی طبیعت اور فطرت کچھ ایسی وضع پر واقع ہوتی ہے کہ وہ بجز مار کھانے اور سختی کے مانتے ہی نہیں۔ جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں۔ کہ اسلام جبر سے پھیلا ہے۔ وہ تو بالکل جھوٹے ہیں۔ کیونکہ اسلامی جنگیں دفاعی اصول پر تھیں۔ مگر ہاں یہ سچ ہے کہ خدا تعالےٰ نے اپنے قانون میں یہ بات رکھی ہوئی ہے۔ کہ تیسرے درجہ کے لوگوں یعنی ظالمین کے لئے ایک طریق رکھا ہوا ہے جو بظاہر جبر کہلاتا ہے۔ اور ہر نبی کے وقت میں عوام کی ہدایت جبر کے کسی نہ کسی پیرائہ میں ہوئی ہے۔ کیونکہ دوربین سے دیکھنے والے کا مقابلہ مجرد آنکھ سے دیکھنے والا نہیں کر سکتا جب استعداد بن مختلف ہیں۔ تو پھر سب کے لئے ایک ذریعہ کیونکر مفید ہو سکتا ہے۔ بڑے مقبول اور مقرب اور رسالت کی سچی خلافت کرنے والے وہی ہوتے ہیں۔ جو سابق بالخیرات کہلاتے ہیں اُنکی مثال حضرت ابوبکرؓ کی سی ہے۔ کہ آپ نے کوئی معجزہ اور نشان طلب نہیں کیا۔ آنحضرتؐ کا دعوے سنتے ہی ایمان لے آئے۔ اور حقیقت میں یہ ہے بھی سچ۔ اس لئے کہ جس شخص کو مامور کی اخلاقی حالت کی واقفیت ہو۔ اسکو معجزہ اور نشان کی ہرگز ضرورت نہیں ہوتی۔ اسی لئے آنحضرتؐ نے یاد دلایا کہ قد لبثت فیکم عمراً سابقین کو تو یہ صورت پیش آتی ہے۔ کہ وہ اپنی فراست صحیحہ سے ہی تاڑ جاتے ہیں اس کا ثبوت یہ ہے۔ کہ جب آنحضرتؐ مدینہ میں تشریف لے گئے۔ تو بہت سے لوگ آپؐ کی زیارت کے لئے آئے۔ اُن میں ایک یہودی بھی آیا جب لوگوں نے اس سے دریافت کیا تو اُس نے کہا کہ یہ چہرہ جھوٹوں کا نہیں ہے۔ پھر مقتصد لوگ وہ ہوتے ہیں۔ جو دلائل اور معجزات کے محتاج ہوتے ہیں۔ اور تیسری قسم ظالمین کی ہے۔ جو سختی سے مانتے ہیں جیسے حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں کبھی طاعون سے اور کبھی زلزلہ سے ہلاک ہوئے اور دوسروں کے لئے عبرت بنے۔ یہ ایک قسم کا جبر ہے۔ جو اس تیسری قسم کے لئے اللہ تعالےٰ نے رکھا ہوا ہے۔ اور سلسلہ نبوت میں یہ لازمی طور پر پایا جاتا ہے۔

مامور من اللہ کی دعاؤں کا کل جہان پر اثر ہوتا ہے۔ اور یہ خدا کا ایک باریک قانون ہے۔ جس کو ہر ایک شخص سمجھ نہیں سکتا۔ جن لوگوں نے شفیع کے مسئلہ سے انکار کیا ہے۔ اُنہوں نے سخت غلطی کھائی ہے۔ شفیع کو قانون قدرت چاہتا ہے

اس کو ایک تعلق شدید اللہ تعالےٰ سے ہوتا ہے۔ اور دوسرا مخلوق سے۔ مخلوق کی ہمدردی اس میں اس قدر ہوتی ہے کہ یوں کہنا چاہیئے۔ کہ اُس کے قلب کی بناوٹ ہی ایسی ہوتی ہے۔ کہ وہ ہمدردی کے لئے جلد متاثر ہو جاتا ہے۔ اس لئے وہ خدا سے لیتا ہے اور اپنی عقد ہمت اور توجہ سے مخلوق کو پہنچاتا ہے۔ اور اپنا اثر اُس پر ڈالتا ہے۔ اور یہی شفاعت ہے۔ انسان کی دعا اور توجہ کے ساتھ مصیبت کا رفع ہونا یا معصیت اور ذنوب کا کم ہونا یہ سب شفاعت کے نیچے ہے توجہ سب پر اثر کرتی ہے خواہ مامور کو اپنے ساتھ تعلق رکھنے والوں کا نام اور مقام بھی یاد ہو یا نہ ہو۔ (الحکم جلد نمبر ۱۱)

۲۲ مارچ ۱۹۰۲ء کو بوقت شب حضرت مسیح موعودؑ نے زمرہ احباب میں ذیل کی تقریر بیان فرمائی ہے:۔ مامور من اللہ کی صحبت میں رہنے والے لوگ بہت کچھ فائدہ اٹھاتے ہیں اور ایک حد تک علم صحیح اُس تعلق کے متعلق جو مامور من اللہ اور خدا تعالےٰ میں ہوتا ہے حاصل کرتے ہیں۔ مگر وہ کامل علم جو اُس مامور کو دیا جاتا ہے کسی دوسرے کو نہیں مل سکتا اور خدا تعالےٰ کا علم تو پھر اور ہی رنگ رکھتا ہے۔ جب مامور کی تکذیب اور انکار حد تک پہنچ جاتا ہے۔ تو پھر ٹھیک اسی طرح جیسے کہ زمیندار جب فصل پک جاتی ہے تو اُس کے کاٹنے کے واسطے درانتی کو درست کرتا ہے۔ اللہ تعالےٰ بھی مکذبوں کے لئے تیاری کرتا ہے۔ اور میں دیکھتا ہوں۔ کہ اب وہ وقت آگیا ہے۔ اور خدا تعالےٰ ہر پہلو سے حجت پوری کر چکا ہے۔ اس لئے اب ہماری جماعت کو چاہیئے کہ وہ خاموشی سے آسمانی ہتھیار اور حربے کو دیکھے۔ دنیا میں ہم یہ قانون دیکھتے ہیں کہ جب ایک حاکم کو معلوم ہو جائے۔ کہ فلاں شخص مظلوم ہے۔ تو وہ اُس کی مدد کرتا ہے۔ پھر خدا تعالےٰ جس کا علم سب سے زیادہ صحیح اور یقینی ہے۔ جو ہر حال کا بینا ہے۔ کیوں اُس مظلوم صادق کی مدد نہ کرے گا۔ جو محض اس لئے ستایا گیا ہے۔ کہ اُس نے اللہ تعالےٰ سے الہام پاکر یہ کہا۔ کہ وہ خدا تعالےٰ کی طرف سے اصلاح خلق کے لئے بھیجا گیا ہے۔ اللہ تعالےٰ اپنے راستباز بندوں کو کبھی ضائع نہیں کرتا۔ وہ اُن کی مدد کرتا ہے لیکن ہاں یہ سنت اللہ ہے۔ کہ وہ صبر سے کام لیتا ہے۔ یہ کہنا۔ کہ خدا تعالےٰ کو اس تکذیب اور انکار کی خبر نہیں کفر ہے۔ وہ تو ابتدا سے جانتا ہے کہ ایسے لوگوں کے لئے کیا کیا جاتا ہے۔ اس وقت خدا تعالےٰ کے

فضل سے دو فریق ہو گئے ہیں۔ جس طرح سے ہماری جماعت شرح صدر سے اپنے آپ کو حق پر جانتی ہے۔ اسی طرح ہمارے مخالف اپنے غلو میں ہر قسم کی بے حیائی اور جھوٹ کو جائز سمجھتے ہیں۔ شیطان نے اُن کے دلوں میں اچھی طرح سے جما دیا ہے۔ کہ ہماری نسبت ہر قسم کا افترا اور بہتان اُن کے لئے جائز ہے۔ اور نہ صرف جائز بلکہ ثواب کا کام ہے۔ اس لئے اب نہایت ضروری ہے کہ ہم اپنی کوششوں کو اُن کے مقابلہ میں بالکل چھوڑ دیں۔ اور خدا تعالےٰ کے فیصلہ پر نگاہ رکھیں۔ اور جس قدر اپنا وقت اُن کی بیہودگیوں اور گالیوں کی طرف توجہ کرنے میں ضائع کریں بہتر ہے۔ کہ وہی وقت استغفار اور دعاؤں میں صرف کریں۔ ہماری جماعت کو یہ نصیحت ہمیشہ کے لئے یاد رکھنی چاہیئے۔ کہ وہ اُس امر کو مدنظر رکھیں۔ جو میں بیان کرتا ہوں مجھے ہمیشہ اگر کوئی خیال آتا ہے تو یہی آتا ہے۔ کہ دنیا میں نور شتے ناتے ہوتے ہیں بعض اُن میں سے خوب صورتی کے لحاظ سے ہوتے ہیں بعض خاندان یا دولت کے لحاظ سے اور بعض طاقت کے لحاظ سے۔ لیکن جناب الٰہی کو ان امور میں سے کسی کی پرواہ نہیں۔ اُس نے تو صاف طور پر فرما دیا ہے۔ کہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ یعنی اللہ تعالےٰ کے نزدیک وہی معزز و مکرم ہے جو متقی ہے۔ اب جو اتقیا کی جماعت ہے۔ اللہ تعالےٰ اُس کو ہی قائم رکھے گا۔ اور اُس کے مخالف کو ہلاک کر دے گا۔ یہ نہایت نازک مقام ہے اور اس جگہ پر ہر دو کھڑے نہیں ہو سکتے۔ یعنی یہ کہ متقی بھی وہیں رہے اور شریر اور ناپاک بھی اُسی جگہ ضرور ہے کہ متقی قائم رہے اور خبیث ہلاک کر دیا جائے لیکن چونکہ اس بات کا علم محض خدا تعالیٰ ہی کو ہے کہ کون اسکے نزدیک متقی ہے اسلئے یہ بڑے خوف کا مقام ہے خوش قسمت ہے۔ وہ انسان جو خدا تعالیٰ کے نزدیک متقی ہے اور بدبخت ہے وہ جو لعنت کے نیچے آگیا۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ہمارے مخالفین میں علما بھی ہیں اور فہیم بھی ہیں۔ تو یہ ایک خیالی بات ہے۔ اور اس سے اس مقصد کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا جو انسانی ہستی کا ہونا چاہیئے۔ خوب یاد رکھو کہ جب تک کسی انسان سے وہ امر سرزد نہ ہو جس پر خدا تعالےٰ راضی ہوتا ہے۔ نہ علم صحیح ہوتا ہے اور نہ الہام مفید۔ جو شخص ایک پاخانہ کے نزدیک کھڑا ہو۔ اُسے تو پہلے بدبو ہی آئیگی پھر اُس کے بعد اگر اس کے پاس عطر لایا جائے۔ تو وہ اس سے کیا فائدہ اٹھائیگا۔ جب تک کسی انسان کو خدا تعالےٰ کا قرب حاصل نہ ہو کچھ نہیں ملتا اور خدا تعالےٰ کا قرب حاصل کرنے والی بات صرف تقویٰ ہے۔ خدا تعالےٰ کی سچی آواز سُننے کیلئے

انسان کو متقی بننا چاہیئے۔ میں نے بہت سے لوگ دیکھے ہیں جو ہر آواز کو جو اُنہیں آجائے الہام ہی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اضغاث احلام بھی ہوتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے۔ کہ جو آوازیں اُنہیں سُنائی دیتی ہیں۔ وہ بناوٹی ہیں۔ نہیں۔ اُن کو آوازیں آتی ہونگی۔ لیکن ہم ہر ایک آواز کو خدا تعالےٰ کی آواز قرار نہیں دے سکتے جب تک اُسکے ساتھ وہ انوار اور برکات نہ ہوں۔ جو اللہ تعالےٰ کے پاک کلام کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اس لئے ہم کہتے ہیں۔ کہ ان الہام کے دعوے کرنے والوں کو اپنے الہامات کو اس کسوٹی پر پرکھنا چاہیئے اور اُنہیں اس بات کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ بعض آوازیں صرف شیطانی ہوتی ہیں۔ اس لئے اِن آوازوں پر ہی فریفتہ ہو جانا دانشمند انسان کا کام نہیں۔ بلکہ جب تک اندرونی نجاست اور گند دور نہ ہو۔ اور تقویٰ کی اعلیٰ درجہ کی صفائی حاصل نہ ہو۔ اور انسان اُس درجہ اور مقام پر نہ پہنچ جائے کہ دنیا اُسے ایک مرے ہوئے کیڑے سے بھی حقیر اور ذلیل نظر آوے اور ہر قول اور فعل میں اللہ تعالیٰ ہی مقصود ہو۔ اس مقام پر قدم نہیں پڑ سکتا جہاں پہنچ کر انسان اپنے اللہ کی آواز سُنتا ہے۔ اور وہ آواز حقیقت میں اُسی کی ہوتی ہے کیونکہ اُس وقت انسان تمام نجاستوں سے پاک ہو گیا ہوتا ہے۔ غرض نری آوازیں اور چند رسمی کتابوں کے پڑھ لینے سے فیصلہ نہیں ہوتا۔ بلکہ فیصلہ کی اصلی اور سچی راہ وہی ہے۔ جس کو تائیدات الٰہیہ کہتے ہیں۔ اور اُن سے ہی سچائی جھٹلائی کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اور صرف خدا ہی کا حق یہ فیصلہ کرتا ہے۔ جو شخص اللہ تعالےٰ کے حضور ایسے مقام پر کھڑا ہے۔ جو نجاست سے بالکل الگ ہے۔ وہ فی الحقیقت وہی پاک آوازیں سُنتا ہے۔ جو حضرت موسےٰؑ حضرت عیسےٰؑ حضرت نوحؑ حضرت ابراہیمؑ اور دوسرے انبیاءؑ نے سُنیں۔ اور جن کو ہمارے نبی کریمؐ نے سُنا تھا۔ میں سچ سچ کہتا ہوں۔ کہ اُن آوازوں کی صداقت اور عملی ظہور کیلئے انسانی ہاتھوں کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ خود اللہ تعالےٰ اُنکی چمکار دکھاتا ہے۔ اگرچہ یہ بہت ہی باریک باتیں ہیں۔ جو معرفت کے اسرار میں داخل ہیں۔ تاہم خوشبو اور بدبو اپنے مختلف نظاروں سے شناخت کی جا سکتی ہے۔ اچھے درخت کو کئی طرح سے پہچان سکتے ہیں۔ صرف پتوں سے بھی شناخت کر لیتے ہیں۔ میں نے ایک بار الائچی کا درخت انبالہ میں دیکھا تو اُس کا ایک پتہ لے کر سونگھا جسمیں الائچی کی خوشبو موجود تھی۔ اگرچہ ابھی اس کے تین دانے باقی تھے لیکن تاہم خوشبو موجود تھی۔ ایک دانشمند انسان بہت سے قرائن سے امر واقعی کو معلوم کر لیتا ہے

[redacted]ثت بھی ہزارہا پردوں میں چھپی رہتی ہے۔ اسی طرح تقوے بھی ہزارہا پردوں کے درمیان مخفی رہتا ہے۔ لیکن ہر دو کا اپنے اپنے آثار اور قرائن سے بخوبی پتہ لگ سکتا ہے۔ صوفیوں نے لکھا ہے کہ جس طرح سے اگر کوئی شخص عین بدکاری کی حالت میں پکڑا جائے۔ تو اُسے بہت ہی شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ اسی طرح ایک متقی جب اپنے تقوے کے پیرو عبادت میں مصروف ہو۔ اور اُس پر کوئی اجنبی گذرے تو اُسے بھی شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ شرمندگی کے موجبات تو ایک ہی ہیں یعنی بدکار اپنی بدکاری کو مستور رکھنا چاہتا ہے۔ اور متقی اپنے تقوی کو غرض تقوے کے امور بہت پوشیدہ ہوتے ہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے۔ کہ اس سیر کی ملائکہ کو بھی خبر نہیں ہوتی۔ پھر کسی دوسرے کو کیسے اطلاع مل سکتی ہے۔ آنحضرتؐ کا جو تعلق تھا اسکی کیفیت کو اللہ تعالے جس قدر سمجھتا تھا۔ اسے کسی دوسرے نے ہرگز نہیں سمجھا نہ حضرت ابوبکرؓ نے اُسے سمجھا اور نہ حضرت علیؓ نے اور نہ کسی اور شخص نے آپؐ کا انقطاع تام اور اللہ تعالے پر توکل کرنا اور مخلوق کو مرے ہوئے کیڑے سے بھی بدتر سمجھنا ایک ایسا امر تھا۔ جو دوسروں کو نظر نہ آسکتا تھا۔ لیکن تائیدات الٰہی کو دیکھ کر لوگ یہ نتیجہ ضرور نکالتے تھے۔ کہ جیسا اللہ تعالے سے سچا اور قوی تعلق آپؐ نے پیدا کیا ہوا ہے خدا تعالیٰ نے بھی آپؐ سے کوئی فرق نہیں کیا ہے کسی عظیم الشان بات پر کہ آپؐ کسی مقام میں کبھی بھی ذلت نصیب نہیں ہوئی۔ بلکہ ہر ایک میدان میں آپؐ ہمیشہ مظفر و منصور ثابت ہوئے ہیں۔ اس کے مقابل حضرت مسیحؑ کی حالت پر غور کریں تو معلوم ہے۔ کہ اُنہیں کسطرح پر ذلت ہی ذلت نصیب ہوئی ہے۔ ایسا اوقات ایک عیسائی شرمندہ ہو جاتا ہوگا۔ جبکہ وہ اپنے اُس خدا کی ایسی حالت پر غور کرتا ہوگا۔ جو انہوں نے فرضی اور خیالی طور پر بنا لیا ہوا ہے مجھے ہمیشہ تعجب اور حیرت ہوتی ہے۔ کہ عیسائی اُس تعلیم کو جو موجودہ اناجیل میں بیان کی گئی ہے۔ اور اُس خدا کو جس کے کسی قدر واقعات ان اناجیل میں پائے جاتے ہیں رکھکر کس طرح سے آنحضرتؐ پر ترجیح دے سکتے ہیں۔ مثلاً اسی تعلیم پر نظر کرو۔ کہ ایک گال پر طمانچہ کھاکر دوسری بھی آگے پھیر دو۔ اب اگر اس کے تمام پہلوؤں پر غور کرو۔ تو صاف طور پر نظر آجائیگا۔ کہ یہ نہایت بودی اور نکمی تعلیم ہے۔ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اُن سے بچے خوش ہو جاتے ہیں۔ بعض سے متوسط درجے کے لوگ اور بعض سے اعلےٰ درجے کے لوگ۔ انجیل کی تعلیم صرف بچوں کا کھلونا ہے۔ کہ جسکی حقیقت کچھ بھی نہیں۔ کیا اللہ تعالے نے انسان کو جو اس قدر قوائے عطا فرمائے ہیں۔ ان کا موضوع اور مقصود یہی ہے کہ وہ طمانچے کھایا کرے؟ ایک انسان تب ہی مکمل

انسان بنتا ہے جبکہ وہ اپنے تمام خداداد قوائے کو استعمال کرے۔ لیکن اناجیل کہتی ہے۔ کہ سارے قوائے کو بیکار چھوڑ دو۔ اور صرف ایک ہی قوت پر زور دئے جاؤ۔ اُس کے مقابل قرآن شریف تمام قوائے انسانی کا مربّی ہے۔ اور ہر ایک قوت کو برمحل استعمال کرنے کی تعلیم دیتا ہے جیساکہ مسیح کی اس کی تعلیم کے مقابل قرآن شریف فرماتا ہے۔ جزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا فمن عفا واصلح یعنی بدی کی سزا تو اسی قدر بدی ہے۔ لیکن عفو بھی کرو۔ تو ایسا عفو کہ اس کے نتیجہ میں اصلاح ہو۔ اور وہ عفو بے محل نہ ہو۔ مثلاً ایک شخص کا ایک فرمانبردار غلام ہو۔ جو اپنے فرائض منصبی کے ادا کرنے میں کبھی خیانت اور غفلت نہیں کرتا۔ لیکن اگر اتفاقاً کسی دن اُس کے ہاتھ سے گرم چائے کی پیالی گر جائے اور نہ صرف پیالی ہی ٹوٹ جائے بلکہ کسی قدر گرم چائے بھی مالک کے سر پر پڑ جائے۔ تو ایسی صورت میں ضروری نہیں کہ آقا اس کو سزا دے۔ بلکہ اس کے حسب حال سزا یہ ہے کہ اُسے معاف کر دیا جائے ایسے وقت پر موقعہ شناس آقا تو خود شرمندہ ہو جاتا ہے۔ کہ اس بیچارے نوکر کو شرمندہ ہونا پڑے گا۔ لیکن اسکے خلاف اگر کوئی شریر نوکر اس قسم کا ہے۔ کہ وہ ہر روز نقصان کرتا ہے۔ تو اُسے اگر عفو کر دیا جائے۔ تو وہ اصلاح کرنے کی بجائے اور بھی بگڑ جائے گا۔ تو اُسے تنبیہ ضروری ہے غرض اسلام انسانی قوائے کو اپنے اپنے موقع اور محل پر استعمال کرنیکی تعلیم دیتا ہے اور انجیل اندھا دھند صرف ایک ہی قوت پر زور دیتی چلی جاتی ہے ؎ گر حفظ مراتب نکنی زندیقی غرض قرآن شریف نے حفظ مراتب کا خیال رکھا ہے۔ کہ وہ ہر حال میں عدل کی طرف لے جاتا ہے۔ تمام احکام میں اُس کی یہی صورت ہے۔ انفاق مال کی طرف دیکھو۔ نہ تو ممسک بنانا چاہتا ہے۔ اور نہ ہی مسرف۔ اسی وجہ سے اس امت کا نام ہی اُمۃ وسطاً رکھدیا گیا۔ پھر دوسری قابلِ غور یہ بات ہے۔ کہ آنحضرتؐ کے تقرب کو دیکھنا چاہیئے یہ قاعدہ کی بات ہے۔ کہ بادشاہ کے دل کی بات تو بادشاہ ہی جانتا ہے۔ لیکن جس شخص پر وہ اپنے اسرار ظاہر کرتا ہے۔ یا اپنی رضامندی کے آثار دکھاتا ہے تو ضروری ہے۔ کہ ہم ایسے شخص کو مقرب کہیں۔ اسی طرح سے جب ہم رسول کریمؐ پر اللہ تعالےٰ کی رضامندی کے آثار اور اسرار کھلے دیکھتے ہیں۔ تو آپؐ کے قرب کا مقام وہ نظر آتا ہے۔ جو کسی دوسرے کو کبھی نصیب نہیں ہوا۔ وہ عطایا اور نعماء جو آپؐ کو دئے گئے۔ سب بنی آدم سے بڑھکر ہیں۔ اور جو اسرار آپؐ پر ظاہر ہوئے دوسرا

کوئی شخص اُس حد تک پہنچا ہی نہیں قرآن شریف ہی کو دیکھ لو۔ کہ کس قدر عظیم الشان پیشگوئیاں اِسمیں موجود ہیں۔ حضرت مسیحؑ کے بارہ میں مجھے بار بار خیال آتا ہے۔ کہ نادان عیسائی کس شیخی پر آنحضرتؐ سے اُن کا مقابلہ کرنے بیٹھتے ہیں۔ حضرت مسیح کا دعوے ہی بجائے خود محدود ہے۔ اور وہ صاف کہتے ہیں کہ میں بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔ ضرابت علیھم الخ کی مصداق آپکی دعوت کی مخاطب قوم تھی۔ یہ دعوے تو ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی نمبرداری یا پتی داری کا دعوے کرے۔ جب ایک محدود قوم مخاطب تھی تو حضرت مسیحؑ کی ہمت۔ استقلال اور توجہ اسی دعوے کی نسبت سے ہونی چاہیئے تھی۔ دوسری طرف ہمارے نبی کریمؐ فرماتے ہیں۔ قل یا ایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعاً۔ اِس دعوے کے لئے اتنی ہی بلند ہمتی۔ استقلال اور توجہ درکار ہے۔ چنانچہ آنحضرتؐ کی ہمت۔ بلند نظری اور توجہ کا مسیح کی ہمت۔ بلند نظری اور توجہ سے مقابلہ کرو۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ کیا مسیح کی خدائی کی یہی شان ہونی چاہیئے۔ کہ یہودیوں کے چند گھرانوں کے سوا اور کسی قوم کی اصلاح کا دعویٰ بھی نہیں کیا۔ حالانکہ دعویٰ خدائی کے حسب حال تو یہ ہونا چاہیئے تھا۔ کہ آپکی دعوت کا میدان بڑا وسیع ہوتا۔ خیر اگر اسی بات کو ہی مان لیا جائے کہ بنی اسرائیل کی گم شدہ بھیڑوں کے لئے ہی دعوت تھی۔ لیکن کم از کم اتنا تو دیکھنا چاہیئے۔ کہ جن کی اصلاح کے لئے آئے انمیں کہاں تک کامیابی حاصل کی اگر اناجیلی واقعات پر غور سے نگاہ کی جائے۔ تو یہ راز بھی کھل جاتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ دشمنوں کے مقابلہ پر ہر میدان میں آپ کو ذلیل ہونا پڑا۔ دشمنوں پر کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ بلکہ الٹا انہوں نے پکڑوا کر صلیب پر لٹکوا دیا۔ اور قصہ پاک کر دیا۔ ایسے خدا کا حضرت نبی کریمؐ سے مقابلہ کیا جاتا ہے۔ جو ہر میدان میں مظفر و منصور ہوئے۔ اور آپکے دشمن اور بدخواہ کبھی آپؐ پر قابو اور غلبہ نہ پا سکے اور آپؐ کی آنکھوں کے سامنے ہلاک ہو گئے۔ آپکی بعثت بھی ایسے وقت میں ہوئی۔ کہ جب زمانہ آپؐ کی ضرورت کا مقتضی تھا۔ اور آپؐ اٹھائے اُس وقت گئے جبکہ تمام قوم کی کامل اصلاح ہو چکی۔ اور آپؐ اپنا فرض منصبی پوری کامیابی کے ساتھ ادا کر چکے۔ اور الیوم اکملت لکم دینکم کی آواز آپؐ نے سُن لی۔ حضرت مسیحؑ کی طرف دیکھو صلیب پر چڑھتے ہوئے ایلی ایلی لما سبقتنی کی فریاد کر رہے ہیں۔ یہودا اسکریوطی شاگرد تیس روپے لیکر اپنے پاک اُستاد کو پکڑوا چکا ہے۔ اور پطرس جیسا عزیز شاگرد لعنت بھیج رہا ہے

حضرت مسیح کے لئے یہ نظارہ کیا مایوسی بخش ہے۔ دوسری طرف آنحضرتؐ کی طرف دیکھو کہ کس طرح پر آپؐ کے جان نثار رفیق آپ کے قدموں پر اپنی جانیں نثار کر رہے ہیں۔ کیا ایسے وفادار اور فرمانبردار اصحاب اور رفیق کسی اور کو بھی ملے تھے؟ جنہوں نے اپنی وفاداری اور اطاعت میں فنا ہو کر اپنی جانوں تک کے دے دینے میں ذرا بھی دریغ نہ کیا۔ اور یہ آپؐ کی ذاتی قوت قدسی کا ثبوت ہے جسکے ساتھ مسیح کی قوت قدسی کا مقابلہ کرنے سے اُسمیں کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ پھر اسرار کی طرف نگاہ کرو۔ جسقدر اسرار اور رموز قرآن شریف میں موجود ہیں تورات اور اناجیل میں وہ کہاں؟ پھر قرآن شریف جملہ امور کو صرف دعوے کے رنگ میں ہی پیش نہیں کرتا۔ بلکہ اپنے ہر ایک دعوے کیساتھ استدلالی رنگ رکھتا ہے۔ اور کوئی بات بیان نہیں کرتا جس کے ساتھ اُس نے ایک قوی اور مستحکم دلیل نہ دی ہو۔ برخلاف تورات و اناجیل کے جو نرے دعوے ہی دعوے پیش کرتی چلی جاتی ہیں۔ جس طرح سے قرآن شریف کی فصاحت و بلاغت اپنے اندر ایک جذب رکھتی ہے اور جس طرح پر اُسکی تعلیم میں معقولیت اور کشش ہے ویسے ہی اُسکے دلائل بھی نہایت موثر ہیں۔

غرض میرا مطلب ان جملہ باتوں کے بیان کرنے سے یہ ہے۔ کہ سب نبی آدم سے بڑھکر کامل اور مؤثر نمونہ آنحضرتؐ کا ہے۔ اور اب بھی ہمارا وہی خدا موجود ہے۔ جسنے آنحضرتؐ پر احسانات اور انعامات نازل کئے۔ اور اُسی طرح پر اب بھی اُس کے فضل اور برکات کے انعام نازل ہو رہے ہیں۔ اس لئے خوب یاد رکھو۔ کہ جو فریق اس حق کی مخالفت کرتا ہے۔ اور اسے مفتری کہتا ہے۔ وہ خواہ کتنی ہی مخالفت کرے اور اُس کے مخالف الہامات شائع کرے اُس کو آخر کار ناکام ہو جائے گا۔ کہ غالب وہی ہوتا ہے جس کو اللہ تعالےٰ نے اپنا نور اور فضل دے کر بھیجا ہو اور خدا تعالےٰ اپنی سُنّت و عادت قدیمہ کے موافق اس قوم پر اپنا فضل کرے گا جس کو اُس نے اس زمانہ میں منتخب کر لیا ہے۔ اور وہی دنیا پر پھیلے گی اور وہی قرآن شریف۔ اسلام اور آنحضرتؐ کی سچی وارث ہو گی۔

دنیا میں ہمیشہ انسانوں کے تین طبقے ہوتے ہیں۔ اوّل سابق بالخیرات دوم مقتصد سوم ظالم۔ سابقین کو نشانات اور معجزات کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ تو قرائن اور حالات موجودہ سے ہی مامورانِ الٰہی کو پہچان لیتے ہیں۔ مقتصدین کو کچھ حصّہ روشن دماغی کا ملا ہوا ہوتا ہے اور کچھ تاریکی کا۔ اس لئے وہ دلائل اور معجزات

کے محتاج ہوتے ہیں۔ لیکن تیسرا طبقہ جو ظالمین کا ہوتا ہے وہ چونکہ بہت ہی غبی اور بلید ہوتے ہیں۔ اسلئے وہ بجز مار کھانے کے نہیں مانتے۔ یہ ایک قسم کا جبر ہوتا ہے جو ہر ایک مذہب حقہ میں پایا جاتا ہے۔ کیونکہ ظالمین کا طبقہ بجز مار کھانے کے کچھ سمجھ ہی نہیں سکتا۔ حضرت مسیح کے لئے طاؤس رومی کا اتفاق ہو گیا۔ موسےٰؑ کی قوم جو پہلے ہی سے مزدوریوں اور فرعون کی سختیوں سے نالاں تھی۔ اُس نے حضرت موسےٰؑ کی دعوت کو قبول کر لینا اپنی نجات کا موجب سمجھا۔ لیکن پھر بھی اللہ تعالےٰ اُنکی اصلاح کے لئے اُن پر وقتاً فوقتاً عذاب بھیجتا رہا کبھی طاعون کبھی زلزلے اور اس طرح مختلف طریقوں سے اُنہیں راہ حق منواتا رہا۔ اور اسی طرح دیگر انبیاء کے وقت بھی ہوتا رہا ہے۔ غرض یہ ایک سنت اللہ ہے کہ ظالمین کو اللہ تعالےٰ اسی طریقہ پر سمجھاتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ یہ فریق زیادہ بھی ہوتا ہے اور ساتھ ہی اُس کے غبی بھی ہمارے اس زمانہ میں بھی یہ فریق تعداد کے لحاظ سے زیادہ ہے اور چونکہ غبی ہے اس لئے جو نشانات اللہ تعالےٰ نے میرے ذریعہ سے ظاہر کئے ہیں اُن پر جرح کرتا ہے۔ یہاں تک کسوف و خسوف کی حدیث کو بھی محض میری مخالفت کی وجہ سے مجروح قرار دیدیا لیکھرام کی پیشگوئی کے پورا ہونے سے انکار کر دیا۔ اسی طرح سے جو نشان بھی ہمارے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے۔ اسپر اعتراض کر دیتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالےٰ ان سب پر غالب ہے اس لئے اُس نے اپنی سُنّت قدیمہ کے مطابق آخری حجت اختیار کی یعنی اُن پر طاعون کو مسلط کر دیا جس کا علاج صرف توبہ و استغفار ہی ہے۔ یہ کوئی معمولی بلا نہیں بلکہ محض ارادہ الٰہی سے ظالمین کی سزا کیلئے بھیجی گئی ہے۔ یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہماری جماعت میں سے کسی کو نہ ہوگی کیونکہ صحابہؓ میں سے بھی بعض کو طاعون ہو گئی تھی۔ لیکن ہاں ہم یہ ضرور کہتے ہیں۔ کہ جو شخص اللہ تعالےٰ کے حضور تضرع اور زاری کرتا اور اُس کے حدود و احکام کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اُس کے جلال سے ہیبت زدہ ہو کر اپنی اصلاح کرتا ہے وہ خدا کے فضل سے ضرور حصّہ لے گا۔ اس لئے ہماری جماعت کو چاہیئے کہ وہ تہجد کی نماز کو اپنے اوپر لازم کر لیں جو زیادہ نہیں پڑھ سکتا وہ صرف دو رکعت ہی پڑھ لیا کرے۔ کیونکہ اس طرح سے اُسے بہر حال دعا کرنے کا موقعہ مل جایا کریگا پچھلی رات کی دعاؤں میں ایک خاص تاثیر ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ سچے درد اور جوش سے نکلتی ہیں۔ جب تک کسی شخص کے دل میں ایک خاص سوز اور درد نہ ہو وہ کب خواب راحت سے آخری حصّہ رات میں بیدار ہو سکتا

ہے۔ پس اُس وقت کا اُٹھنا ہی دل میں ایک درد پیدا کر دیتا ہے جس سے دعاؤں میں رقت اور اضطراب کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہی اضطراب اور رقت قبولیت دعاؤں کا موجب ہو جاتے ہیں۔ لیکن اُسکے خلاف اگر کوئی شخص نماز تہجد کے ادا کرنے کے لئے اُٹھنے میں سستی اور غفلت سے کام لیتا ہے۔ تو صاف ظاہر ہے۔ کہ اُسکے دل میں درد اور سوز نہیں لیکن جب وہ خواب راحت چھوڑ کر رات کے پچھلے حصہ میں بیدار ہوتا ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ اُسے کوئی ایسا درد غم ہے جو اُسے بیدار کر دیتا ہے۔ اور سونے نہیں دیتا۔ پھر ایک اور بھی ضروری بات ہے جو ہماری جماعت کو اختیار کرنی چاہیئے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ اپنی زبانوں کو فضول گوئی سے پاک رکھیں۔ کیونکہ زبان وجود انسانی کی ڈیوڑھی ہے۔ اور اسے پاک رکھنے سے گویا اللہ تعالےٰ وجود کی ڈیوڑھی میں آجاتا ہے۔ کیونکہ اُسکی ذات پاک ہے اور وہ پاکی کو پسند کرتا ہے۔ جب خدا تعالےٰ ڈیوڑھی میں آگیا۔ تو پھر اُس کا وجود کے اندر داخل ہونا تعجب کی بات نہیں۔ علاوہ ازیں اِس بات کو خوب یاد رکھو۔ کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد میں تم میں سے کوئی شخص دانستہ ہرگز غفلت نہ کرے۔ جو شخص ان امور کو مدنظر رکھکر دعاؤں سے کام لے گا۔ بایوں کہہ لو۔ کہ جس شخص کو دعاؤں کی توفیق دی جائے گی ہم یقین رکھتے ہیں۔ کہ اللہ تعالےٰ اُس پر اپنا فضل کرے گا۔ اور وہ اُس عذاب طاعون سے ضرور بچ جائے گا۔ ظاہری تدابیر صفائی وغیرہ کی منع نہیں ہیں۔ بلکہ ؎ بر توکل زانوئے اُشتر بہ بند۔ پر عمل کرنا چاہیئے جیسا کہ ایاک نعبد و ایاک نستعین سے معلوم ہوتا ہے۔ لیکن خوب یاد رکھو کہ اصل صفائی وہی ہے جس کے بارہ میں فرمایا۔ قد افلح من زکّٰھا۔ ہر شخص اِس بات کو اپنا فرض سمجھ لے کہ وہ اپنی حالت میں نمایاں تبدیلی پیدا کرے۔ تمہیں یاد ہوگا۔ مجھے الہام ہوا تھا۔ ایام غضب اللہ غضبت غضباً شدیداً۔ یہ طاعون کے متعلق ہے۔ اِسلئے وہی شخص خدا کے فضل کا اُمیدوار بن سکتا ہے۔ جو سلسلہ دعا۔ توبہ اور استغفار کا نہ توڑے عمداً گناہ ایک زہر ہے جو انسان کو ہلاک کر دیتا ہے۔ اور خدا کے غضب کو بھڑکاتا ہے۔ اور اس سے صرف اللہ تعالےٰ کا خوف اور اُس کی محبت ہی ہٹاتی ہے طاعون بھی گناہوں سے بچانے کے لئے بھیجی گئی ہے۔ کہ انسان خدا تعالےٰ کے غضب سے ڈر کر گناہوں سے باز رہیں۔ صوفی کہتے ہیں۔ کہ سعید کسی موقعہ کو ہاتھ سے نہیں دیتے۔ بعض صوفیائے کے حالات لکھے ہیں کہ انہوں نے دعا کی کہ کوئی ہیبت ناک نظارہ دکھایا جائے تاکہ دل میں رقت اور درد پیدا ہو۔ اب اس طاعون

سے بڑھکر کونسا ہیبت ناک نظارہ ہوگا جسمیں لاکھوں بچے یتیم رہ جاتے ہیں۔ بیواؤں سے گھر بھر جاتے ہیں۔ ہزاروں خاندان بے نام و نشان رہ جاتے ہیں۔ اور کوئی بھی اُن کا نام لیوا نہیں رہ جاتا۔ اللہ تعالیٰ کی یہ سُنّت ہے۔ کہ وہ انبیاءؑ کو ایسے موقعوں پر بچا لیا کرتا ہے جبکہ بلائیں عذاب الٰہی کی صورت میں نازل ہو رہی ہوں۔ اس وقت خدا کا غضب بڑھ رہا ہے اور فی الحقیقت یہ خدا کے غضب کے ایام ہیں۔ اس لئے کہ اُسکے حدود اور احکام کی بے حرمتی کی جاتی اور اُس کی پاک باتوں پر ہنسی اور ٹھٹھا کیا جاتا ہے۔ پس اس سے بچنے کا یہی علاج ہے کہ دعا کے سلسلہ کو نہ توڑا جائے اور توبہ و استغفار سے کام لیا جائے۔ یہی دعا مفید ہوتی ہے۔ جس سے انسان کا دل خدا کے حضور میں پگھل جائے۔ اور اُس کے سوا اور کوئی نظر نہ آئے۔ جو شخص خدا تعالیٰ کی طرف بھاگتا ہے اور اضطرار کے ساتھ امن کا جویاں ہوتا ہے وہ ضرور بچا لیا جاتا ہے (الحکم جلد ۶ نمبر ۱۲)

ہفتہ فخر تتمہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۲ء۔ شریعت کی کتابیں حقائق اور معارف کا ذخیرہ ہوتی ہیں۔ لیکن اُن کے حقائق اور معارف سے کسی شخص کو پوری پوری اطلاع نہیں ملتی جب تک کہ اخلاص اور صدق دل سے صادق کی صحبت اختیار نہ کی جائے۔ اسی لئے قرآن شریف میں فرمایا ہے۔ یا ایھا الذین امنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصادقین جس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور اتقا کے مدارج کامل طور پر کبھی حاصل نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ صادق کی معیت اور صحبت اختیار نہ کی جائے۔ کیونکہ اُسکی صحبت میں رہ کر ہی انسان اُس کے انفاس طیبہ۔ خقد بہت توجہ سے فائدہ حاصل کرتا ہے۔

جو دعا قبول ہونے والی ہوتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اُس کے لئے مانگنے والے کے دل میں سچا جوش اور اضطراب پیدا کر دیتا ہے۔ اور بسا اوقات اللہ تعالیٰ خود ہی ایک دعا سکھاتا ہے اور الہامی طور پر اُس کا پیرایہ بنا دیتا ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔ فتلقّٰی آدم من ربہ کلمات جس سے صاف طور پر پایا جاتا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ اپنے راستباز بندوں کو قبول ہونے والی دعائیں خود الہاماً سکھا دیتا ہے۔ بعض وقت ایسی الہامی دعا میں کوئی ایسا حصہ بھی ہوتا ہے۔ جسے دعا کرنے والا ناپسند کرتا ہے۔ لیکن وہ قبول ہو جاتی ہے تب اصل حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ کہ وہ اس آیت کے مصداق ہے۔ عسیٰ ان تکرھوا شیئاً وھو خیر لکم۔

مامور من اللہ جب مبعوث ہوتا ہے۔ تو اُس کی فطرت میں بنی نوع انسان کی سچی ہمدردی رکھی جاتی ہے۔ اور یہ ہمدردی عوام سے بھی ہوتی ہے اور اپنی جماعت سے بھی ایسی ہمدردی میں ہمارے نبی کریم سب انبیاء وغیرہ سے بڑھے ہوئے تھے۔ اس لئے کہ آپ ساری دنیا کے لئے مامور ہو کر آئے تھے۔ اور آپ سے پہلے جس قدر انبیاء آئے تھے وہ محدود القوم اور مختص الزمان کے طور پر تھے۔ لیکن آنحضرتؐ کل دُنیا اور ہمیشہ کے لئے نبی تھے۔ اس لئے آپؐ کی ہمدردی بھی کامل ہمدردی تھی۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ لعلك باخع نفسك ان لا يكونوا مومنين۔ اس آیت کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ کیا تو ان کے مومن نہ ہونے کی فکر میں اپنی جان دے دے گا جس سے اُس درد اور فکر کا پتہ لگ سکتا ہے۔ جو آپؐ کو دُنیا کی تباہ حالت دیکھکر ہوتا تھا۔ کہ وہ مومن بن جائے یہ معنی تو آپؐ کی عام ہمدردی کے لحاظ سے ہیں۔ اور دوسرے معنے یہ ہیں۔ کہ مومن کو مومن بنانے کی فکر میں تو اپنی جان دے دے گا۔ یعنی اُس کے ایمان کو کامل بنانے کے لئے اسی لئے دوسری جگہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ یا ایھا الذین اٰمنوا اٰمنوا باللہ ورسولہ لہٰذا ہر تو یہ تحصیل حاصل معلوم ہوتی ہوگی۔ لیکن جب حقیقت حال پر غور کی جاوے۔ تو صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایمان کے کئی مراتب ہوتے ہیں۔ جن سب کی تکمیل اللہ تعالےٰ کا منشا ہے۔ غرض مامور کی ہمدردی مخلوق کے ساتھ اس درجہ کی ہوتی ہے کہ وہ بہت جلد اُس سے متاثر ہوتا ہے۔

اللہ تعالےٰ اور اُسکے مامورین کے درمیان دو قسم کے تعلقات ہوتے ہیں اوّل یہ کہ مامور تو اللہ تعالےٰ کا رسول ہوتا ہی ہے۔ دوم بعض مقامات پر اللہ تعالےٰ بھی مامور کا رسول بن جاتا ہے۔ یہ ایک باریک بھید ہے۔ جسے ہر ایک شخص جلدی سے سمجھ نہیں سکتا موخر الذکر صورت اُس وقت واقع ہوتی ہے۔ جبکہ مامور اپنی جماعت کو اپنی منشاء کے موافق نہیں دیکھتا تو اس کے دل میں ایک درد پیدا ہوتا ہے اور اس پر ایک چوٹ لگتی ہے۔ اُس وقت اللہ تعالےٰ تمثیلی طور پر اُسکی جماعت کے بعض افراد پر اُن کے عیوب ظاہر کر دیتا ہے۔ اور کبھی تو اُس فعل کا علم مامور اور اُس کے ساتھ تعلق رکھنے والے انسان دونوں کو ہوتا ہے۔ اور کبھی صرف ایک ہی کو۔ اس عقدہ کو حل کرنے کیلئے ہم مثال کے طور پر سمجھا جاتے ہیں۔ مثلاً اکثر لوگ ایسے ہوں گے۔ بلکہ میرے خیال میں قریباً ہر ایک شخص پر اس

قسم کے واقعات گذرے ہونگے کہ جب کبھی وہ کسی گناہ کی حالت میں گرفتار ہونے کو ہوئے ہیں تو رویا میں کسی بزرگ کی زیارت نصیب ہوگی۔ جسکی وجہ سے گناہ کرنے سے بچ گیا۔ اس قسم کے تمثلات وہ ہوتے ہیں جنہیں اللہ تعالےٰ مامور کا رسول ہوکر اپنا فیض پہنچاتا ہے۔
(الحکم جلد ۶ نمبر ۱۲)

ہفتہ مختتمہ ۳۰ مارچ ۱۹۰۲ء ۔ معراج میں جو آنحضرتؐ نے بنی اسرائیل کے انبیاء کو مختلف آسمانوں پر دیکھا ہے۔ جس کی تہ میں یہ حقیقت مضمر معلوم ہوتی ہے۔ کہ درحقیقت آنحضرتؐ نے بنی اسرائیل کے انبیاء کا سلسلہ زمانی طور پر بتایا ہے۔ سب سے اوپر حضرت ابراہیمؑ کو جو ابوالانبیاء تھے دکھایا گیا۔ دوسرے آسمان پر حضرت عیسےٰؑ کو۔ چونکہ حضرت عیسےٰؑ اور حضرت یحییٰؑ کا زمانہ مشترک تھا۔ اس لئے اُن ہر دو کو اکٹھا دکھایا گیا۔ اور چونکہ وہ آنحضرتؐ سے دوسرے درجہ پر تھے۔ اس لئے دوسرے آسمان پر انہیں دکھایا گیا۔ اور آدمؑ کو پہلے آسمان پر دکھایا گیا۔ کیونکہ آنحضرتؐ بھی آدم تھے۔ اس لئے آپؐ کو وہ پہلے آسمان پر دکھلائے گئے۔

اسوقت اللہ تعالےٰ نے مذہبی امور کو قصوں اور کتھاؤں کے رنگ میں نہیں رکھا ہے۔ بلکہ مذہب کو ایک سائنس (علم) بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ زمانہ کشف حقائق کا زمانہ ہے جس میں ہر ایک مذہبی بات کو عملی رنگ میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ اور میں صرف اسی لئے بھیجا گیا ہوں۔ کہ ہر اسلامی اعتقاد کو اور نیز قصص قرآنی کو عملی رنگ میں ظاہر کروں۔

یہ زمانہ جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے۔ کشف حقائق کا زمانہ ہے۔ اور اللہ تعالےٰ نے قرآن شریف کے جملہ حقائق اور معارف مجھ پر کھول دئے ہیں۔ میں نے جب ذوالقرنین کے قصہ کی حقیقت کی طرف توجہ کی۔ تو مجھ پر یہ کھولا گیا۔ کہ ذوالقرنین کے پیرایہ میں مسیح موعودؑ ہی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور اللہ تعالےٰ نے اس کا نام ذوالقرنین اس لئے رکھا ہے۔ کہ قرن صدی کو کہتے ہیں۔ اور چونکہ مسیح موعودؑ دو صدیوں کو پائے گا۔ اس لئے وہ ذوالقرنین کہلائے گا۔ میں نے تیرھویں اور چودھویں صدی ہر دو کو پایا ہے اسی طرح سے ہندوؤں اور عیسائیوں کی بھی دو صدیاں ہیں۔ اس لحاظ سے تو مسیح موعودؑ ذوالقرنین ہے۔ اور پھر اسی قصہ میں اللہ تعالےٰ نے بتلایا ہے۔ کہ ذوالقرنین نے تین قومیں

پائیں۔ اوّل وہ قوم جو غروبِ آفتاب کے پاس ہے۔ اور یہ کیچڑ میں ہے۔ جس سے مراد عیسائی ہیں جن کا آفتاب ڈوب گیا ہے۔ یعنی شریعت حقّہ اُن کے پاس نہیں رہی اور اُن کی روحانیت پر آفتاب غروب ہو چکا ہے۔ یعنی اُن کی روحانیت مر چکی ہے۔ اور اُن کے ایمان کی گرمی جاتی رہی ہے اور یہ ایک کیچڑ میں پھنسے ہوئے ہیں۔ دوسری قوم وہ ہے۔ جو آفتاب کے پاس ہے اور اُن پر جھلسنے والی دھوپ پڑ رہی ہے۔ یہ مسلمانوں کی موجودہ حالت ہے۔ آفتاب یعنی شریعت حقّہ اُن کے پاس موجود ہے۔ لیکن یہ لوگ اِس سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ کیونکہ فائدہ تو ہمیشہ عمدہ عمل کے ذریعہ سے حاصل کیا جاتا ہے۔ جیسے مثلاً روٹی پکانا۔ گو وہ آگ کے ذریعہ سے پکائی جاتی ہے۔ لیکن جب تک اِس کے مناسب حال انتظام اور تدبیر اختیار نہ کی جائے روٹی تیار نہیں ہو سکتی اِسی طرح پر شریعت حقہ سے کام لینا بھی اعلےٰ درجہ کی حکمت اور دانائی کو چاہتا ہے۔ پس مسلمانوں نے جن کے پاس باوجودیکہ آفتاب شریعت اور اُسکی روشنی موجود تھی اور ہے لیکن اِس سے کام نہیں لیا۔ اور اس کو مفید صورت میں استعمال نہیں کیا۔ اور خدا کے جلال و عظمت سے حصّہ نہ لیا۔ اور تیسری قوم وہ ہے۔ جس نے مسیح موعودؑ (ذوالقرنین) سے فریاد کی۔ کہ ہمیں یاجوج ماجوج کے فتنہ سے بچاؤ۔ یہ ہماری قوم ہے۔ جو مسیح موعودؑ کے پاس حاضر ہوئی اور اُس نے اُس سے اِستفادہ حاصل کرنا چاہا ہے غرض آج قصص قرآنی کے علمی نکات کے ظہور کا وقت ہے۔ اور ہمارا ایمان ہے کہ یہ قصّہ پہلے بھی کسی نہ کسی رنگ میں ہو گذرا ہے اور ساتھ ہی اس کے یہ بھی سچی بات ہے کہ اس قصّہ میں آئندہ واقعات کا بھی بطور پیشگوئی کے بیان تھا۔ جو اِس زمانہ میں پورا ہو گیا۔

ھوالذی ارسل رسولہٗ بالھدےٰ ودین الحق لیظھرہٗ علی الدین کلہٖ پر غور کرتے کرتے مجھ پر منکشف ہوا کہ اللہ تعالےٰ نے اس آیت میں دو لفظ ہدیٰ اور حق کے رکھے ہیں۔ ہدیٰ تو یہ ہے۔ کہ اندر روشنی پیدا کرے معمّا نہ رہے۔ یہ گویا اندرونی اصلاح کی طرف اشارہ ہے۔ جو مہدی کا کام ہے۔ اور حق کا لفظ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ خارجی طور پر باطل کو شکست دے۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا جاء الحق وذھق الباطل اور نیز خود اسی آیت میں بھی فرمایا ہے۔ لیظھرہٗ علی الدین کلہٖ یعنی اِس رسولؐ کی آمد کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ وہ حق کو غلبہ دیگا۔ یہ غلبہ تلوار اور تفنگ سے نہیں ہوگا۔ بلکہ وجوہ عقلیہ سے ہوگا یاد رکھو۔ کہ پاک صاف عقل کا خاصہ ہے۔ کہ وہ قصّوں پر اکتفا نہیں کرتی۔ بلکہ اسرار کو

کھینچ لاتی ہے۔ اسواسطے خدا تعالےٰ فرماتا ہے کہ جن کو حکمت دی گئی اُن کو خیر کثیر دی گئی۔

انہ اوی القریہ کے الہام کے متعلق فرمایا۔ کہ میں اسکے معنی یقیناً یہی سمجھتا ہوں۔ کہ وہ افراتفری اور قیامت خیز نظارہ جو طاعون کی وجہ سے پیدا ہو رہا ہے۔ اس سے اللہ تعالےٰ قادیان کو ضرور محفوظ رکھے گا۔ اگرچہ امر ممکن ہے کہ کوئی (وقوعہ) یہاں بھی ہو جائے۔ لیکن النادر کالمعدوم کے ضمن میں ہے تاہم اللہ تعالےٰ کے فضل اور وعدہ کے موافق یقین ہے۔ کہ ہمیں تشویش اور سخت اضطراب سے ضرور محفوظ رکھیگا (الحکم جلد ۶ نمبر ۱۲)

۵ اپریل ۱۹۰۲ء شام کے وقت چند احباب بیعت کے لئے جمع ہوئے۔ حضرت مسیح موعودؑ نے اُن کی بیعت لے کر بطاہر اُن کو خطاب کر کے کل جماعت کو ذیل کی ہدایت فرمائی۔ استغفار کرتے رہو اور موت کو ہر وقت یاد رکھو۔ موت سے بڑھکر اور کوئی چیز بیدار کرنے والی چیز نہیں ہے۔ جب انسان سچے دل سے خدا کی طرف رجوع کرتا ہے۔ تو اللہ تعالےٰ اُس پر اپنا فضل نازل کرتا ہے۔ جس وقت انسان اللہ تعالےٰ کے حضور سچے دل سے توبہ کرتا ہے۔ تو اللہ تعالےٰ اُس کے پہلے گناہ معاف فرما دیتا ہے۔ اور پھر اُسوقت سے بندے کا نیا حساب چلتا ہے۔ اگر ایک انسان کسی دوسرے انسان کا ذرہ سا بھی گناہ کرے۔ تو وہ شخص ساری عمر اس سے کینہ اور دشمنی رکھتا ہے۔ اور گو زبانی اُسے معاف کر دینے کا بھی اقرار کرے تاہم پھر بھی جب اُسے موقعہ ملتا ہے۔ تو وہ اپنے کینہ اور عداوت کا اظہار کر ہی دیتا ہے۔ لیکن اللہ تعالےٰ کمال رحیم و کریم ہے۔ کہ جب ایک بندہ سچے دل سے اُسکی طرف آتا ہے۔ تو وہ رجوع برحمت ہو کر اُسکے سارے گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے اور اُسپر اپنا فضل نازل فرماتا ہے۔ اور سابقہ گناہوں کی سزا سے درگذر کر دیتا ہے۔ اس لئے تم بھی اب یہاں سے ایسے ہو کر جاؤ۔ کہ تم وہ ہو جاؤ جو پہلے نہ تھے نماز کو سنوار کر پڑھو۔ جو اللہ تعالےٰ یہاں ہے۔ وہ وہاں بھی ہے۔ پس یہ نہ ہو کہ جب تک تم یہاں رہو۔ تمہارے دلوں میں رقت اور خدا کا خوف ہو۔ اور جونہی اپنے گھروں میں جاؤ۔ تو بے خوف و نڈر ہو جاؤ۔ نہیں بلکہ ہر وقت اور ہر لحظہ تمہیں خدا کا خوف رہنا چاہیئے۔ ہر ایک کام کرنے سے پہلے خوب سوچ لو۔ اور دیکھ لو۔ کہ اس سے اللہ تعالےٰ راضی ہوگا یا ناراض۔ نماز بڑی ضروری چیز ہے۔ اور مومن کا معراج ہے۔ اللہ تعالےٰ سے